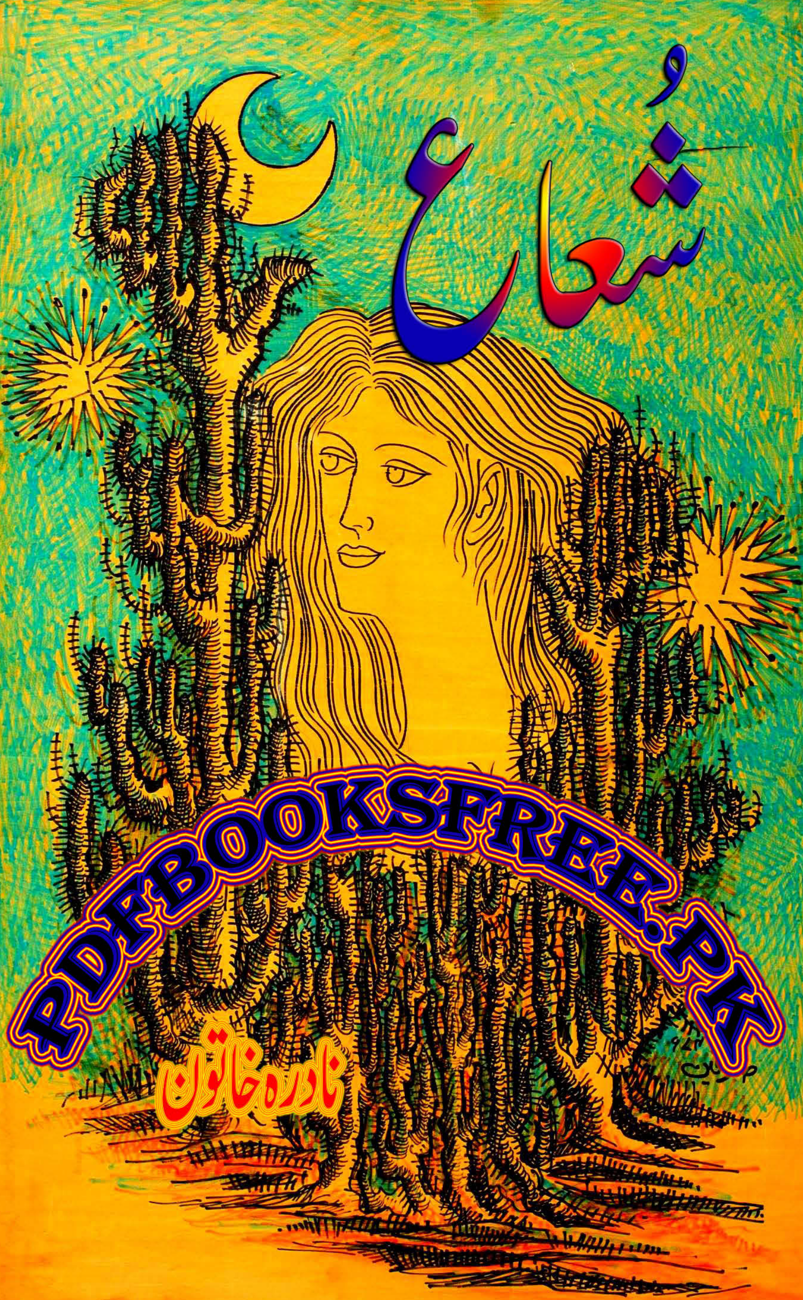
شعاع
PDFBOOKSFREE.PK
نادرہ خاتون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس چاند کا دُور نگر میں بسیرا رہنے لگا
پھر شام سے اپنے من میں اندھیرا رہنے لگا
اُجڑی ہوئی گلیاں چُپ چُپ پڑ ستانے لگے
دکھی جی کے بہلنے کے سارے بہانے ٹھکانے لگے
ہزاروں بھرا سہی خوب بسا سہی نیل گگن
اُسی چاند کی کھوج میں کھویا رہے بھٹکا ہوا من

ابنِ انشا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے اس گوشت کے لوتھڑے کا نام اس وقت شعاع رکھا جب اسے دنیا میں آئے چند ساعتیں ہی گزری تھیں شعاع کی والدہ غزالہ بیگم نے دوسری بچی کی پیدائش پر غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ننھی سی جان کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تو نعمان کا دل بہت دکھا بچی کے گلابی چہرے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور بولے

بیگم

غزالہ بیگم خاموش پڑی رہیں گویا کچھ سنا ہی نہ ہو۔

نعمان نے پھر کہا

بیگم سنو تو ــــــــــــــ

مگر بیگم صاحبہ نے توجہ ہی نہ دی' ذرا دیر رک کر نعمان نے پھر کہا۔

بیگم صاحبہ یہ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو قسمت بھی ساتھ ہی لاتی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ نے جواب دیا

لاتی ہوں گی مگر اس کے لیئے انہوں نے ہمارے ہی گھر کی راہ کیوں دیکھ لی ہے ایک لڑکی کافی نہ تھی جو یہ دوسری محترمہ بھی تشریف لے آئی ہیں۔

نعمان بولے۔

بیگم تم تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہو بے چاری شعاع سے۔ جیسے سارا قصور اسی کا ہے بس غصہ تھوک کر منہ اس طرف کر لو۔

نعمان نے محبت بھرے جذبات سے بچی کو گود میں اٹھا لیا جو سفید کپڑوں میں واقعی شعاع کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اسی وجہ سے گویا نعمان کی خوبصورت آنکھوں میں دھیمی دھیمی سی چاندنی ہلکورے لے رہی تھی۔ بے ساختہ بچی کی پیشانی چوم کر بولے

بس بیگم جانے دو غصہ ذرا.....

غزالہ بیگم نے رُخ پھیرا اور تنک کر بولیں۔

بس آپ کے پیارے ہی اللہ میاں خوش ہو کر آپ کو لڑکیوں سے نواز رہے ہیں۔

نعمان بولے

مگر بیگم اس میں غم کی تو کوئی بات نہیں ہے۔

ہے کیوں نہیں؟

غزالہ بیگم کہنے لگیں۔

غم کی بات تو ہے ہی کہ لڑکیاں پیدا ہوں۔ ان کو پالو پوسو۔ لکھاؤ پڑھاؤ۔ گھرداری سکھاؤ اور پھر ایک دن کسی معقول یا نا معقول کے حوالے کر دو۔

لوگ کہتے ہیں پڑھی لکھی ہو۔ حسن پری ہو۔ باورچن بھی اچھی ہو۔ ساس نندوں کی خدمت

بھی بجا لائے۔ شوہر کے دوستوں کے لیئے وقت بے وقت چائے اور روٹی بھی پکا سکے اور اگر ایک۔ خوبی بھی کم رہ جائے تو سارے وعدے بھلا کر ایک کورے کاغذ پر کسی بھی وقت تین طلاقیں لکھ کر ہاتھ میں تھما گھر سے نکال دو۔

نعمان کا دل دکھ سے بھر آیا غزالہ بیگم نے کتنی سچی اور کتنی کڑوی بات اتنی جلدی کہہ دی تھی بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نعمان نے بات پلٹ دی اور ہنس کر بولے

واللہ بیگم وعظ خوب کرتی ہو۔ اب کے ہسپتال سے نکلو تو میں کہتا ہوں اسکول کی نوکری چھوڑ کر وعظ ہی شروع کر دو اس میں پیار پیسے زیادہ ہی ملنے کی امید ہے اور بلا ملانی کا خطاب مفت میں لے گا۔

غزالہ بیگم نے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور ذرا مسکرا کر بولی

آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے کبھی سنجیدگی سے بات نہیں سنتے۔

نعمان نے کہا

مذاق والی بات تو تم خود کہہ رہی ہو۔ بس مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ تمہاری شکل وصورت دیکھ کر شادی کر لی اور شادی کے بعد تم سے یہ پوچھ لیا کہ بیوی! کھانا دانا پکانا آتا ہے یا ہوٹل سے لے آؤں۔

غزالہ بیگم کا یہ مقصد نہ تھا کہ میاں پرانی باتیں محسوس کرے اس لئے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولیں

آپ تو میری ہر بات کا مطلب الٹا ہی نکالتے ہیں میں نے یہ تو نہیں کہا تھا میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اب ماشاءاللہ لبنیٰ ہے اوپر سے اس شعاع کی بچی کو بھی یہی گھر نظر آیا۔

غزالہ بیگم نے یہ کہتے ہوئے بچی کی طرف بازو پھیلا دیئے۔ شعاع کو اس کی گود میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتے ہوئے نعمان کو ہنسی آ گئی۔ کھلکھلا کر بولے

تو تمہیں میرا رکھا ہوا نام پسند آ گیا

غزالہ بیگم مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔

نعمان نے غزالہ سے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اچھا خاصا دفتر جایا کرتا تھا کہ غزالہ سے مڈبھیڑ ہو گئی جو ایک سکول میں نئی نئی استانی بن کر آئی تھی۔ دونوں نے جلد ہی ایک دوسرے کو پسند کر لیا ——— اور آخر نعمان نے اپنی ماں سے اپنی پسند کا تذکرہ کر دیا۔ بے چاری ضعیف عورت تھی اور ایک بچی ——— مخالفت کیوں کرتی بھلا اس کی تو دلی خواہش تھی کہ گھر بس جائے۔ بڑے چاؤ سے بیٹے کا رشتہ لے کر گئی مگر غزالہ بیگم کی والدہ نے بالکل کٹاریوں لتاڑ دیا غریب عورت کے کہ وہ ہکا بکا واپس آ گئی نعمان کی بہن تو پہلے ہی خاموش طبیعت تھی اس سلوک سے غریب بجھ سی گئی۔ نعمان اور غزالہ کو صورت حال کا علم ہوا تو بڑے سٹ پٹائے۔ بچاری غزالہ بیگم نے سو سو جتن کئے تو ماں کا دل بھی پسیجا آخر اس شرط پر کہ نعمان علیحدہ گھر لے گا اور وہ بھی غزالہ کے نام سے۔ نعمان کی ماں نے یہ شرط بھی قبول کر لی اور اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔ مگر غزالہ کی والدہ میمونہ کا دل پھر بھی نعمان کے گھر والوں سے نہ ملا۔ گو مدتوں ملاقات نہ ہوئی مگر میمونہ کے دل کی کدورت نہ گئی کہ ان کی اکلوتی بچی پر جادو کر کے پھانس لیا ہے۔

نعمان ہفتے میں دو ایک چکر ماں کی طرف لگا آتا تھا بہن سے اُسے خاصا پیار تھا مگر وہ خود ہی بہت شرمیلی سی تھی نعمان ان کی ضروریات پوری کر دیتا ماں کی خواہش تو یہی تھی کہ ان کا بیٹا سدا خوش رہے سو وہ خوش تھا۔

غزالہ بیگم کے ہاں لبنیٰ پیدا ہوئی تو نعمان کی والدہ سلطانہ بیگم کو شام کے وقت اطلاع

ملی جب بچی دن بھر کی ہو گئی تھی۔ انہوں نے بہت خوشی منائی۔ غزالہ بیگم پر ماں کا بہت اثر تھا مگر ساس کی سہمی محبت بھی اثر کر ہی جاتی تھی۔ ان دنوں اس کا کافی آنا جانا رہا۔ ساس نند کے پاس مگر آہستہ آہستہ وہی پرانی روش پر لوٹ آئی کہ نعمان جاتا اور خیریت معلوم کر آتا۔ نعمان کو ترقی ملی تو اس نے ذاتی مکان غزالہ کے نام سے خرید ڈالا۔ اور جب ہی اسے دوسرے بچے کی توقع کی اطلاع ملی۔ سیدھی سادھی طبیعت کا تھا۔ لڑکے لڑکی میں خاص فرق نہ سمجھتا تھا۔ اسے لبنیٰ بہت پیاری تھی مگر شجاع نے پیدا ہوتے ہی اسے عجب طرح کا احساس دیا تھا۔ اس لئے نعمان کو بیوی کا رنج و غم بھایا نہ مگر ہنس ہنس کر بیوی کو مناتا رہا اسے بھی نعمان سے کم محبت نہ تھی۔ اس کی خوشی میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ نعمان کی بات پر خاموش ہو گئی تو نعمان نے اسے اور چھیڑا۔ بار بار ستایا۔ غزالہ بیگم نے زچ ہو کر شجاع کو نعمان کی گود میں دے دیا۔

نعمان نے کہا

خاموش کیوں ہو گئیں بیگم صاحبہ

بیگم مسکرا دیں

آپ تو واقعی بچے بن جاتے ہیں۔ میں بھلا کون ہوتی ہوں ناپسند کرنے والی۔

نعمان نے کہا

کیا مطلب ——— یعنی یہ تم نے کیا کہا کہ تم کون ہوتی ہو۔ بیگم! میں پوچھتا ہوں تم نے یہ جرأت کیسے کی۔

بیگم نے کہا

کیا میں نے کوئی بُری بات کہہ دی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے کہا

بُری اور بے حد بُری

بیگم نے پوچھا

یعنی ——— ؟

یعنی ——— یعنی تمہیں کوئی حق ہی نہیں

میرا مطلب تھا کہ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا حق ہے۔

تمہارا مطلب ہے کہ میں نہ ہوتا تو تمہیں حق ہوتا

آپ سے تو بات کرنا مشکل ہے آپ تو بال کی کھال کھینچنے بیٹھ جاتے ہیں

کون سے والے بال کی۔؟

میرے سر کے

کون سے والے ——— تمہارے سر میں تو ہزاروں بال ہیں میں پوچھتا ہوں کون سے والے بال کا تذکرہ ہے۔

اچھا بھئی میں ہاری اور آپ جیتے

میں کیوں جیتا

اس لئے کہ میں ہاری

تو میں پوچھتا ہوں کہ تم کیوں ہاریں

دیکھیے میں کہہ رہی ہوں کہ آپ مجھے زیادہ دق نہ کیجئے۔ مذاق بھی وقت وقت کا اچھا لگتا ہے آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھا رہتا ہے۔

یہ بات تو تمہیں شادی سے پہلے بھی پتہ تھی۔

مجھ سے شادی کر کے۔؟

جی نہیں آپ سے بات کر کے

کیا میں اتنا بُرا ہوں

نہیں آپ تو بہت اچھے ہیں

وہ تو ہم جانتے ہی تھے ورنہ تم ہم سے شادی کیوں کرتیں۔

آپ مجھے کسی طرح بخشیں گے بھی۔

کیوں نہیں

تو بخش دیجئے

ایک شرط پر

کیا ہے وہ شرط۔؟

ہماری بیٹا کو پیار کر لو

آپ جو ہیں پیار کرنے کو

اس کا مطلب کہ میں ابھی اور تنگ کروں

آپ کی مرضی ہے۔ آپ تنگ ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو کون منع کر سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہتھیار ڈال دیئے۔

غزالہ بیگم نے کہا

امی جان آنے والی ہیں۔ ان کو بتاؤں گی کہ آپ کے داد صاحب ———

نعمان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا

کہہ دینا ——— ضرور کہہ دینا۔ میں بھی اس تیز طرار بڑھیا سے کہہ دوں گا کہ لے جایئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی صاحبزادی ـــــ میں نہیں رکھ سکتا۔

ہاں ہاں لے جاؤں گی ـــــ ضرور لے جاؤں گی۔ میری تو ایک ہی بیٹی ہے کیا میں اس کو دو ڈھائی ٹائم کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتی غزالہ کی والدہ میمونہ بیگم نے یہ الفاظ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہے۔

نعمان جلدی سے بولا

لیکن خالہ! میں تو مذاق کر رہا تھا۔

میمونہ بیگم نے کہا

میں خوب سمجھتی ہوں ـــ تجھے بھی اور تیرے مذاق کو بھی۔ مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ دوسری لڑکی کی پیدائش کوئی نہ کوئی رنگ لا کر رہے گی۔

نعمان نے کہا

مگر خالہ! میں تو بے بی کی آمد پر خوش ہوں۔

میمونہ بیگم نے کہا

میں خوب جانتی ہوں تجھ کو بھی اور تیری خوشی کو بھی۔ کچوکے لگا لگا کر میری بیٹیا کو تو ہلکان ہی کر دیا ـــــ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی ہے اور مجھ کو تیز طرار بڑھیا کہتا ہے تیری اماں سے تو چھوٹی ہی ہوں۔

نعمان نے جلدی سے کہا

ہاں خالہ! میں تو خود اماں سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ خالہ آپ سے چھوٹی ہوں گی

کم از کم چھ سات دن

خالہ نے بات کاٹی

میں تجھ کو بھی جانتی ہوں اور تمہاری اماں کو بھی ـــــ خیر اپنی بیٹیا کی جان مجھے تجھ سے ہلکان نہیں کروانی۔ اب تو میں اسے گھر لے جا کر ہی رہوں گی اور اگر تو سو دفعہ ناک رگڑے گا تو بھی نہ بھیجوں گی۔

نعمان نے کہا

اور خالہ اگر ایک سو ایک دفعہ رگڑوں ـــــ پھر تو لا سکتا ہوں نا اپنی بیوی کو

میمونہ بیگم نے کہا

تجھے خالہ سے مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

نعمان نے کہا

خالہ کیوں نہیں آتی ـــــ بہت آتی ہے۔

میمونہ بیگم نے کہا

اور پھر بھی مذاق کرتا ہے۔

نعمان نے کہا

خالہ! مذاق تو آپ کر رہی ہیں کہ میری بیوی کو میری اجازت کے بغیر اپنے ہاں لے جا رہی ہیں۔

میمونہ بیگم نے کہا

تو گویا اب اپنی ہی بیٹی کو لے جانے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت بھی ہے۔

نعمان نے کہا

مگر خالہ! وہ آپ کی بیٹی بعد میں ہے اور میری بیوی پہلے ـــــ اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ بیگم نے بات کاٹی

اماں! آپ بھی کس کی باتوں میں آگئی ہیں۔ ان کی تو مذاق کی عادت ہے۔ میرا اتنا کہنا غضب ہو گیا کہ اللہ میاں نے لڑکیاں بھیجنے کے لئے ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے بس اس پر بحث میں اُلجھ گئے۔

——— اپنی بیٹی کی حمایت میں

میمونہ بیگم نے کہا

مگر تم نے پہلے کیوں نہ بتایا

غزالہ بیگم نے کہا

آپ نے اس کا موقع ہی نہ دیا

نعمان نے کہا

تو ہو گئی ماں بیٹی کی کانفرنس شروع

میمونہ بیگم نے کہا

چل ہٹ مسخرا۔ چل لا میری بیٹیا کو میرے پاس

یہ کہہ کر میمونہ بیگم نے شعاع کو اپنی گود میں لے لیا۔

ایک دن غزالہ بیگم نے نعمان سے کہا

آپ امی کو تنگ نہ کیا کریں

نعمان نے کہا

کیوں نہ کیا کروں، وہ میری بیوی کی ماں ہیں۔ میری ساس ہیں اور اب تو میں انہیں خالہ کہہ کر نہیں پکارا کروں گا۔ اے بیوی! کان کھول کر سن لو آئندہ سے ساس کہہ کر پکارا کروں گا انہیں۔

غزالہ بیگم نے کہا

میں ہاری اور آپ جیتے، آپ سے تو بات کرنا ہی دشوار ہے۔ میں تو صرف کہنا چاہتی تھی کہ پرسوں شعاع کی سالگرہ ہے اور سالگرہ پہ امی جان کو ———

نعمان نے بات کاٹ کر کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سمجھ گیا۔خوب سمجھ گیا۔بس پرسوں خالہ جان کو بہت عزت اور احترام سے پکاروں
گا۔یعنی اسے ساس، او ساس، او میری ساس، میری بیوی کی اماں، میری بیٹی کی نانی شماع
کی نانی جان۔

غزالہ بیگم نے کہا
جو مرضی میں آئے پکاریئے گا مگر سالگرہ کا انتظام کریجیئے گا۔
منظور ہے۔مگر ایک بات آج پوچھنے کو دل چاہ رہا ہے۔
تو پوچھ لیجئے۔
پھر سوچتا ہوں نہ پوچھوں۔
آپ تو خواہ مخواہ الجھا دیتے ہیں۔پتہ نہیں پریشان کر کے آپ کو کیا مزا آتا ہے۔اب
اگر کچھ پوچھنا ہی ہے تو پوچھ لیں۔
نعمان نے کہا
غزالہ اگر میں آج مر جاؤں، میرا ہارٹ فیل ہو جائے یا کسی بس یا ٹرک کے نیچے آ
جاؤں تو ——
غزالہ نے کہا
آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو۔
نعمان نے کہا
مگر بیگم! موت کا تو کوئی وقت مقرر نہیں۔
غزالہ بیگم نے کہا
مگر میں سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتی۔

نعمان نے کہا
کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟
یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔
نعمان نے کہا
ہاں —— کبھی کبھی میں دیکھتا ہوں کہ تم کھوسی جاتی ہو۔

اور ——
غزالہ بیگم نے بات کاٹی
آپ سے مجھے کتنی محبت ہے۔آپ کو میں کتنا چاہتی ہوں اس کا صرف ایک ہی جواب
ہے کہ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھے آپ کے سامنے اُٹھائے کیونکہ شوہر کی موت کے
بعد عورت کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔اور پھر آپ تو میرے شوہر ہی نہیں، میرے محبوب بھی
ہیں۔آپ کو نہیں معلوم میں آپ کو پا کر کس قدر خوش ہوں۔کس قدر مطمئن ہوں میں تو سوچ
بھی نہ سکتی تھی کہ آپ جیسا شریف، پیار کرنے والا اور خوددار شوہر مجھے مل سکتا ہے۔کیا
آپ سمجھتے ہیں میں اندھی ہوں، میں روز دیکھتی ہوں کہ آپ جوتا اٹھا کرے جاتے ہیں
اور کمرے کے باہر پہنتے ہیں۔ایسا کیوں ہے۔
نعمان نے ہنس کر کہا
وہ تو میں یونہی کرتا ہوں، میری عادت ہے۔
غزالہ بیگم نے کہا
عادت نہیں، میری امی کہتی ہیں کہ وہ تمہیں بے حد چاہتا ہے اور جوتا اس لئے باہر پہنتا
ہے کہ تمہاری آنکھ نہ کھل جائے۔اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ مہینوں بغیر ناشتے کے جاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے ہیں لیکن مجھے نہیں اٹھایا۔

نعمان نے کہا

وہ تو تمہاری طبیعت خراب تھی نا۔

غزالہ بیگم نے کہا

ہو گی، لیکن ایسی بھی خراب نہ تھی کہ آپ کے لئے ناشتہ بھی نہ بنا سکوں۔ آپ نے مجھے اُٹھایا ہی نہیں۔

اور وہ کہتی رہی۔

دراصل امی جان نے میری عادتیں خراب کر رکھی ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی کوئی کام نہیں کرنے دیا ——— میں ان کی اکلوتی اولاد تھی نا۔ وہ دفتر جانے سے پہلے ناشتہ تیار کرتیں اور دوپہر کا کھانا پکا کر رکھ جایا کرتیں۔ دفتر سے آتے ہی چائے بنتیں اور پھر سے کھانا پکانے میں لگ جاتیں۔ میں جب جوان ہوئی تو انہیں اس کی فکر ہوئی کہ مجھے چائے پکانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا اور آج کل کے شوہر ——— یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شوہر ملا تو آپ جیسا امی ہی کیا سارا خاندان کہتا ہے کہ داماد ملا ہے تو بس میمونہ بیگم کو اور ہاں امی جان بتا رہی تھیں کہ پچھلے سال میں بیمار ہوئی تو آپ چھت پر بیٹھے رو رہے تھے۔

نعمان نے ہنس کر کہا

تو کیا میں تمہاری وجہ سے رو رہا تھا۔

غزالہ نے کہا

نہیں تو اور کیا۔!

نعمان نے کہا

وہ میں اس لئے رو رہا تھا کہ اب تم مر جاؤ گی اور ظاہر ہے۔ مجھے تمہارے جنازہ اٹھاتے وقت رونا پڑے گا۔ ورنہ لوگ کیا کہیں گے نعمان میاں کو غزالہ بیگم سے محبت نہ تھی ——— بس یوں سمجھ لو کہ ریہرسل کر رہا تھا رونے کی۔ اور بیگم خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا۔ تو تم دیکھتیں کہ میں کس قدر سماں باندھ دیتا رونے کا کہ فلم والے بھی حیران رہ جاتے۔

غزالہ بیگم نے ہنس کر کہا

اور میں اکیلی چلی جاتی قبرستان

نعمان نے کہا

چلی جاتی سے کیا مراد ——— ہم خود چھوڑ آتے۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے داب آتے۔

غزالہ بیگم نے کہا

اور میں چپکے سے آپ کو کھینچ لیتی اور اپنے ساتھ سلا لیتی بھلا میں آپ کے بغیر اکیلی کیسے رہ سکتی تھی۔

نعمان نے کہا

سچ۔ بیگم ———؟

غزالہ نے کہا

ہاں سچ ——— بالکل سچ

نعمان نے کہا

یہ اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے بتا دیا۔

غزالہ نے پوچھا

تو آپ کیا کرتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے کہا

کرتا کیا ——— چالیس قدم دُور ہی غش کا بہانہ کر کے گر جاتا۔

غزالہ نے کہا

اور میں بھی ایک قدم آگے جانے سے انکار کر دیتی۔

نعمان نے کہا

غزالہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں پاگل ہیں۔اتنی محبت اور اتنی چاہت کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

غزالہ نے کہا

کیوں نہ مل سکے۔پتہ ہے پچھلے سال ہماری بلّی مر گئی تھی تو بلّے نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور آخر جان دے دی۔

نعمان نے غزالہ بیگم کی چوٹی کھینچ کر کہا

یہ تمہارا نعمان بھی جان دے دے گا چاہو تو آزما لینا۔

آج شعاع کی سالگرہ تھی۔

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں،لان میں میزوں کی قطاریں لگی تھیں۔سفید سفید کپڑے پہنے بیرے تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگے چلے جا رہے تھے۔

ادھر کمرے کے اندر نعمان شعاع کو تنگ کر رہا تھا۔

آج میری منی کی سالگرہ ہے۔

شعاع نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔خوبصورت زرق برق فراک،بالوں میں سُرخ ربن بندھا ہوا تھا۔

شعاع کو چھوڑ کر نعمان باہر آیا تو شعاع کے گرد بچوں نے گھیرا ڈال لیا۔ٹھُم ٹھُم چلتی ہوئی گڑیا رانی چلتے چلتے جب گر پڑتی تو بچے خوشی سے تالیاں پیٹنے لگتے۔

مہمانوں سے گھر بھر چلا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے پر کھڑے ہوئے نعمان صاحب اور غزالہ بیگم مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے
سالگرہ کا وقت شام کے پانچ بجے کا تھا۔ تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے لیکن نعمان کی آنکھیں
اب بھی باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

وہ منتظر تھا۔

وہ انتظار کر رہا تھا۔

اسے انتظار تھا۔

اپنی ماں کا، چھوٹی بہن کا

سوا پانچ بج گئے۔

نعمان کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے غزالہ بیگم سے کہا

خدا جانے امی اور سیما اب تک کیوں نہیں آئیں۔؟

غزالہ بیگم نے کہا

تو آپ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

نعمان نے کہا

ہاں

غزالہ بیگم نے کہا

وہ لوگ اس سالگرہ میں نہ آئیں گے

مگر کیوں ——؟ نعمان نے حیرت سے پوچھا

غزالہ بیگم نے کہا

اس لئے کہ نہ تو ان کو کارڈ بھیجا گیا ہے اور نہ ہی میں خود کہنے گئی۔

نعمان پہلے سے بھی حیران ہوا

بیگم! آخر بات کیا ہے۔؟

غزالہ بیگم نے کہا

بات تو کچھ بھی نہیں، بس میں نے مناسب نہ سمجھا

نعمان نے بگڑ کر کہا

مگر تم ہوتی کون ہو مناسب یا نامناسب سمجھنے والی۔؟

غزالہ بیگم نے کہا

آپ تو بعض اوقات پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ اب دیکھئے نا ایک تو ان کی عادت ہر بات
میں کیڑے نکالنے کی ہے دوسرے میری امی جان سے ان کی نہیں بنتی۔ میں نے سوچا کہ کہیں
خواہ مخواہ بات نہ بڑھ جائے۔

نعمان نے کہا

کیا تمہاری اماں کا آنا اس گھر میں ضروری تھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ جس گھر میں میری ماں
نہیں آ سکتی اس میں تمہاری ماں کو آنے کا کیا حق ہے۔

غزالہ بیگم نے کہا

سچی بات تو کڑوی ہوتی ہے مگر یہ گھر آپ کا تو نہیں ہے۔

نعمان نے کہا

یہ گھر میں نے اپنے خون اور پسینے کی کمائی سے خریدا ہے۔ اور تم کہہ رہی ہو کہ یہ میرا
گھر نہیں ہے۔

غزالہ بیگم نے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر اب تو اس کی مالک میں ہوں۔ اگر یہ میرا گھر نہیں تھا تو آپ نے اسے میرے نام سے خریدا ہی کیوں؟

کیا مجھے بیوقوف بنانا چاہتے تھے ——— یہ تو عجیب بات ہے کہ ہر وقت مجھے جتاتے رہتے ہیں کہ تمہارے لئے گھر خریدا ہے۔ تمہارے لئے گھر خریدا ہے! اور مالک میں نہیں ہوں۔

نعمان نے کہا

ہاں غزالہ تم ہی اس کی مالک ہو تمہارا ہی یہ گھر ہے۔ کاش! مجھے پہلے سے معلوم ہوتا۔ کاش! مجھے پتہ ہوتا کہ لوگ ذرا ذرا سی باتوں سے فائدہ اُٹھالیتے ہیں۔ خیر تم چاہو تو اس گھر کو

اور میں جا رہا ہوں۔

نعمان اور غزالہ بیگم میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ میمونہ بیگم آگئیں۔ اور کہا

کیا بات ہے غزالہ! یہ تم دونوں کی کیا آوازیں آ رہی تھیں با

غزالہ نے کہا

کچھ نہیں امی بس یونہی ذرا

میمونہ بیگم نے کہا

اے ہے۔ یونہی ذرا سے کیا مطلب۔ کچھ پتہ بھی تو چلے

غزالہ بیگم نے کہا

وہ میں نے نعمان صاحب کی امی جان کو سالگرہ میں نہیں بلایا تھا بس اس پر بگڑ گئے

میمونہ بیگم نے کہا

ہاں یہی تو پوچھتی ہوں کہ کیوں نہیں بلایا۔

غزالہ بیگم نے کہا

امی! دراصل ان کی آپ سے نہیں بنتی۔ میں نے سوچا اس خوشی کے موقع پر خواہ مخواہ بدمزگی نہ ہو جائے۔

میمونہ بیگم نے کہا

بات تو تمہاری صحیح ہے مگر مجھ نگوڑی کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے نہ بلاتے تو کون سا قہر آجاتا

پھر وہ نعمان سے مخاطب ہوئی

بیٹے! یہ تو بچی ہے۔ اس کی کسی بات کا خیال نہ کرنا۔ مجھے اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو میں نہ آتی۔ تم دل میلا نہ کرو اور چلو اندر مہمانوں سے ملو یہ تقریب ختم ہو جائے تو میں اس کی خبر لوں گی۔

نعمان کا دل تو نہ چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ نعمان نے بادل نخواستہ جا کر مہمانوں کی آؤ بھگت شروع کی۔ کیک کاٹا گیا۔ تالیاں پیٹی گئیں۔ مہمانوں کی مٹھائی، پھل فروٹ اور چائے سے خاطر مدارت کی گئی۔ تحفے تحائف بھی وصول کئے گئے مگر اس عرصے میں نعمان کا دل بجھا بجھا سا رہا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر غزالہ نے یہ حرکت کیوں کی ہے--؟

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مسز سلطے نے آ کر کہا

بھیا آداب

نعمان چونکا

اوہ آپ بھابی ——— آداب۔ کہئے اچھی تو ہیں اور بھائی صاحب نہیں آئے۔

مسز سلطے نے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے بھائی صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ کچھ دل کا عارضہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے سوچا انہیں آرام کرنے دوں۔

نعمان نے پوچھا

علاج کس ڈاکٹر کا ہے؟

مسز سلطے نے کہا

بھلا دل کے مرض کا بھی کوئی علاج ہوا ہے۔ میں نے سوچا کیوں خواہ مخواہ پیسہ ڈاکٹروں کو بھرا جائے کیوں نہ وہی پیسے ان کے بعد بچوں کے کام آئیں۔

بھابی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔؟

مسز سلطے نے کہا

بھیا! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں، دل کے مریض کا کیا بھروسہ اور پھر ان کو شراب کی لت بھی ہے۔ میری تو بھیا قسمت ہی پھوٹ گئی ان کے ساتھ شادی کر کے۔

نعمان نے کہا

مگر بھابی اب تو وہ آپ کی دنیا ہیں۔

مسز سلطے بولیں

ہوں گے بھیا! جس کی دنیا ہوں گے۔ ان کو اپنی ماں بہنوں سے فرصت ملے تو وہ تمہاری بھابی کی طرف بھی دیکھیں۔

نعمان نے کہا

مگر ان کی ماں اور بہنوں کا ان کے علاوہ اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔

مسز سلطے نے کہا

نہیں ہے کیا مطلب۔ بہنوں کی شادیاں کر کے گھر بھیج دے اور باقی رہی ماں تو ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ دو وقت کی روٹی ہی تو ہے اور پھر اس بڑھیا ذات کا کیا اعتبار ـــــ آج مری یا کل چل بسی۔

نعمان نے کہا

مگر بھابی لڑکیوں کو آنکھیں بند کر کے تو گھر سے نہیں نکالا جا سکتا۔

مسز سلطے نے کہا

کیوں نہیں نکالا جا سکتا۔ جس طرح ہمارے ماں باپ نے ہمیں چولہے میں جھونک دیا ہے اس طرح ان کے لئے بھی رشتوں کی کمی نہیں۔ اور پھر میں تو ان کے لئے رشتے بھی ڈھونڈ لائی تھی خود میرا ایک بھائی ہے۔ پہلی بیوی سے جھگڑا ہے۔ اور چار بچے ہیں۔ پرانے چوک میں کوٹوں کی دکان ہے امریکہ سے مال منگواتا ہے۔ مگر تمہارے بھائی صاحب کا تو دماغ ہی نہیں ملتا۔ کہنے لگے اس کباڑیے کا نام لیا تو زبان کاٹ لوں گا ـــــ اب بھیا تم ہی کہو کہ زبان وہ کاٹے اپنے ہوتوں سوتوں کی۔ میری زبان کیوں کاٹنے چلا۔

اور مسز سلطے کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔

بھیا! میں تو یہ پوچھنے آئی تھی کہ تمہاری امی نظر نہیں آ رہیں اور نہ ہی سیما دکھائی پڑی ہے

نعمان نے کہا

دراصل امی کی طبیعت خراب ہے

مسز سلطے نے کہا

اور سیما ـــــ؟

نعمان ایک لمحے کے لئے تو بوکھلایا پھر بولا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ امی جان کی دیکھ بھال کے لئے وہیں ہے۔

مسز سلطے نے کہا

مگر میں نے تو کچھ اور ہی سنا تھا۔

نعمان نے پوچھا

کیا سنا تھا آپ نے۔؟

مسز سلطے نے کہا

چھوڑو ان باتوں کو ــــــ خواہ مخواہ بات بڑھتی ہے۔

نعمان نے کہا

مگر بھابی بتایئے تو سہی کیا بات ہے؟

مسز سلطے نے کہا

وہ تمہاری ساس کچھ عورتوں سے کہہ رہی تھی کہ غزالہ نے نعمان کی ماں اور بہن کو اس نے نہیں بلایا کہ ان کی عادت بات بات میں نکتہ چینی کی ہے۔

نعمان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس وقت ایک ہنگامہ کھڑا کردے۔

وہ گھر جس میں خوشیوں کا راج تھا۔ وہ گھر جس میں قہقہے گونجتے تھے۔ وہ گھر جو خوشیوں کا گہوارہ تھا اس پر ایک خاموشی چھا چلی تھی۔ نعمان چپ چاپ رہتا تھا۔ کبھی کبھار ببلی اور شعاع سے بات کرلیتا یا ہلکے سے ان کے گال تھپک دیتا۔ ملازمہ کھانا لاکر سامنے رکھ دیتی تو کھا لیتا۔ بعض اوقات بھوکا ہی سو رہتا ــــــ لیکن غزالہ بیگم نے اب تک اس کا کوئی اثر نہ لیا

اور نہ اس نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ نعمان سے ان کے خاموش رہنے چپ چاپ دفتر چلے جانے کے بارے میں بات کرے۔ بلکہ ایک دن وہ معمول سے پہلے دفتر سے چلا آیا۔ دراصل اس دن اس کی طبیعت کچھ نڈھال سی تھی۔ وہ جب لان میں سے ہوتا ہوا برآمدے میں پہنچا تو کمرے کے اندر سے غزالہ اور میمونہ بیگم کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میمونہ بیگم کہہ رہی تھیں

بس تو اپنا یہ رویہ رکھ۔ بات نہیں کرنا تو تیری جوتی سے۔ کھانا نہیں کھاتا تو تیرا کیا جاتا ہے اور چپ چاپ رہتا ہے تو تمہاری بلا سے۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ مردوئے بس اسی قابل ہیں۔ جتنا سر پہ چڑھاؤ گی اتنا ہی چڑھتے جائیں گے۔ ذرا دبا کے رکھو گی تو تلوے تک چاٹنے کو تیار رہیں گے۔

غزالہ بیگم نے کہا

مگر امی بعض اوقات تو میں ان کو دیکھ کر پریشان ہوجاتی ہوں۔ ہر وقت شگفتہ رہنے والا آدمی، ہر وقت قہقہے لگانے والا شخص اگر یوں مرجھا کر رہ جائے تو کتنے دکھ کی بات ہے۔

میمونہ بیگم نے کہا

بس تیری یہی بات تجھے لے ڈوبے گی۔ تو نے اسے سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ اسی لئے وہ بار بار اپنی ماں اور بہن کو ساتھ رکھنے کے لئے کہتا ہے۔ اگر تو شروع سے اسے ٹھیک رکھتی تو کبھی ماں یا بہن کا نام نہ لیتا۔ اور تو دیکھنا کہ چند دنوں بعد خود ہی ٹھیک ہوجائے گا۔

غزالہ نے کہا

ماں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسے مجھ سے بے حد محبت ہے، بے حد پیار ہے وہ مجھے پاگلوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرح چاہتا ہے اور اگر آج میں اس سے کہہ دوں کہ مجھے طلاق چاہیئے تو وہ شاید آج ہی جان دے دے۔ اگر میں اسے چھوڑ دوں تو سڑکوں پر پاگلوں کی طرح غزالہ غزالہ پکارتا پھرے گا۔

میمونہ بیگم نے کہا

تو بس پھر کام بن گیا۔ آج وہ جب گھر آ جائے تو تم طلاق کی رٹ لگائے رکھنا۔

غزالہ بیگم نے کہا

میں آپ سے خود یہی کہنے والی تھی۔

نعمان کے تن بدن میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کہہ دیتا مکار عورتو! تم دونوں میرے سامنے بے نقاب ہو۔ مگر نعمان نے خود پر قابو رکھا اور جن قدموں اندر آیا تھا انہی قدموں واپس چلا گیا۔

کہنے کو تو وہ باہر آ گیا تھا مگر وہ کہاں جائے، کس کے سامنے دل کی کتاب کھول کر دکھ سنائے آج اس کے دل پر ایسی چوٹ پڑی تھی جس کا مداوا ممکن نہ تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ غزالہ جو اس قدر اس کی محبت کا دم بھرتی تھی، اس کے قدموں کو چھونا اپنی خوش نصیبی میں شمار کرتی تھی اس کے پیچھے کون سا جذبہ کار فرما تھا، مگر نعمان کے دل میں ایک خیال ستارے کی طرح بھی چمک اٹھا تھا کہ اس نے زیادہ دیر فریب نہیں کھایا۔ اگر غزالہ شجاع کی سالگرہ پر نعمان کی ماں اور سیما کو بلا لیتی، تو نعمان شاید ہمیشہ ہی اس کی محبت کے فریب میں مبتلا رہتا۔۔۔۔۔ نعمان ہاتھ ڈھیلے چھوڑے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے پریشان بال اور اڑی اڑی سی رنگت کوئی بھی دیکھ پاتا تو سمجھنا آسان تھا کہ دیوانے نے زبردست چوٹ کھائی ہے۔ مگر نعمان کے خالی خالی ذہن میں کسی کی کہی ہوئی بات گونج رہی تھی کہ

"عورت آگ بھی ہے اور پانی بھی۔۔۔۔۔ مکر و فریب کا دوسرا نام عورت ہے"

مگر نعمان کو کانوں سنی بات پر بھی سو فی صدی اعتبار نہ تھا، وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا:

"مگر غزالہ تو ایسی نہ تھی، غزالہ تو کبھی بھی ایسی نہ تھی"

نعمان کی عقل کام نہ کر رہی تھی کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا، اس کی ہنستی مسکراتی زندگی کو کس کی نظر لگ گئی۔ وہ غزالہ کو اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ وہ تو اپنی ہر خوشی کو غزالہ اور غزالہ کو ہی ہر خوشی تسلیم کرتا تھا۔ غزالہ تو اس کی اپنی بیوی تھی جسے اس نے محبوبہ کی طرح چاہا اور ایک لمحے کو بھی کبھی ذہنی طور پر بھی اس سے بے وفائی نہ کی تھی۔ غزالہ تو زندگی کا دوسرا نام تھا، لیکن

کیا زندگی بھی فریب دیتی ہے؟

یا آدمی خود سے بھی فریب کھاتا ہے۔

لیکن وہ کیا کرے؟

کہاں جائے؟

اس کی زندگی کا سکون اجڑ گیا تھا

اس کا کوئی بھی اپنا نہ تھا۔

اگر وہ اس وقت اپنی ماں کے پاس جاتا اور اس کی محبت بھری گود میں منہ چھپا کر رو لیتا، تو شاید اس کا جلتا ہوا دماغ چند لمحوں کا سکون حاصل کر لیتا، مگر وہ اپنے دکھ بوڑھی اور کمزور ماں کے دامن میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔

پھر وہ کہاں جائے؟ نعمان ڈھیلے قدموں سے چل پڑا۔ ایک دم اس کے سامنے کئی چہرے ابھرے

ناصر۔

اس کا دوست۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا ہمدم، اس کا ساتھی۔

مگر

ناصر کو شراب پینے کی لت تھی، وہ مصور تھا، مانا ہوا مصور، اسے مصور بنانے والی اسے شہرت کی منزل پر پہنچانے والی بھی ایک لڑکی تھی اور اسے شراب کی بد عادات ڈالنے والی بھی لڑکی ہی تھی۔ اس لئے اُس کا اعتبار دنیا کی کسی لڑکی کسی محبت بھرے بول پر نہ رہا تھا۔ اسے اعتبار تھا صرف اپنے فن پر اور اپنی بے خودی اور شراب پر۔

نعمان اس کا دوست تھا، ہم راز بھی۔ جب نعمان نے غزالہ سے محبت کی، ناصر نے اس کا مذاق اڑایا، اسے ان راہوں پر قدم رکھنے سے بھی منع کیا، مگر دیوانہ فرزانے کو بھی دیوانہ سمجھا اور ہنس کر ٹال گیا۔ اس نے نعمان کو غزالہ سے شادی کرنے سے منع کیا، مگر نعمان نہ مانا اس کی تو ہر آرزو کا ما حاصل غزالہ تھی۔ شادی کے بعد نعمان اور ناصر کی ملاقات اکثر ہو جایا کرتی تھی۔

ناصر کہا کرتا تھا:

"نعمان تم تو مولوی ہو، نرے مولوی، تم نہیں جانتے اس لال پری کے دو گھونٹ جب حلق سے نیچے اُترتے ہیں تو آدمی اپنے سارے غم بھول جاتا ہے، میری جان کبھی چکھ کر تو دیکھو۔"

اس پر نعمان جواب دیتا:

"ناصر میاں، تم مجھے مولوی کہو یا کچھ اور۔۔۔۔۔ میں جس چیز کو حرام کہتا ہوں اسے ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"

ناصر کہتا:

"ٹھیک ہے میاں، تم مولوی بنے رہو اور سینے میں غم لئے پھرتے رہو۔"

نعمان ہنس دیتا، ناصر کی خام خیالی پر۔ وہ ناصر کے کندھے پر زور سے ہاتھ جماتا اور کہتا:

"مجھے کوئی غم نہیں ہے۔"

ناصر اس بات پر ایک گہری نظر اس پر ڈال کر کہتا:

"غزالہ بھابی نے ایسا جادو کیا ہے میرے اچھے خاصے یار کو پنجرے میں بند کر کے رکھ لیا ہے، ارے بھائی یہ عورت بڑی عجیب چیز ہے، بسا اوقات مرد کو مکھی بنا کر رکھتی ہے اور کبھی مکھی کی طرح نکال باہر کرتی ہے۔"

نعمان جواب دیتا:

"رکھتی ہوں گی، مگر یار میرے، نعمان ان لوگوں میں سے نہیں ہے اور پھر ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ اس سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہ ہوگا جسے غزالہ جیسی بیوی ملے۔"

ناصر کہتا:

"ہاں ــــــ لیکن سبھی تمہاری طرح خوش نصیب تھوڑی ہوتے ہیں اور کون جانے خوش نصیبی کتنی مدت کی ہوتی ہے؟" اس کے بعد ناصر شراب کے جام پر جام چڑھاتا رہتا اور نعمان اس کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھسک آتا۔

مگر

آج نعمان کو ناصر کا خیال آرہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ناصر کے پاس جائے اور کہے۔

لاؤ ناصر ــــــ لاؤ مجھے بھی شراب پلاؤ، میری خوش نصیبی کی مدت ختم ہو گئی، میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں، میں خود کو۔

دنیا کو

میں آج سارے زمانے کو بھول جانا چاہتا ہوں، آج میں غزالہ کو بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا اسے بھی اور اس کی یاد کو بھی آج اپنے غم شراب میں ڈبو دینا چاہتا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ خیال آتے ہی وہ ناصر کے ہاں جانے کو پلٹا۔

اتنے میں کسی نے بہت میٹھی اور نرم آواز میں پکارا۔

"نعمان"

نعمان کو یہ آواز کچھ شناسا سی معلوم ہوئی، مگر آج وہ کوئی آواز نہیں سننا چاہتا تھا

آج وہ کسی نرم میٹھی آواز کو قریب نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

آج وہ تمام آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔

کیونکہ

آج اس کی منزل ناصر کا مے خانہ تھی۔

اتنے میں کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دوبارہ پکارا۔

"نعمان"

نعمان نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ حنا تھی۔

حنا کا باپ نعمان کا باس تھا۔ وہ شروع سے ہی نعمان کو بہت پسند کرتا تھا۔ اور حنا تو جب بھی اپنے باپ سے ملنے آتی، تو گھنٹوں نعمان کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ کوئی بُری لڑکی نہ تھی صرف فیشن ایبل اور بے باک، ورنہ اس میں کوئی اخلاقی کمزوری نہ تھی، وہ دفتر میں آتی، نعمان کے پاس بیٹھتی، اور تو اور وہ کھلے لفظوں میں نعمان سے محبت کا اظہار کر چکی تھی۔

مگر نعمان نے جو اسے بُری لڑکی سمجھتا تھا اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ شادی شدہ ہے بلکہ اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا ہے۔

حنا یہ بات سن کر کہتی:

"میں کب کہتی ہوں کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو یا اپنی محبت کا رخ میری طرف موڑ دو، میں تو صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو، بے حد اچھے لگتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ کبھی کبھی تمہارے ساتھ لنچ لے لوں یا کبھی تمہارے ساتھ پکچر دیکھ لوں یا تم سے باتیں کر لیا کروں"

نعمان رکھائی سے کہتا:

"سوری مس حنا سوری، چائے میں آپ کو یہیں پلوا سکتا ہوں، لنچ کے لئے یہ سینڈوچ پیش کر سکتا ہوں۔ غزالہ کے ہاتھوں کے ...... آپ کھائیں گی تو خوش ہو جائیں گی کیونکہ ان میں غزالہ کی خوشبو آتی ہے"

حنا کہتی:

"اور پکچر؟"

نعمان کہتا:

"میں پکچر نہیں دیکھتا"

حنا نے کہا:

"جھوٹ ..... ایک بار میں نے آپ کو پکچر ہاؤس میں دیکھا تھا"

نعمان نے کہا:

"مس حنا آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ میرے ساتھ غزالہ بھی ہو گی، میں پکچر صرف غزالہ کے ساتھ دیکھتا ہوں"

بے چاری حنا نعمان کی ان باتوں سے دل برداشتہ تو ہو جاتی، مگر اس نے اپنے خیالوں کا مرکز نہ بدلا ـــ وہ جب بھی نعمان سے ملتی اتنے ہی تپاک سے ملتی اور اس کے باپ نے بھی کبھی اس بات کا بُرا نہ مانا تھا کہ حنا اس کے شادی شدہ ملازم سے بے تکلف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوکر ملتی ہے۔نواب ارشاد نے حنا کو ایسی تربیت دی تھی کہ بے باکی اور آزادی کے باوجود اس کے قدم کہیں نہیں لڑکھڑائے تھے۔اس نے نعمان سے بھی کبھی ضرورت سے زیادہ بے تکلفی سے بات نہ کی تھی اور نعمان نے اسے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔

مگر آج

آج اسے سرِراہ حنا ملی تو نعمان کا دل چاہا وہ کہے، نعمان چلو ——— آج میرے ساتھ پکچر دیکھنے چلو، کہیں باغ میں چلو یا کسی ہوٹل میں چلو۔

مگر حنا نے نعمان کو جس حلیے میں وحشت زدہ دیکھا تو گھبرا گئی۔ اور کچھ نہیں بس اتنا پوچھا:

"نعمان، کہاں جا رہے ہو؟"

نعمان پھٹی پھٹی آنکھوں سے حنا کو دیکھ رہا تھا۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چلا چلا کر کہے کہ آج نعمان کہیں نہیں جا رہا، آج نعمان کا کوئی پروگرام نہیں، آج تم نعمان کو کہیں بھی لے چلو،

مگر حنا نے پھر پوچھا۔

"نعمان جواب دو نا، کہاں جا رہے ہو؟"

نہیں کیا ہوا نعمان؟ غزالہ کیسی ہے؟

کچھ تو بولو۔

نعمان کا دل چاہا کہ حنا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ کسی غزالہ کو نہیں جانتا

کسی بھی غزالہ کو نہیں جاننا چاہتا۔

یہ تم کس غزالہ کا نام لے رہی ہو، اسے کسی غزالہ سے پیار نہیں ہے۔

ہاں

اسے جس غزالہ سے پیار تھا، جسے وہ زندگی سمجھے ہوئے تھے جو اس کی شریکِ زندگی تھی اور جسے اس نے شریکِ غم بھی سمجھا تھا جس کے بغیر اس کا وجود نامکمل رہتا تھا، وہ غزالہ جو اس کی بچیوں کی ماں تھی، نعمان کی محبت اور عزت تھی، جو اس کے گھر کی زینت تھی۔

وہ غزالہ مر چکی ہے۔

اور

وہ آج خود اپنے ہاتھوں اس کا جنازہ نکال کر آیا ہے۔

اس کے لاشے کو زمین میں دفن کر آیا ہے۔

ہاں البتہ

اس وفا شعار غزالہ کے بدن سے ایک اور غزالہ بنی ہے جو مکر و فریب کی پتلی ہے۔

جس نے شوہر کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

جو وقت آنے پر نہ شوہر کی بیوی رہی۔

اور

نہ ہی بچوں کی ماں۔

وہ تو بیوپاری بن چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے مہر و محبت کی بارش کی بجائے خودغرضی کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

اور

زبان سے کانٹوں بھرے الفاظ برس رہے تھے اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ سارے کے سارے کانٹے نعمان کے دل میں چبھ گئے تھے اور ان کے زہر سے نعمان کی جان پر آ بنی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور

غزالہ کے چہرے سے نقاب بھی اتر چکی تھی۔

نعمان کو اس طرح چپ سادھے دیکھ کر حنا گھبرا سی گئی تھی جانے کا بہانہ بنانے کے لئے

"معاف کیجئے گا نعمان صاحب میرا دل تو چاہتا تھا کہ آپ سے فلم کے لئے کہوں مگر آپ
جواب مجھے معلوم ہے اور۔۔۔۔۔ یوں بھی آپ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں، اچھا خدا حافظ پھر
ہو گی۔"

حنا چلی گئی حالانکہ نعمان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زور سے پکارے کہ حنا مت جاؤ
مت جاؤ حنا۔۔۔۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔

اور جانا ہی ہے تو مجھے بھی ساتھ ہی لے جاؤ۔

لیکن الفاظ نعمان کے ہونٹوں تک بھی نہ آسکے، بس اس کا دل ہی تڑپتا رہ گیا وہ کچھ
نہ کہہ سکا۔

اور

حنا چلی گئی۔

حنا کے جانے کے بعد نعمان یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ناصر کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کا
فیصلہ کیا تھا بس وہ چلتا رہا۔

بھوکا پیاسا۔

دکھ بھرا دل لئے

اسے نہ بھوک کا احساس تھا نہ تھکن کا، وہ پاگلوں کی سی حالت میں چلتا رہا شام
سائے لمبے ہو گئے تو وہ ایک پبلک گارڈن میں جا کر بیٹھ گیا۔ رات کا گہرا اندھیرا اور سڑک کے

لگے ہوئے کھمبوں کے بلب۔

نعمان بس بے مقصد ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر وہ ہری ہری گھاس پر لیٹ گیا۔ آنکھوں پر کہنی
رکھ لی تو چاروں طرف کا اندھیرا اور بھی گہرا ہو کر اس کے دماغ میں اُتر آیا۔

قریب سے کوئی آیا گزری جس سے بچی ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہی تھی۔

"آیا، ممی ڈیڈی کب آئیں گے؟"

اور آیا جھلائی ہوئی آواز میں لہجہ نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آئیں گا بے بی، ممی بھی آئیں گا اور ڈیڈی بھی۔ بس تھوڑا سا دیر اور ویٹ کریں گا اچھا بے بی،
گڈ بے بی"

مگر بچی ٹھنکے جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد نعمان کے ذہن میں شعاع اور لبنیٰ کی یاد ابھری شعاع
بھی تو اسے بہت چاہتی تھی، چینی کی گلابی سی گڑیا۔ ابو ابو کرتی رہتی تھی، ذرا دفتر سے دیر ہو جاتی تو
ماں کا آنچل پکڑے سوال کرتی۔

"اماں ـــــ ابو ـــــ ابو!"

اور ماں کہتی

آ جائیں گے تمہیں بہت محبت ہے ابو سے، لبنیٰ کو تو دیکھو کتنی سیدھی ہے اور مجھے کس قدر
چاہتی ہے۔

نعمان کو یہ خیال آیا تو ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں، وہ کہنی کے نیچے آنکھیں چھپائے
بہت دیر تک روتا رہا۔

رونے کی وجہ سے اس کا دل ذرا ہلکا ہوا، تو اسے غزالہ کی زیادتی شدت سے محسوس ہوئی۔

وہ بہت دیر تک پرانی باتیں یاد کرتا رہا، اسے غزالہ کی نوازشیں اور غزالہ کی ماں کی زیادتیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یاد آتی رہیں مگر اب غزالہ وہ غزالہ نہ رہی تھی۔

وہ کتنا بدل گئی تھی، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھانے والی غزالہ اس کے معاملے میں کتنی سنگدلی سے سوچ رہی تھی۔

وہ بہت دیر تک باغ میں بیٹھا رہا۔ رات بہت کافی ہو چکی تھی جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے جب نعمان گھر میں داخل ہوا۔ تمام کمروں کی روشنی گل تھی صرف ڈرائنگ روم میں روشنی تھی، نعمان نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو اسے کھلا پایا۔ اپنے دھیان میں گم وہ کمرے میں داخل ہوا تو غزالہ بھوکی شیرنی کی طرح کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

نعمان کو دیکھ کر چنگھاڑی

"کہاں سے آئے ہیں نواب صاحب"

نعمان نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، محبت کا ایک سایہ بھی اس کے چہرے پر نظر آتا تو نعمان کا دل مطمئن ہو جاتا، مگر وہاں تو وہ قہر و غضب کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ نعمان کو خاموش دیکھ کر چلائی۔

"میں پوچھتی ہوں کہاں سے آئے ہیں"

نعمان نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

غزالہ بولی۔

"اور کیا آپ کے فرشتوں سے کہہ رہی ہوں؟"

نعمان نے کہا۔

"فرمایئے۔"

غزالہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، آج تو اسے فیصلہ کرنا تھا اور نعمان الٹے جواب دے رہا تھا، کہنے لگی۔

"میں پوچھتی ہوں، کیا گھر آنے کا یہ وقت ہے؟"

نعمان نے افسردہ نظروں سے بیوی کو دیکھا اور کہا۔

"دراصل دوستوں میں بیٹھ گیا تھا، کچھ دیر ہو گئی۔"

غزالہ بولی۔

"یہ کچھ دیر ہو گئی ہے، اور سن لو اب چاہے تم دوستوں میں رہو یا دشمنوں میں میرا اور آپ کا نباہ ممکن نہیں ہے۔"

نعمان نے کہا

"اطلاع کا شکریہ۔"

غزالہ بولی

"کیا مطلب؟"

نعمان نے کہا۔

"مطلب یہ کہ اب میرا اور آپ کا نباہ ممکن نہیں ہے، آپ نے یہی فرمایا ہے نا؟"

غزالہ نے کہا۔

"پھر کیا سوچا آپ نے۔"

نعمان نے کہا۔

"مجھے بھلا کیا سوچنا ہے، سوچنا اور فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے۔ اور فیصلے کے بعد مجھے اطلاع دے دینا آپ کافی سمجھتی ہیں۔ اتنی بات کہہ کر نعمان اپنے کمرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف بڑھا۔ غزالہ والے پلنگ پر لبنیٰ سو رہی تھی۔ نعمان نے کپڑے بدلے اور اپنے بستر پر جا لیٹا۔ اس رات غزالہ اس کمرے میں نہ سوئی۔ اور نہ ہی شعاع کو اس کے پاس بھیجا۔ نعمان کی ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ گزرے ہوئے دن کی کشیدگی پوری طرح موجود تھی۔ صبح ہوتے ہی غزالہ کی والدہ آگئیں اور جو کمرے میں نواسیوں کو سنبھال کر بیٹھی ہیں تو باہر نکلنے ہی نہ دیا۔ نعمان صبح سے کمرے میں تھا۔ نوکر اسے چائے دے گیا تھا جسے اس نے ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ اسے کبھی کبھی شعاع اور لبنیٰ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اپنی بچیوں کی صورت بھی صبح سے نہ دیکھی تھی۔

یک بارگی

شعاع زور سے چلائی، پھر چانٹے کی آواز آئی۔

غزالہ معصوم بچی کو مار رہی تھی، وہ ہر طرح سے نعمان کو اذیت دے رہی تھی۔ نعمان نے تکیے میں منہ چھپا لیا مگر شعاع تڑپ رہی تھی۔

اس کی

ابو ــــــ ابو

کی صدائیں نعمان سے برداشت نہ ہو سکیں تو وہ کمرے میں سے نکل آیا۔

غزالہ شعاع کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ نعمان کو دیکھ کر بھی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے شعاع کو زور سے دھکا دیا اور بولی۔

"سب مل کر میری جان جلا رہے ہیں، مرتی نہیں کم بخت کہ میری جان چھوٹے۔"

نعمان نے شعاع کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ غزالہ نے جھپٹ کر بچی کا ہاتھ چھڑایا اور بولی۔

"کون ہوتے ہیں آپ اسے لے جانے والے۔"

نعمان نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو بولی۔

"گھور کیا رہے ہیں، میں کیا آپ کی باندی ہوں جو مجھ پر یوں آنکھیں نکالتے ہیں۔"

آواز سن کر غزالہ کی ماں کمرے سے نکلی اور بولی۔

"میاں میں نے تم سے بیٹی اس لئے نہ بیاہی تھی کہ تم اس پر یوں ظلم کرو۔ نامیاں میری نازوں پلی بچی کا تم نے تو خون ہی سکھا دیا ہے۔"

نعمان نے ساس کی طرف دیکھا اور بولا

"تو آپ اپنی نازوں کی پالی بیٹی کو ساتھ لے جایئے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

غزالہ بولی۔

"میں کیوں جاؤں گی، یہ تو میرا اپنا گھر ہے، میری ذاتی ملکیت ہے، میں تو دشمنوں کو نکال باہر کر دوں گی۔"

غزالہ کی ماں بولی۔

"ارے سیدھی سیدھی بات کیوں نہیں کرتی ہو، میں خوب جانتی ہوں اس کے غصے کو، تمہیں گھور کر دیکھے آنکھیں نکال دوں گی اس کی۔"

نعمان سے اب برداشت نہ ہو سکا، غصے میں دانت پیس کر بولا۔

"تم بس کی بڑھیا، تمہیں کس نے اجازت دی یہاں آنے کی، نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

غزالہ لپک کر ماں کے پاس آ کر بولی۔

"تم کون ہوتے ہو میری ماں کو میرے گھر سے نکالنے والے۔"

نعمان نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بولا۔

"کیا چاہتی ہو تم دونوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ بولی۔

"بس میرا آپ کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ . ں مجھے آپ —— آپ —— طلاق دے دیں"

نعمان نے کہا۔

"میری طرف سے تم آزاد ہو، بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کے کپڑے تیار کر دو۔ میں فوراً یہاں سے جانا چاہتا ہوں، باقی کارروائی جلد ہی پوری ہو جائے گی"

غزالہ کی ماں نے کہا

"اور یہ لڑکیاں"

نعمان نے کہا۔

"میں غزالہ سے بات کر رہا ہوں، آپ سے نہیں۔

غزالہ کی ماں نے کہا۔

"لو بیٹی، یہ بے عزتی بھی قسمت میں لکھی تھی"

غزالہ نے تنک کر کہا

"میری ماں کی باتیں غور سے سنو اور میں وہی کروں گی، میرے وہی فیصلے ہوں گے جو میری ماں کے فیصلے ہیں۔ شادی کرنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اب میں اپنی ماں کا کہا بھی نہ مانوں"

غزالہ کی ماں کے چہرے پر فتح مندی کے آثار تھے۔

"اے لڑکے، کان کھول کر سن لو، جو میں کہوں گی، جو میں چاہوں گی وہی ہوگا"

نعمان کے لہجے میں طنز تھا۔

"اور میں بھی وہی کروں گا جو آپ چاہیں گی —— طلاق، صلح، بچیاں ساتھ لے جانا، بچیاں چھوڑ جانا"

"اسے تو لے جا، بچیوں کو ہم ان سا... اولاد کو رکھ کر کیا پالیں گے جیسا باپ ویسی بیٹیاں"

اب تو نعمان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔

"خبردار اگر میری بیٹیوں کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا، تیار کر دو بچیوں کو، میں تم جیسی کٹنی بڑھیا کے پاس چھوڑ بھی نہیں سکتا"

"میں کٹنی ہوں"

"اور نہیں تو کیا بُرا حاجن ہو"

اور

غزالہ کی والدہ نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر نعمان کے آگے کر دیئے"

"جاؤ لے جاؤ"

نعمان دونوں بچیوں کے ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا تو جہاں غزالہ کے اس غیر متوقع حادثے نے ہوش اُڑا دیئے، وہاں میمونہ بیگم کو بھی حیران کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ نعمان کا دل اس حد تک ٹوٹ گیا ہے کہ اس پر مزید چوٹ کرنا بے فائدہ تھا۔ میمونہ بیگم منہ کھولے داماد کو دیکھ رہی تھی اور غزالہ . . . .

غزالہ ایک دم بیٹھ گئی، اس کے تو گویا دیکھنے بولنے کی حس بھی ختم ہو گئی تھی، ہاتھ پاؤں کی جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں کی تو یہ کیفیت تھی مگر نعمان نے غزالہ اور میمونہ بیگم کی اس حالت کا کوئی اثر نہ لیا۔ اور خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا دماغ و دل سلگ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر ایک منٹ بھی اس زہریلی فضا میں رہا تو زندہ نہ رہ سکے گا۔

کاش غزالہ نے پاؤں پر گر کر نہ سہی محبت سے ہاتھ پکڑ کر ہی معافی مانگ لی ہوتی، مگر غزالہ بیگم کی انا کو ٹھیس لگی تھی، وہ اس وقت اپنے حواسوں میں کہاں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے کمرے میں جا کر اپنے کپڑے الٹے سیدھے سوٹ کیس میں ٹھونسے، کُرتا پاجامہ پہنا اور سوٹ کیس اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ غزالہ اور میمونہ بیگم غالباً بچوں سمیت کمرے میں جا گھسی تھیں۔ نعمان چند لمحے کمرے میں رُکا۔ اس نے دیکھا لبنیٰ دروازے کے پاس آ کر اسے معصوم نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ نعمان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے سوٹ کیس زمین پر رکھ کر اشارے سے لبنیٰ کو بلایا، وہ فوراً بھاگتی ہوئی آ کر گود میں لد گئی۔ نعمان نے اس کا ننھا سا ہاتھ چوما تو وہ گلے سے لپٹ گئی، اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"لبنیٰ بیٹی شجاع کہاں ہے؟"

لبنیٰ کی نظریں ماں کے کمرے کی طرف اُٹھیں، نعمان نے پھر پوچھا۔

"بیٹی ہمارے ساتھ چلو گی؟"

لبنیٰ نے معصومیت سے سر ہاں میں ہلا دیا۔ نعمان چند لمحے اس کا سر سہلاتا رہا، پھر بولا۔

"جاؤ ذرا بہن کو بلا لاؤ، جاؤ شاباش۔"

لبنیٰ دوڑتی ہوئی غزالہ کے کمرے میں گئی اور جلد ہی واپس آ گئی، مگر اکیلی۔

نعمان کی آنکھوں کا نور

شجاع

اس کے ساتھ نہ تھی۔

لبنیٰ کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا، نعمان نے کھول کر دیکھا، اس میں لبنیٰ کی دو تین استری شدہ فراکیں تھیں ـــــ یعنی لبنیٰ باپ کے ساتھ جا سکتی تھی، مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر شجاع

اس کی لاڈلی بیٹی۔

غزالہ اس سے محبتوں اور وفاداریوں کا انتقام لے رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ

نعمان شجاع کی صورت کا دیوانہ ہے۔

وہ اس کی ننھی منی حرکتوں پر فدا ہے۔

اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں پر جان دیتا ہے۔

کیا خوب ڈھنگ تھا نعمان کو تڑپانے کا

غزالہ صرف

باپ سے بیٹی کو ہی نہیں دُور کر رہی تھی۔

وہ

بدن سے رُوح جدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

نعمان نے لپک کر لبنیٰ کو گود میں اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ اس نے عام لوگوں کی طرح کوئی حسرت بھری نظر بھی پیچھے نہ چھوڑی۔ جانے کا یہ انداز دروازے کی اوٹ سے میمونہ بیگم نے دیکھا۔ مگر۔

جو سینے کی دیوار کے اندر ہل چل مچی تھی۔

وہ نہ دیکھ سکی۔

اس لئے نعمان کے جانے کے بعد پلنگ پر اوندھی لیٹی غزالہ سے جو شجاع کو سینے سے لگائے ہوئے تھی، مخاطب ہوئی۔

"لو جی، لبنیٰ سے تو ہاتھ دھو لو، اسی لئے میں منع کر رہی تھی۔ وہ تو بچی کے کپڑے بھی یہیں چھوڑ گیا۔"

غزالہ نے بمشکل خود پر قابو پایا اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں امی ـــــ وہ ایسے نہیں ہیں، انہیں سدا میرا خیال رہتا ہے، شام تک نہیں تو کل تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ واپس آجائیں گے۔عورتوں سے زیادہ ماممتا کو سمجھتے ہیں۔"

پھر ذرا رک کر بولی۔

"میں تو کہتی تھی لبنیٰ کے بجائے شجاع کو لے جاتے، یہ تو ہے بھی انہیں بہت پیاری"

میمونہ بیگم تنک کر بولی۔

"اسے میں خوب جانتی ہوں اسے اور اس کے پیار کو۔اب تو ذرا نہیں امید بھی ہے کہ واپس آ جائے گا۔ شجاع جاتی تو پلٹ کر نہ پوچھتا۔اور تو۔ . . . ."

"وہ تمہیں اتنی بڑی بات کہہ گیا اور تو ہے کہ اس کی تعریفیں کر رہی ہے۔اس نے تو تمہاری خدمت گزاری کی بھی لاج نہ رکھی۔"

غزالہ نے کہا۔

"امی غصّے میں انسان بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔کوئی خدانخواستہ انہوں نے طلاق کا لفظ تو نہیں کہا۔آپ دیکھئے گا وہ آج نہیں تو کل ضرور آجائیں گے۔آپ سامنے نہ ہوتیں تو وہ کہیں نہ جاتے، اسی وقت مجھ سے معافی مانگ لیتے اور پھر ——— قصور تو میرا ہی ہے، میں خود ہی معافی مانگ لیتی، وہ اب بھی میرے ہیں اور میری محبت نہ سہی شجاع کے لئے ہی وہ ضرور آئیں گے۔"

میمونہ بیگم جل کر بولیں۔

"اے میں خوب جانتی ہوں ان مردوں کو اور ان کی محبت کو، مجھ سے سن لو، وہ اب نہیں آئیگا آیا تو لبنیٰ کو لے کر نہیں بلکہ شجاع کو لینے آئے گا۔تم بیٹھی رہو اس پر اعتبار کر کے۔"

غزالہ تڑپ کر بولی۔

"وہ ایسے نہیں ہیں، وہ اب بھی اتنی بڑی بات نہ کہتے، مگر مجھے یہ منحوس دن آپ کی باتوں کی وجہ سے دیکھنا پڑا۔میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے تھے جو ان کی محبت کو آزمانے چلی تھی۔"

میمونہ بیگم بولی۔

"جو آزمائش میں پورا نہ اتر سکا، اس کا کیا بھروسہ۔"

غزالہ خاموش رہی وہ جانتی تھی زیادہ دلیلیں دے گی تو ماں زیادہ بحث کرے گی۔اس لئے خاموشی سب سے بہتر چیز ہے۔اس لئے شجاع کو گود میں اٹھایا اور منہ دھلانے غسل خانے میں لے گئی۔خود اس کا دل بھر بھر آرہا تھا ——— شجاع کا منہ دھلانے میں وہ روتی بھی رہی۔پھر اس نے خود اپنا منہ دھویا۔ وہ اپنی کمزوری کا اظہار ماں کے سامنے نہ کرنا چاہتی تھی ——— غزالہ تو آسمانوں پر بیٹھی خود کو کوئی اور ہی چیز سمجھتی تھی۔مگر نعمان کے چند الفاظ نے اسے معمولی عورتوں میں لا کھڑا کیا۔ وہ دل ہی دل میں ماں سے بھی شرمندہ تھی جس کے سامنے اس نے کھوکھلے دعوے کئے تھے۔

مگر. . . . . . .

پھر بھی. . .

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نعمان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لے۔اس کو یقین تھا کہ نعمان ضرور آئے گا۔کب۔ . . . .؟

یہ معلوم نہ تھا۔

یقین کے باوجود اس کا دل انجانے خدشوں سے دھڑک رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ محبت کا اعتبار ختم ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو۔

کہ

جانے والا پلٹ کر نہ آئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان کی سیدھی سادھی ماں سلطانہ بیگم اس صبح بھی معمول کے مطابق اٹھی۔ سیما باورچی خانے میں تھی، اس لئے وہ روز کی طرح نماز اور پھر تلاوت میں مصروف رہی۔ تلاوت کے بعد ذرا کو باورچی خانے میں گئی، ناشتہ کرنے پھر سیما سے دوپہر کے کھانے کے متعلق ایک دو باتیں کیں اور برآمدے میں آکر تخت پر ہی لیٹ گئی۔ دل تھا کہ بے کل سا ہو رہا تھا۔

سیما کو معلوم تھا کہ بھائی چھٹی کے روز ضرور آتا ہے اور اکثر کھانا بھی کھاتا ہے، اس لئے وہ آج باورچی خانے میں ذرا زیادہ ہی مصروف تھی۔ اماں نے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہ کیا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ برتن سمیٹ رہی تھی کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر ننھی سی سُریلی آواز آئی۔

"دادی اماں ___ پھوپھو جان!"

سلطانہ بیگم بے اختیار بسم اللہ کہہ کر اٹھیں اور باورچی خانے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سیما بیٹی، دیکھو آکر نعمان بچیوں کو ساتھ لایا ہے۔"

اتنی دیر میں لبنیٰ اندر آکر دادی سے لپٹ گئی۔ حالانکہ سب لوگ شجاع کو زیادہ چاہتے تھے مگر لبنیٰ قدرتی طور پر سب سے پیار کرتی تھی۔

نعمان نے سوٹ کیس ڈیوڑھی ہی میں رکھ دیا تھا اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر اندر آیا، ماں کو سلام کیا، وہ دعائیں دینے لگی۔ نعمان وہیں تخت پر ہی بیٹھ گیا۔ سیما آئی اشارے سے بھائی کو سلام کیا اور لبنیٰ کو اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ سوچتا رہ گیا کہ بیوی کی محبت میں وہ ماں اور بہن سے کس قدر غافل ہو گیا تھا۔ اس کی بہن کو باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی۔ اور بھائی بھی دُور ہٹ گیا، وہ جوان تھی، بیاہنے کے لائق مگر اب تک نعمان نے اس کے متعلق نہ سوچا تھا۔

وہ تخت پر نیم دراز ہو کر ماں کا حال احوال پوچھنے لگا۔ اس کا انداز عجیب مجرمانہ سا تھا۔ پھر خود ہی خاموش ہو گیا۔ سلطانہ بیگم اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ نعمان نے دلی کیفیت لاکھ چھپانے کی کوشش کی مگر لاحاصل۔ اس نے پریشانی کے لرزتے سائے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھ لئے تھے۔ مگر ماں بیٹے کے درمیان ایک جھجک سی تھی۔ باورچی خانے سے لبنیٰ کی آواز آرہی تھی یقیناً وہ سیما کو اِدھر اُدھر کی بے سروپا باتیں سنا رہی تھی۔ مگر پھر بھی نعمان کو عجیب سا سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ سلطانہ بیگم اس کی کیفیت کو نظروں نظروں میں جانچتی رہی، پھر ذرا ہمت کر کے بولی۔

"بہو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل ٹھیک ہے"

ذرا خاموشی ___ وہ پھر بولی۔

"شجاع کیسی ہے؟ اسے بھی لے آتے؟"

نعمان خاموش رہا۔

"کبھی بہو کو بھی لے آیا کرو ۔ ۔ ۔ ۔" وہ تمہید باندھ رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے دکھ بھری نظر ماں کے ضعیف چہرے پر ڈالی۔ جب سے نعمان کی شادی ہوئی تھی یہ پہلا موقعہ تھا جو انہوں نے اس طرح کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ نعمان نے منہ دوسری طرف کر کے آنکھیں موند لیں۔

ذرا دیر خاموشی رہی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ باورچی خانے میں بھی مکمل سکوت تھا۔ پھوپھی بھتیجی نہ جانے کن مسئلوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ ماں نے ذرا اور ہمت کر کے پوچھا۔

"بہو کی ماں کیسی ہے؟"

نعمان نے ماں کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

"آپ کو بہو اور اس کے خاندان کی کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے؟"

"بات کیا ہے بیٹا۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"بات، بات کیا ہوگی سب ٹھیک ہے، آپ کو تو وہم ہوتا ہے۔"

"وہم کیسا۔ ۔ ۔ ؟ تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے، تیرا تو چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ آج ضرور بہو سے یا اس کی ماں سے تمہارا جھگڑا ہوا ہے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ایسی ویسی کو میں کیا جانوں، تم ماں سے خواہ کتنا چھپاؤ، اولاد کا دُکھ ماں نہ سمجھے گی تو اور کون جانے گا۔"

سلطانہ بیگم گہری سوچ میں ڈوب کر بولی۔

"تم آج جس طرح آئے میرا تو دل ہی دھڑک کر رہ گیا۔ میں تو تم سے ایک بات کہتی ہوں، شادی کے بعد میاں اور بیوی ہی ایک دوسرے کے دُکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، دوسروں کی حیثیت بعد کی ہو جاتی ہے۔ اگر بہو تمہارا یہاں آنا پسند نہیں کرتی، تو بیٹا میں بھی دل پر پتھر رکھ لوں گی۔ تم بے شک

نہ آیا کرو، میری تو دعا ہے کہ تم سکھی رہو۔ سدا آباد رہو۔"

نعمان نے بچپن کے دور کے بعد ایک بار پھر محبت سے اپنا سر ماں کی گود میں ڈال دیا۔

اور بولا:

"میری بربادی کے بعد یہ آباد ہونے کی دعا دے رہی ہیں، اب میں آپ کے پاس آیا ہوں ہمیشہ کے لئے، اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

ماں کے بار بار پوچھنے پر نعمان نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ سلطانہ بیگم نے بہت تحمل سے ساری بات سُنی، نعمان کا فیصلہ سن کر وہ سناٹے میں رہ گئیں، غزالہ کی عقل پر حیرت ہوئی کہ ذرا سی بات پر اپنا گھر اجاڑ بیٹھی، اسے اپنا ماضی یاد آیا۔

نعمان کے باپ سے جب اس کی شادی ہوئی تو اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ شوہر بھی بڑی عمر کا نہ تھا۔ دونوں میں انتہائی محبت تھی۔ سیما کی پیدائش کے بعد نعمان کے باپ صفدر علی کا ایکسیڈنٹ ہوا تو وہ معذور ہو کر چارپائی پر پڑ گیا۔ دو چھوٹے بچوں کا ساتھ مگر سلطانہ بیگم نے ہمت نہ ہاری، گھر کا سارا کام، بچوں کی تعلیم اور تربیت اور معذور شوہر کی دلداری، سب فرض خوش اسلوبی سے انجام دیئے مگر صفدر علی بہت جلد ان لوگوں سے دُور چلے گئے۔ زندگی کا بھاری بوجھ سلطانہ نے اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ اس نے تو اتنے دل شکن حالات میں بھی ٹھوکر نہ کھائی۔ مگر غزالہ کو کیا ہوا جو ہنسی خوشی رہتے رہتے یوں اجڑ بیٹھی۔ سلطانہ بیگم نے نعمان کو بہت سمجھایا، سب اونچ نیچ بتائی مگر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ ماں بیٹیاں بے نقاب ہو چکی ہیں۔ اب کسی فیصلے سے مُنہ موڑنا ناممکن ہے جبکہ غزالہ کی بھی یہی خواہش ہے

"بچیوں کا کیا ہوگا؟" ماں نے فکر مندی سے کہا۔

نعمان نے ماں کا بجھا بجھا لہجہ محسوس کیا تو بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لبنیٰ آپ کے پاس رہے گی، میں شجاع کو بھی لے آؤں گا۔"

"ارے ہے بیٹا، وہ نگوڑی بچیوں کے بغیر رہے گی۔"

نعمان تلخ لہجے میں بولا۔

"آپ کا مطلب ہے میں بچیوں کو اس فریبی عورت اور اس بڑھیا کے پاس چھوڑ کر تباہ کر دوں۔ آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے، اس کی ماں جو موجود ہے، بیٹی کی شادی کسی اور بد صورت سے کرے گی۔"

نعمان کی ماں کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"توبہ توبہ کرو بیٹا، ابھی تو وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارا کیسا دل گردہ ہے جو ایسی باتیں کرتے ہو۔"

"وہ میری کچھ نہیں لگتی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے آپ بچیوں کی ذمہ داری سے گھبراتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں لبنیٰ کو کہیں اور دے جاتا ہوں۔"

باورچی خانے میں سیما نے لبنیٰ کو سینے سے لگا لیا۔ سلطانہ بیگم نے کہا۔

"ابھی تم غصّے میں ہو، ٹھنڈے دماغ سے سوچو گے تو بچیوں کو ہم سے چھین کر اس کی طرف داری کرو گے ــــ باقی رہی ذمہ داری کی بات تو وہ میرا خون ہیں، جتنا ہو سکے گا جی جان سے خدمت کر دوں گی۔ تمہاری پرورش کی ہے تمہارے بچوں کو پالنا کیا مشکل ہے۔"

پھر اس نے سیما کو آواز دے کر کہا۔

"بھائی کے لئے چائے لاؤ۔"

سیما تو چائے تیار کر کے بیٹھی تھی، فوراً ٹرے میں ناشتہ کا سامان لگایا اور نظریں جھکائے ہوئے آئی۔ لبنیٰ آنچل پکڑے ساتھ تھی۔ نعمان نے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر تخت پر رکھی اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"سیما اب تک میں تم سے غافل رہا مجھے معاف کر دینا۔ ایک بہت بڑی ذمہ داری تمہیں سونپ

رہا ہوں ــــ میں لبنیٰ اور شجاع کو تمہاری تحویل میں دیتا ہوں، تم میری بہن ہو مجھے امید ہے انہیں بہتر تربیت دو گی۔"

سیما نے لبنیٰ کو گود میں لے لیا اور اس کا ماتھا چوم کر گویا بھائی سے عہد کیا اور لبنیٰ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نعمان کے دل کو ذرا سکون ہوا اور وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ بیگم کے خواب ادھورے رہ گئے۔ نعمان نے اپنا دل پتھر کی طرح سخت کر لیا تھا ـــــ

ایک دن گزرا۔ پھر دنوں پر دن گزر گئے۔ مگر نعمان نہ آیا۔ غزالہ بہت ہمت والی تھی، پھر بھی لبنیٰ کے کھلونے اور نعمان کے پرانے کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر وہ خاموش بت سا بن جاتی۔ میمونہ بیگم نے اس کی حالت سے تنگ آ کر لبنیٰ کی سب چیزیں سمیٹ کر نعمان والے کمرے میں ڈال دیں اور دروازے کا تالا لگا کر چابی کمر بند میں باندھ لی۔ غزالہ نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ البتہ شجاع سے اس کی چاہت اور بڑھ گئی تھی، ایک پل کو بھی اسے خود سے جُدا نہ کرتی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا رُواں رُواں نعمان کا انتظار کر رہا تھا۔

اَب اسے

رہ رہ کر اپنی زیادتی کا احساس ہوتا تھا۔

ان الفاظ پر پشیمانی ہوتی تھی جو ایک وفا شعار شوہر کے سامنے اس کے مُنہ سے نکلے تھے۔

اپنی ماں کی ساری چال اس کے سامنے عیاں ہو گئی تھی، کیونکہ میمونہ بیگم نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔

وہ سارا وقت نعمان کو گالیاں دیتی رہتی۔

وہ کہتی

"اے ہے خدا غارت کرے اس موئے کو۔ ۔ ۔ ۔ اس نے تو میری پھول سی بچی کی زندگی تباہ کر دی۔"

کبھی کبھی وہ شجاع کو گود میں لے کر کہتی۔

"واہ ری مَردوں کی ذات، بیوی تو پھر بھی کسی اور کی بیٹی ہوتی ہے، اس کا دُکھ کیا آئے گا مگر اس بدذات کو تو دیکھو پھول سی بیٹی کی محبت بھی نہ آئی کہ آ کر ہم سے معافی ہی مانگ لیتا، اے ہے یوں تو بہت کہا کرتا تھا مجھے شجاع سے بہت پیار ہے۔"

پھر غزالہ کو خاموش دیکھ کر کہتی۔

"دیکھا اس موئی بڑھیا ساس کو کیسا چپکے چپکے بیٹے کو پھانسا ہے تم دیکھ لینا وہ نعمان کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہو گی، ورنہ آج تک کا ہے کو اس طرح دیکھا تھا کہ بیوی نے کہا مجھے طلاق دے دو اور مردوں نے دے دی۔ ایسی بات تو وہی مرد کر سکتا ہے جس کے دل پر کسی دوسری عورت کا قبضہ ہو۔"

"تم تو سدا سے بھولی بھالی تھیں، کتنا سمجھایا، مگر تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

غزالہ ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔ اسے تو نعمان اور لبنیٰ کا انتظار تھا، مگر ایک دن یہ انتظار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے نام ایک رجسٹری آئی۔ غزالہ کا ہاتھ دستخط کرتے ہوئے کانپتا رہا۔ وہ، وہ نہ سوچنا چاہتی تھی جو اس کا ذہن اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی وہ نعمان کے خط پاکر خوشی سے دیوانی ہو جایا کرتی تھی کبھی وہ دن بھی تھے کہ نعمان کا خط پاکر اس کا چہرہ گلاب کی مانند ...ر جاتا تھا۔

مگر آج

آج وہ نعمان کا خط پاکر پریشان ہو گئی تھی۔ اس کا پیلا اور مغموم چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ اپنے آپ میں خط کھولنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔

نہ جانے نعمان نے کیا لکھا ہو۔

غزالہ کا دل دھڑک رہا تھا۔

کہیں طلاق

نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ــــ وہ ایسا نہیں کر سکتے، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

"اے لڑکی، کون کیا نہیں کر سکتے"

پیچھے سے میمونہ بیگم کی آواز آئی۔

اور میمونہ بیگم نے آگے بڑھ کر خط غزالہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

اس مردُوے کا ہو گا خط ــــ اب کے کوئی نئی چال چلی ہو گی ــــ اس کی ماں نے کوئی پٹی پڑھائی ہو گی۔

یہ کہہ کر میمونہ بیگم نے خط چاک کر دیا۔ اور خط کے ہمراہ کاغذات غزالہ کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ذرا پڑھ تو ــــ میری نوگوڑی عینک ہی صبح سے نہیں مل رہی۔

غزالہ نے خط ماں کے ہاتھ سے لے لیا۔

غزالہ بیگم

میں نے اس وقت تمہاری خواہش کے مطابق طلاق نامہ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تھا لیکن...

طلاق نامہ لکھنے سے قبل میں نے ضروری سمجھا کہ تمہیں اپنی پرانی زندگی، اپنی بہار کی ایک جھلک پھر سے دکھا دوں اور جس راستے سے تم بھٹک چلی ہو تمہیں وہ راستہ دکھا دوں جسے زندگی کا راستہ کہتے ہیں۔

غزالہ بیگم زندگی میں بعض مقام ایسے آتے ہیں جہاں پہنچ کر انسان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کیا چاہتا ہے ــــ میں سمجھتا ہوں تم اسی مقام پر کھڑی ہو۔ تم اس وقت دوراہے پر کھڑی ہو اسی طرح کے دوراہے پر میں بھی کھڑا ہوں، تم جو راستہ اختیار کرو گی میں بھی وہی راستہ اختیار کروں گا۔

اب تمہارے سامنے ... ستہ تو یہ ہے کہ تم شجاع کو ساتھ لو اور سیدھی میرے گھر چلی آؤ۔

اس صورت میں میرے اور تمہارے درمیان کوئی اختلاف، کوئی جھگڑا نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق لے لو اور زندگی بھر ماں کے پاس رہو۔

تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ دنیا میں سکون و آرام کا دوسرا نام مکان، جائداد یا دولت ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو دولت مندوں کو کوئی فکر نہ ہوتا اور غریبوں کو سکون کے نام کا بھی علم نہ ہوتا۔

غزالہ بیگم محبت اور پیار کی زندگی کے چند سال سالہا سال کی بے رنگ و بُو زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ مجھے تم پر اور تمہاری ناسمجھی پر ترس آتا ہے۔ شجاع کے لئے فکرمند ہوں، مگر اپنی عزت پر اس فکرمندی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

یہ میرا آخری خط ہے مگر یہ میری آخری تحریر نہیں ہے ہو سکتا ہے آخری تحریر طلاق نامہ ہو....

غزالہ بیگم یہ دھمکی نہیں ہے یہ حالات سے سمجھوتہ ہو گا، اب فیصلہ تم پر ہے جو چاہو گی وہی ہو جائے گا مگر میرا مشورہ ہے کہ خواہ کوئی بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔

آخری بات یہ ہے کہ جو مکان میں نے تمہارے لئے خریدا تھا۔ اس کے کاغذات میرے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے جو اس خط کے ہمراہ بھجوا رہا ہوں تاکہ اگر تمہیں نہ آنا ہو تو تمہیں ان کاغذات کے نہ ہونے کی پریشانی نہ ہو۔

ایک التجا، ایک درخواست تم سے ہے کہ شعاع کو گود میں لے کر بھینچ کر پیار کرنا——

میری طرف سے

نعمان"

غزالہ بیگم نے خط پڑھا۔

ایک بار ہی نہیں

دوسری بار

اور

پھر تیسری بار

اور اس کا جی چاہا کہ وہ شعاع کو گود میں اٹھائے اور سب چیزوں کو ٹھکرا کر نعمان کے پاس چلی جائے اور اس کے گلے لگ کر اس قدر روئے۔

اس قدر روئے۔

کہ

نعمان ان آنسوؤں میں ڈوب جائے اور وہ تمام غبار چھٹ جائے جو اس کے دل دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

سارا دن وہ گم سم رہی۔

سارا وقت خط کے الفاظ اس کا پیچھا کرتے رہے۔

پوری رات وہ سو نہ سکی۔

خیالات تھے کہ طوفانوں کی طرح امنڈے چلے آ رہے تھے۔

وہ سب سے چھپ کر خوب روتی رہی۔ سارا غبار دُھلا تو اس نے خط اٹھا کر پھر بار بار پڑھا۔

اب کی بار اس خط نے اس پر اور ہی طرح کا اثر کیا۔

اسے محسوس ہوا کہ

نعمان نے کبھی اس سے سختی سے بات بھی نہ کی تھی مگر اب اس نے اسے اتنے سخت الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔ اور نام کس طرح لکھا تھا۔

وہی غزالہ بیگم

صرف غزالہ بیگم

اور

غزالہ بیگم کے اندر سوئی ہوئی عورت، مغرور عورت پھر پوری شدت سے جاگ اٹھی نعمان نے اسے اتنے سخت الفاظ میں مخاطب کرنے کی جرأت کیوں کی، کیا وہ اس کی باندی ہے، اس کی زرخرید کنیز ہے جو شعاع کو اٹھا کر اس کے پاس بھاگی بھاگی جائے گی۔

ان بے تکے الجھے الجھے خیالات میں ساری رات گزر گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر میمونہ بیگم نے غزالہ کی حالت بدلی بدلی سی دیکھی، اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے دیکھے، وہ تیکھی نظروں سے غزالہ کی بدلتی رنگت دیکھتی رہیں۔ آخر بولیں:

"کیسی طبیعت ہے بیٹی"

جواب میں غزالہ نے نعمان کا خط ان کے آگے رکھا اور بولی۔

"امی، ان کا خط"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں، میں تو پوچھنا ہی بھول گئی، کیا لکھا ہے؟"

"انہوں نے مجھے بلایا ہے۔"

"خبردار لڑکی، اگر تم نے جانے کا نام لیا۔"

پھر خط اٹھا کر بولیں:

"میں دیکھتی ہوں کیا لکھا ہے اس میں۔"

خط پڑھنے کے بعد میمونہ بیگم بولیں۔

"بس کام بن گیا۔ اب دیکھنا وہ خود ہی بھاگا بھاگا آئے گا۔"

"کیسے؟"

"شجاع کی خاطر۔"

"لیکن امی، خط کے الفاظ تو دیکھو۔"

"ہاں دیکھے ہیں، کتنے کھوکھلے ہیں، جب وہ خفا ہی ہے تو نصیحتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں امی، تم اسے نہیں جانتی ہو۔"

"اے میں خوب جانتی ہوں ان مردوں کو اور ان کی عادتوں کو، جو ان کی باتوں میں آیا اس کا کام تمام۔ . . اب تم اسے خط لکھ دو کہ یا تو یہاں آ کر معافی مانگے یا طلاق بھجوا دے اور دیکھو خبردار شجاع کا نام بھی نہ لکھنا۔"

"لیکن امی، یہ زیادتی ہے۔"

"اے لڑکی تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"

"اور جو سچ مچ انہوں نے طلاق بھجوا دی تو؟"

"تم ابھی نادان بچی ہو، میں تمہارا گھر برباد تو نہیں ہونے دوں گی، ذرا سی سختی سے گھبرا گئیں،

تم دیکھنا تمہاری زندگی کیسے سکھ میں گزرے گی۔ خود ہی بھاگا بھاگا آئے گا۔ اے اولاد کی محبت کے آگے کسی ماں کی، کسی بہن کی محبت نہیں آتی۔ بس جو میں کہوں وہی لکھ دو۔"

اور پھر میمونہ بیگم نے لیٹر پیڈ اور قلم لا کر غزالہ کے آگے رکھا اور کہا

"لکھو۔"

غزالہ نے بادل نخواستہ پیڈ آگے کھسکایا اور قلم سنبھالا۔

لیکن

کاش وہ اس وقت شجاع کی معصوم نظروں کی طرف دیکھ لیتی مگر اس کو اتنا ہوش کہاں تھا

اس کی ماں نے کہا:

"لکھو۔"

اور غزالہ لکھنے لگی۔

"نعمان

تمہارا خط ملا۔ میں نے جو فیصلہ بھی کیا ہے خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تم نے یہاں بھی میری اور میری ماں کی بے عزتی کی تھی۔ اب خط اس انداز سے لکھ کر مزید بے عزتی کی ہے۔ اب میری رائے تو یہی ہے کہ تم . . . اگر تم آ کر میری ماں سے معافی مانگو تو میں اپنا فیصلہ بدلنے کی کوشش کروں گی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ میری ماں تمہیں معاف کر دے۔ اس صورت میں تم یہاں آ کر رہ سکتے ہو۔

ورنہ

میرے تمہارے راستے جدا ہو چکے ہیں آخری فیصلہ یہی ہے کہ مجھے طلاق بھجوا دو۔

غزالہ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ نے لکھنے کو تو خط لکھ دیا مگر اندر سے اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ ماں کی باتوں نے یہ دن دکھایا تھا۔ اب آگے نہ معلوم کیا ہو۔

نعمان کے کمرے کو تالا لگا کر چابی میمونہ بیگم نے چھپا دی تھی۔ غزالہ کا دل چاہتا اس کمرے [illegible] بس ہیں نعمان کی خوشبو ہے مگر وہ مجبور تھی۔ اس کی ماں اس پر حاوی تھی۔ میمونہ بیگم نے حکم دینا سیکھا تھا۔ اس نے ساری عمر شوہر پر حکم چلایا اس کے بعد بیٹی کو قابو میں رکھا نا معلوم غزالہ کی شادی کے سلسلے میں کیسے بیٹی سے شکست کھا گئی تھی۔ شاید اسی شکست کا بدلہ وہ اب لینا چاہتی تھی۔

غزالہ نے

ہمیشہ وہی کیا جو اس کی ماں نے چاہا۔

اسی لئے

جب میمونہ بیگم

نعمان اور اس کے گھر والوں کو کوسنے دیتی، دامن پھیلا کر

بد دعائیں دیتی

تو

غزالہ خاموشی سے سنتی رہتی۔

شروع کے ایک دو دنوں میں اس نے ذرا نعمان کی حمایت کی تھی تو میمونہ بیگم اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ اس لئے اب غزالہ ہر بات کے جواب میں چپ رہتی، پھر بھی میمونہ بیگم بولتی رہتیں۔

"اے ہے کیا زمانہ آ گیا ہے، اولاد ماں باپ کو فوراً جواب دینے لگتی ہے، بات بھی پوری

نہیں ہونے دیتی۔"

کبھی کہنے لگتیں:

"اے بی! تم کل کی چھوکری ہو، میں نے یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کئے۔ آخر سسرال میں زندگی گزاری ہے، اپنا تجربہ بتاتی ہوں کہ مرد کو جتنی ڈھیل دی جائے وہ اتنا ہی سر پر چڑھتا ہے اور عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ عورت میں اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ مرد کو قابو میں رکھے۔

مگر

"میں تمہیں کیا کہوں اب میری اولاد ہو کر تم اتنی بے وقوف نکلیں، میری ایک بھی ہدایت پر عمل نہ کیا، ہزار بار مغز کھپاتی رہی مگر تم نے ایک نہ سنی۔ اگر شروع سے ہی دبا کر رکھتیں تو یوں ذرا سی بات پر فوں فوں کرتا ہوا نہ جاتا۔ ہزار باتیں تمہارے ساتھ مجھے بھی سنا گیا۔ تمہارے ابا کی اتنی جرأت نہ تھی کہ مجھے پلٹ کر اونچی آواز سے جواب بھی دیتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر تمہاری بے وقوفی سے داماد بے عزتی کر گیا۔"

غزالہ خاموش بیٹھی سنتی رہتی، کیونکہ وہ بھی کہاں تک جواب دیتی جب کہ میمونہ بیگم اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے ایک ہی بات کرتی رہتیں۔ غزالہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ میمونہ بیگم ڈٹ کر کھاتی ہیں۔

ڈٹ کر سوتی ہیں۔

گھر کا سارا انتظام سنبھال رکھا ہے، روپیہ پیسہ، زیور سب ان کے قبضے میں تھا۔

وہ

نوکروں پر خوب خوب حکم چلاتیں اور فارغ وقت میں اپنے کوسنے اور طعنے معنے بھی پورے کرتی رہتیں۔ وہ خوش اور مگن تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر

ان سب باتوں کے باوجود غزالہ کو نعمان اور لبنیٰ کا انتظار تھا۔ تمام شک و شبے اور وسوسوں کے باوجود اسے موہوم سا یقین تھا کہ نعمان ضرور آئے گا اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگے گا۔ اور اس کی جنت پھر سے آباد ہو جائے گی۔

ان حالات کے باوجود بھی۔

بے وقوف غزالہ خطا کار نعمان کو ہی ٹھہراتی تھی۔ پوری نہ سہی تھوڑی تھوڑی سی تو میمونہ بیگم سے ملتی تھی۔

ایک شام غزالہ میز پر بیٹھی تھی۔ سوچوں کی دنیا میں گم۔ نعمان کا خط اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا جائداد کے کاغذات بھی سامنے دھرے تھے۔

یہ مکان اسی نے بنوا کر دیا تھا کاغذات اسی کے پاس تھے، وہ چاہتا تو ان ماں بیٹی کو گھر سے نکال باہر کرتا۔

لیکن نہیں۔

اس نے تمام کاغذات اسے بھیج دیئے تھے۔ اس بات سے غزالہ کے دل میں محبت اور یقین کے گرتے ہوئے ستون پھر سے مضبوط ہو گئے۔

اس لئے اگر نعمان کو اس کا خیال نہ ہوتا تو وہ یہ حرکت کیوں کرتا۔ اس نے مکان کے کاغذات بھیجنے کے بجائے طلاق نامہ ہی بھیجا ہوتا۔

غزالہ انہی سوچوں میں گم شعاع کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ میمونہ بیگم جہاں دیدہ عورت تھی، کچھ کچھ اس کی حالت کو سمجھ گئیں کہ داماد کا پھینکا ہوا پانسا سیدھا پڑا ہے لیکن وہ

اس بات پر خاموش رہیں۔ نیا زخم کیا چھیڑنا، ذرا بات پرانی ہو گی زخم پر کھرنڈ آئے گا نئے زخم کو کرید کر زیادہ تکلیف ہوتی ہے، یہی سوچ کر میمونہ بیگم نے کاغذات سنبھالے، ان کا بغور جائزہ لیا اور حفاظت سے رکھنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ خالی لفافہ اڑ کر غزالہ کے پاؤں کے پاس آ گرا۔ اور کسی زخمی کی طرح لرزنے لگا۔ غزالہ نے لپک کر لفافہ اٹھایا، اس کے اندر جھانکا اسے جھاڑا، مگر وہ تو خالی تھا۔ غریب کی جیب کی طرح، بیوہ کی مانگ کی طرح۔

غزالہ بیگم

غزالہ نے اس پر انگلی پھیری اور بڑبڑائی۔

غزالہ بیگم ——— غزالہ بیگم ——— غزالہ بیگم

گویا نعمان نے صرف غزالہ بیگم لکھ کر اسے جتایا ہے کہ اس کے دل میں غزالہ کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی وہ اسے اب شریک زندگی نہیں سمجھتا۔ اب تک وہ خود اسے

غزالہ نعمان

بلکہ کئی بار تو مذاق میں

نعمان غزالہ

لکھا کرتا تھا۔ مگر آج اسے اس نے صرف غزالہ بیگم لکھا تھا۔

غزالہ ہاتھ میں لفافہ لئے خاموش ذہنی طور پر مصروف بیٹھی تھی۔ شعاع اس کے زانو پر سو چکی تھی۔ میمونہ بیگم اندر آئیں۔ مگر غزالہ کو خبر نہ ہوئی۔ انہوں نے شعاع کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا اور خود باہر چلی گئیں اور

غزالہ اکیلی ذہن میں اٹھتے طوفانوں سے لڑتی رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہنے کو تو بہت آسان تھا کہ حالات سے مجبور ہو کر نعمان لبنیٰ کو لے کر آ گیا تھا مگر ایک کسک تھی، ایک خلش تھی جو کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی۔ ایک طرف جہاں اسے شعاع کی یاد تڑپاتی تھی، جہاں شعاع کی بھولی بھالی باتیں بے چین رکھتی تھیں وہاں اسے پیار اور محبت سے گزاری ہوئی زندگی کے سکون بخش لمحات بھی اکثر ڈستے تھے۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا

اس کی سوچیں جواب دے دیتیں۔

اس نے عورت کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا

وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ زندگی میں کوئی ایسا مقام بھی آ سکتا ہے جہاں اتنا پیار کرنیوالی بیوی، زندگی بھر کی جدائی کے لئے تیار ہو سکتی ہے۔

اس نے غزالہ کو خط لکھا۔

اور

خط لکھ کر مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ اس خط کو صبر اور تحمل سے پڑھ کر زندگی کی سچی اور حقیقی راہ کا انتخاب کرے گی اور ایک دن آ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دے گی۔

سوچتے سوچتے اسے وہ نظم یاد آ گئی جسے وہ شادی سے پہلے بھی غزالہ کو سنایا کرتا تھا۔

جب بھی گیت سنتا ہوں
شام کی ہواؤں سے
کتنے پیارے لگتے ہیں
یہ درخت، یہ پودے
جیسے میری گردن میں
ڈال کر کوئی باہیں
میرے دل کی سب باتیں
مجھ سے پوچھنا چاہے
تم کو کون سا غم ہے
کیوں اُداس رہتے ہو

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ پیچھے سے آ کر کسی نے آنکھیں موند لیں۔

نعمان نے پوچھا۔

"کون؟"

جواب میں خاموشی رہی۔

نعمان نے پھر پوچھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کون ـــــ؟"

پھر بھی جواب نہ ملا' البتہ چوڑیوں کی کھنک اس کے کانوں میں پڑی اور اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

غزالہ آگئی ـــــ اس نے سوچا۔

لیکن وہ بہت جلد اس کا نام نہیں لینا چاہتا تھا ـــــ وہ انجان بنا رہنا چاہتا تھا اس نے ہاتھوں کو چھو کر دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

اور پھر پوچھا۔

"کون ـــــ؟"

پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر غزالہ کو گلے لگالے۔

مگر

بڑی مشکل سے اس نے اپنی خواہش پر قابو پایا۔

"میں پوچھتا ہوں کون ہیں آپ؟"

پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ غزالہ دراصل بہت شرمندہ ہے' اس لئے خاموش ہے۔

پھر وہ خود بخود ہی بولنے لگا۔

"غزالہ' میری غزالہ' میری زندگی' میری روح ـــــ مجھے معلوم تھا' میں جانتا تھا کہ تم میرے خط پر چلی آؤ گی اور میرے سینے سے لگ جاؤ گی' تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ دراصل میاں بیوی کے درمیان کوئی لڑائی ہوتی ہی نہیں"

جب گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا۔

اور وہ کہتا رہا۔

میں جانتا تھا کہ تم طلاق لینا نہیں چاہتی ہو' تم مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتی ہو' یہ سب جال' یہ مکر و فریب کا جال تمہاری ماں کا پھیلایا ہوا ہے' تمہیں اس نے اس حصار میں بند کر رکھا ہے' تمہیں میرا خط ملے گا تو تم وہ حصار توڑ کر سیدھی میرے پاس چلی آؤ گی۔

اور

تم آگئیں۔

میں جانتا تھا کہ ہماری سچی محبت کے درمیان کوئی نہیں آسکتا۔

تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔

اتنے میں آنسوؤں کے قطرے اوپر سے گرے اور گرم گرم آنسو نعمان کے رخساروں سے ٹکرائے۔

نعمان نے کہا۔

"پگلی تم رو رہی ہو' بھلا میں نے تمہیں کچھ کہا تھا' بھلا میں تمہیں طلاق دے دیتا۔

اور ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ دبی ہوئی آنکھیں چھوڑ دی گئیں۔

نعمان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ غزالہ کو گلے لگا لے۔

کہ

اس نے گھوم کر دیکھا۔

اس کے سامنے حنا کھڑی تھی

حنا

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے کہا

" حنا ———— تم؟"

" ہاں میں"

مگر

حنا نے کہا۔

" تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم اتنے دُکھی ہو"

نعمان حیرت سے حنا کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی باہیں چوڑیوں سے خالی تھیں مگر چوڑیوں کی وہ کھنک تو اس کے رگ و پے میں اب بھی گونج رہی تھی نعمان نے غور سے دیکھا غزالہ نہیں وہ حنا ہی تھا۔ سفید ساڑھی سفید بلاوز، آنکھوں میں لرزتے ٹپکتے موتی۔

لیکن

وہ خوشبو

وہ چوڑیوں کی کھنک۔

یہ کیسا واہمہ تھا جس پر حقیقت بھی حیران تھی۔

حنا نے جو نعمان کو اس طرح کھلی کھلی آنکھوں سے اپنی طرف تکتے پایا تو حیا کا غبار دل سے اٹھا اور حنا کے چہرے پر چھا گیا اس نے اپنی سیاہ پلکوں کو ایک لحظے کے لئے جھکا لیا مگر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا معصوم وار نعمان پر اثر کئے بغیر رائیگاں گیا تو اس کا دل چوٹ کھائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر رحم ایک بار پھر اس کے دل میں اُٹھا۔ اس نے ایک بار پھر نعمان سے کہا۔

" نعمان تمہیں غزالہ سے اتنی محبت ہے کہ تم سایوں سے بھی مخاطب ہوتے ہو تو تم غزالہ کو منا کیوں نہیں لیتے"

نعمان ہوش میں تو آ گیا تھا مگر اپنی بے تابی پر خجل تھا۔ اس لئے خاموش رہا،

حنا نے پھر کہا

• نعمان محبت کرنے والے ایک دوسرے کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں تم بھی غزالہ کی غلطی معاف کر دو اور اسے منا لو۔ اپنے بچوں کی خاطر۔

نعمان یک دم چلا اُٹھا۔

مس حنا آپ میری کمزوری کا غلط فائدہ مت اٹھایئے۔ مجھے آپ کے مشوروں یا آنسوؤں کی ضرورت نہیں ہے۔

میں محبت پر اپنے وقار اپنی عزت کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے یا کیا کرنا چاہیئے۔ یہ میرا سراسر ذاتی معاملہ ہے۔

حنا کو نعمان سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ اس کی ہمدردی کے جواب میں نعمان جو اس کے باپ کا ماتحت بھی ہے اس طرح اسے جواب دے گا نعمان کے اس قدر سخت الفاظ سن کر وہ ایک دم تو سکتے میں رہ گئی پھر وہ ایک شکوے بھری نگاہ نعمان پر ڈال کر رخصت ہو گئی اور عورت کے ہتھیار سے کیا گیا یہ دوسرا وار بھی خالی گیا اور

نعمان

جس کا دل زخموں سے چُور چُور اور دماغ غموں سے بوجھل تھا میز پر سر ٹیک کر بیٹھا رہ گیا۔ وہ دفتر میں نہ ہوتا تو شاید اس وقت دیواروں سے سر پھوڑ لیتا مگر وہ انسان ہی تھا۔

انسان جو دیوانگی میں بھی فرزانہ ہی بننا چاہتا ہے۔

نعمان بھی ایسا ہی انسان تھا کمزور اور طاقتور

"غزالہ تم نے مجھے کس عذاب میں لا ڈالا ہے"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔

لبنیٰ وہ ننھی سی جان جو خوشی خوشی باپ کے ساتھ آ گئی تھی۔ ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت تھی۔ کوئی بہت ہی دلارے بلاتا تو وہ ایک میٹھی مسکراہٹ سے شرما کر رہ جاتی۔ اس کے سامنے نعمان شجاع سے لاڈ پیار کرتا وہ ماں کے پہلو میں بیٹھی دیکھتی رہتی۔ ابھی اس کی عمر اتنی نہ تھی کہ وہ شجاع سے حسد کرتی پھر بھی وہ ایسے موقعوں پر باپ کے پاس کھڑی ہو جاتی۔ بہانے بہانے کندھے پر منہ رکھتی اور بات بات پر مصنوعی قہقہوں کے پھول برساتی" اس کی معصوم حرکتیں دیکھ کر نعمان خوب ہنستا اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتا ایسے میں لبنیٰ پھول کی طرح ہلکی ہو جاتی تھی۔ مگر عجیب اتفاق تھا کہ باپ کے ساتھ آنے میں اس نے پہل کی تھی اور لاڈلی شجاع کو چھوڑ دیا تھا۔

مگر

گھر چھوڑتے وقت لبنیٰ کو یہ خبر تو نہیں تھی کہ وہ دوبارہ ماں کے پاس نہ جا سکے گی شجاع سے نہ کھیل سکے گی۔

لبنیٰ۔ دادی ماں اور پھوپھی کے پاس آ کر وہ بجھ کر رہ گئی۔ سیما اور بوڑھی دادی کی صحبت میں وہ بولتی تو کیا بولتی، چپ کی چپ رہ گئی۔

یہ بھی ایسی بڑی بات نہ تھی اگر نعمان اپنا رویہ درست رکھتا مگر نعمان کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا اتنے سے دنوں میں وہ بے حد کمزور اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ ایک تو اس کی محبت اور بے انتہا نوازشوں کا صلہ اتنا تلخ ملا تھا دوسرے اس کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ پھر غزالہ کی ہٹ دھرمی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آدھی رات کو گھر لوٹتا اور خاموشی سے سو جاتا۔ لبنیٰ سامنے کبھی آ بھی جاتی تو نظر انداز کر دیتا۔

ایک دوبار اماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بے حد بلند آواز سے بولنے لگا۔ اپنی

حالت اپنے فیصلے کے بارے میں دلیلیں دینے لگا۔ لبنیٰ کے دل میں ابھی ماں اور باپ کی تلخ کلامی کی یاد تازہ تھی وہ سہم گئی پھر اس نے دیکھا کہ سیما بھی سہمی ہوئی ہے تو لبنیٰ اور بھی ڈر گئی اور سیما کے سینے سے جا لگی۔ اب یہ معمول ہی بن گیا تھا کہ دونوں سہمی سہمی لڑکیوں نے خود کو ایک دوسرے کا سہارا بنا لیا تھا، سیما نے لبنیٰ کو اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ مگر نعمان کو کوئی خبر نہ ہوئی۔

ننھی لبنیٰ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ نعمان بے خبر رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سوائے اس کے دکھوں کی کسی کو خبر نہ تھی۔

مگر وہ نادان کیا جانتا تھا کہ اس کے دکھوں پر کڑھنے والی اس کی ماں موجود ہے اس کی رنجشوں پر سہم جانے والی اس کی بہن ہے اور اس کے تیور پہچان کر کانپنے والی بیٹی سبھی اس کے غموں اور دکھوں کے شکار ہیں۔

سلطانہ بیگم کو کھانسی نے آ گھیرا۔ مگر نعمان کو خبر نہ ہوئی۔ اسے تو ایک ہی لگن تھی کہ غزالہ معافی مانگ لے۔

مگر غزالہ بیگم بھی میمونہ بیگم کی بیٹی تھی۔ وہ ہار کیسے مان لیتی۔ اگر میمونہ بیگم ہر وقت اس کے سر پہ سوار نہ رہتیں تو غزالہ بیگم شاید کمزوری کے کسی لمحے سے مات کھا جاتی مگر مثل مشہور ہے کہ پتھر پر بھی مسلسل بوند گرتی رہے تو نشان بن جاتا ہے غزالہ تو پھر بھی انسان تھی کمزور سی عورت تھی میمونہ بیگم کے تجربوں کے ذکر نے آہستہ آہستہ اس کا دل سخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ شجاع سے اتنی محبت نہ کرتی تھی۔ اسے شجاع کے چہرے میں نعمان کا چہرہ نظر آتا تھا۔

نعمان

جو بے وفا تھا۔

سنگدل تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس نے غزالہ بیگم پر ظلم کئے تھے۔
اس کی ماں کی بے عزتی کی تھی۔
مگر ان باتوں میں غزالہ بیگم کو کبھی ان لمحوں کی یاد نہ آئی کبھی اس رات کی یاد پر شرمندگی نہ ہوا
جب وہ اور میمونہ بیگم
اپنے گھر کے سکھ میں دکھ کی پہلی چنگاری پھینک رہی تھیں۔
جب وہ ایک محبت کرنے والے شوہر کے دل میں نفرت کا پہلا بیج بو رہی تھیں۔
مگر مسلسل اذیت ناک انتظار نے غزالہ کے دماغ پر اُلٹا ہی اثر کیا تھا۔ وہ نعمان کو ظالم انسان سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔
دن رات اس کی آہٹ پر کان دھرنے والی غزالہ اب بات بات پر جھنجھلانے لگتی تھی۔
مگر پھر بھی
پوسٹ مین کو دیکھ کر اس کا دل حلق میں پھنس کر رہ جاتا اور کتنی دیر تک وہ سنسناتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ بے سُدھ پڑی رہتی۔

اور

میمونہ بیگم کے پاس خدا جانے کہاں سے نئے نئے ہتھیار آجاتے تھے وہ دن رات ایک ہی موضوع پر بولتے بولتے کبھی نہ تھکتی تھی۔

غزالہ بیگم کو یقین تھا کہ نعمان اسے دوبارہ ضرور خط لکھے گا شعاع کی خاطر ہی سہی یہ یقین اسے میمونہ بیگم نے دلایا تھا مگر نعمان نے کوئی خط نہ لکھا۔ اس نے غزالہ بیگم کے خط کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ مگر غزالہ کو کیا خبر کہ نعمان خود سے کس قدر لڑ رہا تھا۔ اس نے بار بار طلاق نامہ لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا مگر ہر بار شعاع کے تصور نے آہستگی سے اس سے قلم چھین لیا۔

اور جب بھی اس نے صلح نامہ لکھنا چاہا اس کی غیرت نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چٹان بن کر رہ گئے تھے۔ غزالہ طلاق نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے انتظار میں تھی اور
نعمان
لاکھ چاہنے پر بھی اسے ایک لفظ طلاق نہ لکھ سکا تھا۔

سلطانہ بیگم کو خبر نہ تھی کہ زندگی کے اتنے سال چپکے چپکے سلگنے کے بعد آخری عمر میں انہیں اس طرح جلنا پڑے گا۔ دکھوں کے شعلے تھے کہ ان کی بوڑھی ہڈیوں کو سوکھی لکڑی کی طرح دھڑا دھڑ جلا رہے تھے۔ اور وہ بے بسی سے جل رہی تھیں۔ بخار اور کھانسی سے زیادہ بدلتے ہوئے حالات نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی خرابی صحت کا علم نعمان کو نہ ہونے دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ آج کل بہت پریشان ہے' ایسے میں ماں کی بیماری کا سن کر یا تو وہ بے حد پریشان ہو جاتا

اور

یا ——— یا وہ پرواہ نہ کرتا تو ماں کا اعتماد ٹوٹ جاتا۔ اور اعتماد کا ٹوٹنا انسان کی موت ہی تو ہے۔ سلطانہ بیگم کو معلوم تھا کہ سیما نعمان سے جا کر کبھی نہیں بتائے گی وہ تو کبھی ماں سے بے تکلف ہو کر بات نہ کرتی تھی۔ وہ تو پھر بھی بھائی تھا' سارے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ بول سکتی تھی' البتہ لبنیٰ کو سلانے کے بعد وہ رات کے آخری پہر تک جاگا کرتی۔ سوچوں میں ڈوبی رہتی اور پھر چپکے چپکے رو لیا کرتی تھی۔
اس کی خوبصورت آنکھوں کے پپوٹے متورم سے رہتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نرگس بیمار کی طرح
زرد اور خوبصورت

سلطانہ بیگم کو سیما کی طرف سے بھی بڑی فکر تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی میں سیما اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ مشورہ کس سے کرتیں۔ ایک دن سیما کو بلایا۔ وہ لبنیٰ کو ساتھ لئے ہوئے آئی پلنگ کے کونے پر ٹک گئی۔ سلطانہ بیگم نے دکھ اور محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ راتوں کو چپکے چپکے ان کا سر دبانے والی، ان کی نبض ٹٹولنے والی، ان کی بیٹی ہی تھی۔

جی اماں جان

سیما نے مسلسل خاموشی سے متاثر ہو کر آہستہ سے کہا۔ سلطانہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لبنیٰ سیما کا دوسرا نمونہ تھی ایک ہاتھ پھوپھی کے زانو پر دھرے وہ پوری آنکھیں کھولے دادی کو تک رہی تھی۔

یہاں آؤ بیٹی

لبنیٰ اُٹھ کر پاس آ بیٹھی۔ سلطانہ بیگم کے منہ سے آہ سی نکل گئی۔

بیٹی کوئی بات کیا کرو

جی اچھا۔

تمہیں شجاع یاد آتی ہے۔

جی ہاں۔ دادی اماں اس کو بھی بلا لیں۔ نانی اماں ڈانٹتی رہتی ہیں۔

اچھا بیٹی! بلا لیں گے۔

امی کو بھی، دادی اماں۔

ہاں بیٹی! امی کو بھی بلا لیں گے۔ تم اپنے ابو سے کہنا۔

ابو سے؟ نہیں دادی اماں۔ ابو سے ڈر لگتا ہے۔

ابو سے کیوں ڈر لگتا ہے بیٹی۔ وہ تو تمہارے ابو ہیں۔ تمہیں پیار کرتے ہیں۔

پیار نہیں کرتے دادی اماں۔

تمہیں کون اچھا لگتا ہے۔

پھوپھو جان۔ اور آپ

لبنیٰ بیٹی اگر تمہاری پھوپھو جان کو ہم کہیں بھیج دیں۔

سلطانہ بیگم نے سیما کی حیرت پر بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تو تم بتاؤ کیا کرو گی میرے پاس رہو گی۔

پھوپھو جان کے پاس رہوں گی۔

تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تمہاری پھوپھو جان کی شادی ہو؟

تو کر دیں پھوپھو جان کی شادی کر دیں دادی اماں۔ مزہ آئے گا۔

جاؤ پھوپھو سے پوچھو۔

لبنیٰ نے سیما سے بار بار پوچھا مگر وہ خاموش رہی۔ یہ نہیں کہ شرما رہی ہو بلکہ وہ تو سنگی بت کی طرح خاموش تھی۔ آخر سلطانہ بیگم نے کہا

بیٹی ہمت نہیں پڑتی، مگر ساجد کی والدہ تمہارے لئے خواہش مند ہیں۔ میں تم پر جبر نہیں کرتی اتنا بتا دو۔ مستقبل کا کیا فیصلہ ہے۔

سیما نے سر نہیں جھکایا۔ شرمائی بھی نہیں، بس خاموش رہی۔ سلطانہ بیگم جانتی تھیں۔ وہ بولے گی نہیں۔ تکیئے تلے سے تصویر نکال کر سیما کی طرف بڑھائی اور بولیں۔

یہ تصویر ہے اور ساتھ ہی تفصیل بھی۔ کمرے میں جا کر دیکھ لو، اور جو فیصلہ کرنا ہو۔ لکھ کر لبنیٰ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہاتھ بھیج دینا۔

سیما نے لبنیٰ کو گود میں اٹھایا اور سلطانہ بیگم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے خاموشی سے کمرے سے باہر آگئی۔ سلطانہ بیگم آنسو بھری نگاہوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے تصویر تکیے کے نیچے رکھ لی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نعمان سے اس سلسلے میں ضرور بات کریں گی۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ آنکھیں ذرا ذرا لگیں کہ لبنیٰ نے تہہ کیا ہوا کاغذ ان کے ہاتھ میں لا رکھا۔ سلطانہ بیگم نے جلدی سے کھولا۔ سیما نے لکھا تھا۔

اچھی اماں جان

بھائی جان نے لبنیٰ مجھے سونپی تھی۔ میں سب حالات سمجھتی ہوں آپ فکر مند نہ ہوئیے گا لبنیٰ کو اس کی امی مل جائیں تو میں آپ کی بات ضرور مان جاؤں گی، دوسری صورت میں مجھے معاف کر دیجئے گا۔

آپ بھائی جان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کیجئے گا۔ یہ میری التجا ہے۔

آپ کی سیما

سلطانہ بیگم دھک سے رہ گئیں۔ ان کے دل میں درد کی لہر سی اُٹھی اور نڈھال سی ہو کر رہ گئیں۔

سلطانہ بیگم کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی نعمان اس رات کو بھی بہت دیر سے آیا تھا۔ اور بغیر کسی سے بات کئے بستر پر دراز ہو گیا تھا مگر اماں کی کھانسی کی آواز نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کھانسی کے ہر جھٹکے پر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ آخر وہ اٹھا اور بے تابی سے سلطانہ بیگم کے کمرے میں گھستا چلا گیا۔ مدھم مدھم سی روشنی میں سلطانہ بیگم بستر پر پڑی کھانس رہی تھیں اُن کا ہاتھ تھامے سیما بیٹھی تھی

امی جان! نعمان بے تابی سے لپکا۔ اور ماں کی طرف دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر ان سب سے کس قدر بے خبر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے غموں کے بوجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ گراں سمجھ رہا تھا اس کے گھر کا ہر فرد اس کے تلے پس رہا تھا۔ وہ کتنا خود غرض ہو گیا تھا۔ سلطانہ بیگم نے آنکھیں کھول کر نعمان کی طرف دیکھا وہ کتنا کمزور اور دکھی معلوم ہو رہا تھا۔ سیما نے سر جھکا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلطانہ بیگم نے آہستہ سے پکارا۔

نعمان۔ بیٹا تو آ گیا؟

ہاں امی جان میں آ گیا

تو سُن لے مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ نصیحتیں کر سکوں۔ تم نے اپنی بیٹی ہمیں سونپی تھی آج میں یہ دونوں تمہیں سونپتی ہوں۔ دیکھنا میری روح کو تکلیف نہ دینا زندگی کا فیصلہ کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنے لئے جو بہتر سمجھو وہی کرنا، بس سیما . . . . سیما۔ سیما پر کبھی جبر نہ کرنا اپنا فیصلہ اس پر نہ ٹھونسنا۔

کھانسی کے جھٹکوں میں بمشکل انہوں نے اتنی بات کی۔

میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔

نعمان ایک جھٹکے سے اُٹھا۔ سلطانہ بیگم نے اس کا بازو پکڑنا چاہا مگر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ دوڑتا چلا گیا۔ سلطانہ بیگم نے صرف اتنا کہا۔

آخری دم صورت تو دیکھنے دیتے۔

نعمان جب ڈاکٹر کو لے کر آیا تو سلطانہ بیگم پر غشی کا عالم طاری تھا۔ سانس دقت سے آ رہی تھی۔ اور گم سم سیما ان کی صورت تکے جا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور نعمان نے اس کے انداز ہی سے وہ اندازہ لگا لیا جس کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

مجھے افسوس ہے نعمان صاحب کہ دوا کا وقت نکل چکا ہے دعا کی ضرورت ہے۔ اپنے رشتے داروں کو اطلاع دے دیجئے۔

ڈاکٹر نے باہر کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ نعمان کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھا چند لوٹ پیئے سوئے افسوس کی نگاہ ڈال کر ڈاکٹر نے کہا۔

شرمندہ نہ کیجئے۔ مجھے افسوس ہے بات میرے بس میں نہیں ہے۔

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ ہر پل آخری پل محسوس ہوتے ہوئے بھی گزرا چلا جا رہا تھا۔ اور جب رات کے بعد صبح کی نئی کرن ابھری سانسیں ڈوب گئیں۔ جو وقت گزرا جتنا بھی کٹھن گزرا گزر گیا۔ موت ایک بار پھر جیت گئی تھی۔ ایک بزرگ ہستی سے گھر خالی ہو گیا تھا۔ نعمان میں ہمت نہ تھی کہ سیما کو کسی طور تسلی دیتا۔ اس میں اپنے زخم کریدنے کی ہمت نہ تھی۔

سوئم کے بعد اس صدمے سے جھکے ہوئے سر کو نعمان نے اٹھایا تو خیال آیا کہ اس سانحے پر تسلی دینے والوں میں غزالہ۔ میمونہ بیگم اور شجاع کا نام سننے میں نہیں آیا تھا۔ آج محبت کے بند دروازے پر وہ کیل بھی گڑ گئی جس کے بعد وہ در کھلنا قیامت تک ناممکن ہو گیا۔ فیصلے سے پہلے کی سوچ بچار کا آخری لمحہ گزر گیا تھا۔

اگر اس نے خود انہیں اطلاع نہ بھجوائی ہوتی تو وہ سمجھتا کہ وہ لوگ اس حادثے سے بے خبر تھے۔ اس کو تو ان لمحوں میں بھی یقین تھا کہ غزالہ دکھ بٹانے ضرور آئے گی۔

مگر اسے معلوم نہ تھا کہ جب غزالہ بیگم کے ہاں اطلاع پہنچی ہے تو اطلاع وصول کرنے میمونہ بیگم آئی تھیں۔ اور غزالہ کو یہ اطلاع میمونہ بیگم نے دی تھی۔ ناشتے کے لئے وہ تینوں ایک کمرے میں

جمع تھیں۔ میمونہ بیگم نے بہت مسکرا کر کہا۔

لو ایک خوش خبری سنو۔ وہ بڑھیا تو چل بسی۔

غزالہ نے نگاہ اٹھا کر اپنی ماں کے کھچڑی بالوں اور جھریوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا مگر بات نہ سمجھ سکی۔

لو تمہیں تو ذرا سی خوشی بھی نہیں۔

کاہے کی خوشی؟

غزالہ نے شجاع کی پلیٹ میں توس کے ٹکڑے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

وہ سلطانہ بیگم تو سدھاریں اللہ کے پاس۔ اے ان حرکتوں پہ کتنے دن زندہ رہتیں۔

غزالہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

امی جان

اے کہاں کی امی جان کس کی امی جان۔

غزالہ نے میمونہ بیگم کی طرف بھی نہ دیکھا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ میمونہ بیگم ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کھڑی تھیں اور تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ نعمان اب ان کے قدموں پر گرا معافی مانگ رہا تھا۔ پھر اچانک انہیں خیال آیا کہ کہیں غزالہ نعمان کے گھر نہ چلی جائے۔ اس لئے وہ بھی فوراً غزالہ کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئیں۔

اور

اتنے بڑے کمرے میں شجاع اکیلی رہ گئی وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ گھر میں کیسے طوفان اٹھ رہے ہیں خود اس کی معصوم شخصیت کتنی متنازعہ تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر

گھر کے بدلتے ہوئے حالات نے اس کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ اس کے معصوم خیالات چھین لئے تھے۔ اس کا ننھا سا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

کہ

اس کے ابّو اور باجی کہاں ہیں؟ اس کی امی روتی کیوں ہیں۔۔۔ اور
اس کی نانی اماں اسے گود میں بٹھا کر بار بار اس کے ابّو کے بارے میں کیسی باتیں کرتی رہتی ہیں۔

شعاع کے لاشعور میں زہریلی کونپلیں سر اٹھا رہی تھیں اور وہ اپنی خوبصورت آنکھیں کھولے مسلسل دروازے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

سلطانہ بیگم کے انتقال کو دو مہینے سے زیادہ گزر چکے تھے مگر نعمان ابھی تک اس حادثے کو ذرا برابر بھی فراموش نہ کر سکا تھا۔ ماں کی موت اس کے لئے بہت بڑا حادثہ بن گئی تھی۔ باپ پہلے ہی سر پہ نہ تھا اور ماں کی وفات ایسے وقت میں ہوئی تھی جب وہ ہر طرف سے پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا۔ کہ وہ پچھلے کئی سالوں سے ماں پر پوری توجہ نہ دے سکا تھا۔ غزالہ سے شادی کے بعد وہ اپنے فرائض سے غافل ہو گیا تھا اور اب وہ خود کو ماں کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ دن رات کی اس خلش نے اسے بے حد کمزور بنا دیا تھا۔ سیما اور لبنیٰ سے نظریں چرائے پھرتا تھا۔ دفتر میں بھی وہ سر جھکائے بیٹھا زیادہ تر سوچتا رہتا۔ اس کو اس شہر سے اس کے مکینوں سے بیگانگی کی بو آتی تھی۔ ایک بار پھر نعمان اپنے غموں کے بوجھ سے دب کر سیما اور لبنیٰ کو فراموش کر بیٹھا۔

سیما اب تن من بھول کر لبنیٰ کی پرورش کر رہی تھی۔ اتنی کم عمری کے باوجود اس میں بڑی عورتوں کی سی سنجیدگی اور وقار تھا۔ تنہا بیٹھے بیٹھے اسے محسوس ہوتا کہ اس کے بال چاندی ہو چلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اگر جھک گئی ہے۔ لبنیٰ کو نہلاتے ہوئے کپڑے پہناتے ہوئے یا رات کو کہانی سناتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ لبنیٰ اس کی بیٹی ہے اس کے جگر کا ٹکڑا۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر وہ چٹان کی سی مضبوطی سے کھڑی تھی۔ وہ پرعزم اور غیور ماں کی غیور بیٹی تھی۔ اسے سیر و تفریح سے کبھی بھی دلچسپی نہ تھی مگر اب تو وہ بالکل ہی گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ پرانا نوکر بابا نور دین ہی لبنیٰ کو اسکول لے کر جاتا اور وہی اسے اسکول سے واپس لاتا تھا۔ وقت بہت ہی ٹھہر ٹھہر کر سسک سسک کر گزر رہا تھا اور اپنے نقش ثبت کرتا جا رہا تھا۔

کسی کے چہرے پر

کسی کے دل پر

سیما نے ایک دن دل کڑا کر کے اماں کے کمرے کی صفائی کی۔ اوپری صفائی تو روز ہی ہو جاتی تھی مگر آج تو اس نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے اماں کا بڑا بکس کھولا۔ سیما کے جہیز کے لئے بن کئے ہوئے ریشمی کپڑے جن کے لمس نے اسے موت کی ٹھنڈک کا سا احساس بخشا۔ وہ ایک ایک جوڑا نکال کر رکھتی رہی۔ بکس کی تہہ میں کئی لفافے رکھے تھے۔ سیما نے انہیں نکال لیا۔

نعمان کے بچپن کی تصویریں۔

شادی کی تصویریں۔

ابا اور اماں کی تصویریں سیما کے بچپن کی تصویریں۔

وہ ایک ایک تصویر نکالتی اور دیکھتی رہی۔ اس کے آس پاس تصویریں ہی تصویریں تھیں اور اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس میں ضبط کا مادہ غضب کا تھا۔ پھر بھی آنسوؤں کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اور آج اس نے آنسوؤں کو بغیر کسی مزاحمت کے بہنے کی اجازت دے دی تھی بہت دیر تک وہ اکیلی بیٹھی یادوں کے مزار پر روتی رہی۔ پھر اس نے سمیٹ کر ساری تصویریں لفافوں میں

ترتیب وار بند کیں اور انہیں بکس کی تہہ میں رکھا اور کپڑے اٹھا اٹھا کر رکھنے لگی۔ اچانک ایک جوڑے میں سے ایک وزنی لفافہ ٹپ سے اس کی گود میں آ گرا۔

سیما نے لفافہ اٹھا کر کھولا تو نوٹ ہی نوٹ نظر آئے۔ اس نے لفافہ ایک طرف رکھا سارے کپڑے رکھ کر اس نے بکس بند کیا اور دوسرے بکسوں کی صفائی کئے بغیر ہی لفافہ اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ لفافہ الماری میں رکھتے ہوئے بھی اس کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔ لبنیٰ اسکول سے آ گئی تھی اس نے لبنیٰ کے کپڑے بدلے کھانا دیا غرضیکہ ہر کام معمول کے مطابق ہوا۔ مگر وہ الجھی سی رہی۔ رات کھانے کے بعد حسب معمول اس نے لبنیٰ کو بہلا کر سلا دیا مگر خود نہ سوئی۔ اسے نعمان کا انتظار تھا۔ بھاری بھرکم لفافے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں خاصی بڑی رقم ہے۔ وہ اتنی بڑی رقم اپنے پاس کیسے رکھتی۔

رات گئے نعمان سر جھکائے گھر میں داخل ہوا تو سیما نے کھانا ٹرے میں لگایا اور اس کے سامنے میز پر لا رکھا۔ لیکن وہ خلاف معمول کھڑی رہی۔ چند لمحے بعد نعمان کو احساس ہوا کہ سیما کھڑی ہے۔

وہ بولا

"بیٹھ جاؤ سیما"

سیما بیٹھ گئی۔

نعمان نے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

سیما نے جواباً لفافہ اس کے آگے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"روپے ہیں"

"کہاں سے آئے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اماں کے بکس سے نکلے ہیں۔"

نعمان خاموشی سے اُٹھا، جاکر منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھانے لگا۔ لفافہ بدستور اس کے سامنے پڑا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد نعمان نے لفافہ اٹھاکر سیما کی طرف بڑھایا اور بولا۔

"اماں کے بکس میں سے نکلے ہیں تو مجھے بتانے کی ضرورت کیا تھی۔"

"یہ آپ لے لیں۔"

"یہ تمہاری چیز ہے سیما، مجھے معلوم ہے اماں نے یہ تمہاری شادی کے لئے جمع کئے ہوں گے۔ مقصد کے لئے ہیں اسی پر خرچ ہوں گے۔"

سیما نے بہت بڑا دل کرکے کہا۔

"بھائی جان، میں نے اپنی زندگی لبنیٰ کے لئے وقف کر دی ہے، یوں سمجھئے میں نے یہ رقم اس کو دے دی۔ وہ چھوٹی ہے اس لئے اس رقم پر آپ کا حق ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر تم اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں نعمان بھائی آپ میری بات نہ سمجھ سکے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ نوکری چھوڑ دیں اور اس روپے سے کوئی کام شروع کر لیں۔"

نعمان حیرت سے سیما کی طرف دیکھتا رہا۔ بہت دنوں سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں جاب نہ کرے۔ سیما کی بات سن کر اسے معلوم ہوا گویا غیب سے اس کو مدد ملی ہے پھر بھی جھجک کر

"سیما، اگر میں یہ پیسے لے لوں تو تم مجھے ظالم تو نہ سمجھو گی۔"

سیما کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ نعمان نے پھر کہا

"مگر ایک شرط بھی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی زندگیوں کو گھن لگا لیا ہے آؤ آج سے وعدہ کریں کہ پچھلے غم بھلا کر ایک دوسری کی خدمت کریں۔ مجھ سے تمہاری خاموشی برداشت نہیں ہوتی۔

یہ باتیں کیا کرو، کیا کرو گی نا؟"

"جی ہاں بھائی جان، کیا کروں گی۔"

سیما کھانے کی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس کے دل کو کیسا سکون مل گیا تھا۔ آج اس کے بھائی نے اکٹھے جینے کی آرزو کی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا۔ اپنے کمرے میں جاکر اس نے چھلکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے لبنیٰ کو پیار کیا اور پھر اسے ساتھ لٹا کر سو گئی۔

نعمان نے روپے اٹھا کر بکس میں رکھ لئے۔ کسی بھی کام کے لئے منصوبہ پہلے بنایا جاتا ہے۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ اور اس رات وہ بہت سے فیصلے کرتا اور انہیں مسترد کرتا رہا۔

آج پھر دفتر میں حنا آئی تھی۔ اس دن کے تلخ واقعے کے باوجود اس کے دل میں نعمان کے لئے ہمدردی تھی، مگر جھجک بھی تھی۔

وہ جب سامنے سے گزری تو نعمان نے اسے خود سلام کیا۔ حنا سر جھکائے اندر اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ نعمان کو آج اس کا انتظار تھا۔ بہت دیر تک انتظار کے باوجود وہ واپس نہ آئی تو نعمان نے ایک چٹ پر لکھا۔

"مس حنا، واپسی پر ذرا تکلیف کر کے مل کر جائیے گا۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔"

اور یہ چٹ اس نے چپراسی کے ہاتھ اندر بھجوا دی۔ حنا نے چٹ دیکھی اور چپراسی کے ساتھ ساتھ ہی باہر آ گئی۔ نعمان نے اٹھ کر استقبال کیا۔

"جی فرمائیے۔"

"تشریف رکھئے۔"

حنا بیٹھ گئی۔

نعمان نے چپراسی کو چائے لانے کا کہا اور پھر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مس حنا میں اپنے اس دن کے رویے پر بے حد شرمندہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں نعمان تم دکھی ہو اور دکھی آدمی سے خفا ہونا دانش مندی نہیں اور مجھے ویسے بھی ۔۔۔۔ اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"شکریہ۔"

"مگر میں پھر آپ کو مشورہ دوں گی کہ آپ خدارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مس حنا پلیز آپ اس بات کو بھول جائیے۔ میں ان کھنڈروں پر نئے محل تعمیر کروں گا۔ اس سلسلے میں آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔"

حنا کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ مگر بہت سمجھ دار لڑکی تھی۔ فوراً سہانے خواب دیکھنے کی نسبت وہ حقیقت کی گہرائی کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس لئے بولی۔

فرمائیے کیا بات ہے؟

نعمان نے اسے رات کا سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح سیما نے اسے روپے دے کر کام کرنے کو کہا ہے۔

حنا بولی۔

تو آپ نے کیا سوچا ہے؟

مس حنا مجھے مشورہ دیجئے۔ میں سوچتا ہوں اس شہر کو چھوڑ کر لاہور چلا جاؤں اور کاروبار کروں۔ اس صورت میں شاید ہم دونوں کی بہتری کی صورت بھی نکل آئے۔ دوسرا یہ ہے کہ روپیہ بنک میں جمع کرادوں اور نوکری بدستور کرتا رہوں۔ مگر اس صورت میں تو آپ میرے مالک کی بیٹی ہیں۔

حنا نے کہا۔

نعمان میں خود غرض لڑکی نہیں ہوں۔ میں آپ کو پسند کرتی ہوں اور میں نے آپ کو دل وجان سے چاہا۔ آپ مجھ سے ہمیشہ بے رخی اور سختی سے پیش آئے لیکن میں آپ کو کامیاب اور شاداب دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم شوق سے بزنس شروع کر دو۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو اس صورت میں تمہاری ملازمت محفوظ رہے گی۔ میں ضمانت دیتی ہوں۔"

"شکریہ مس حنا۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ اور تا زندگی آپ کی دوستی نہ بھول سکوں گا۔"

حنا کا چہرہ چمک اٹھا۔ مسکرا کر بولی۔

صرف دوستی؟

نعمان نے اس کا جواب نہ دیا اور وہ کہتا رہا۔

مس حنا، آپ میری ایک درخواست اور مان لیں۔

حنا نے کہا

ضرور ـــــ ضرور

نعمان نے کہا

"دوستی کی اچھی ابتدا کی آپ نے تو جہاں آپ کے والد صاحب چاہتے ہیں وہاں شادی کر لیں۔"

تمہیں خوشی ہوگی؟

بہت زیادہ۔

"مجھے دکھ دے کر؟"

مگر میں تو یہ سب تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

حنا نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر اپنا اچھا بھلا تو میں بھی جانتی ہوں۔

نعمان نے کہا۔

دراصل ٹاٹ میں مخمل کا پیوند نہیں لگوانا چاہتا۔

حنا نے کہا۔

خوب، پھر ابھی آپ اسے یہیں چھوڑ دیں۔

حنا اور نعمان نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو چھوا۔ نعمان نے دیکھا حنا کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں۔

حنا نے کہا

خدا حافظ۔

خدا حافظ

حنا چلی گئی۔ نعمان بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ آج اسے حنا پر بہت ترس آ رہا تھا کیسی پاگل لڑکی ہے یہ —

اس رات سیما، لبنیٰ اور نعمان نے مل کر کھانا کھایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ نعمان نے سیما کو حنا کے بارے میں چند ایک باتیں بتائیں، پھر اس دن کا واقعہ بھی سنا دیا۔

سیما نے کہا

بھائی جان آپ لاہور کیوں جانا چاہتے ہیں۔ کاروبار کے لئے یہی شہر زیادہ مناسب جگہ ہے۔

نہیں سیما میں صرف کاروبار کے لئے ہی نہیں جانا چاہتا۔ اس شہر نے میرا سب کچھ لوٹ لیا یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔

سیما کا دل تڑپ اٹھا، پھر بھی موضوع بدل کر بولی۔

"کیا وہ روپے کافی ہوں گے بھائی جان؟"

نعمان افسردہ سا ہو رہا تھا آہستہ سے بولا۔

"دس ہزار روپیہ تم نے دیا تھا، اتنا ہی دفتر کی طرف سے مل جائے گا، بہت کافی ہوگا ویسے میرا بنک میں بھی پیسہ ہے۔"

"اگر کم رہے تو اماں کے بکس میں زیور ہے وہ بیچ دیجئے گا۔"

نہیں اس کی ضرورت نہ ہوگی، یوں بھی زیور اماں کی نشانی ہے انہیں کبھی ضائع نہ کرنا۔

سیما نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

سیما نے کہا

مگر بھائی جان، ہم یہ شہر چھوڑ کر نہ جائیں گے۔ یہاں میری اماں ہے آپ یہیں کاروبار کریں گے۔

نعمان نے کہا

اب تم لوگ سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔

لبنیٰ سیما کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ آج نعمان نے لبنیٰ کو گود میں اٹھایا اور انہیں ان کے کمرے تک پہنچا آیا۔ نعمان اس رات بھی دیر تک جاگتا رہا۔ آج اسے شجاع کی یاد آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اسے بھلانے اور یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر یاد کرنے کو وہ تیار نہ تھا اور بھلا بھی نہ سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ملازمت چھوڑتے وقت اسے فرم سے بیس ہزار روپے ملے تھے دس ہزار روپے پس انداز کیے تھے۔ کچھ رقم اس کے پاس تھی۔ اس طرح کل اثاثہ پچاس ہزار کے قریب تھا اس کا ارادہ تھا کہ ایک بڑی دکان لے لے گا۔ مگر شہر کی دکانوں کی پگڑیاں اتنی تھیں کہ ساری رقم اس پگڑی کی نذر ہو جاتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایڈوانس دے کر ایک نئی سوسائٹی کے کمرشل ایریا میں ایک دکان حاصل کر لی۔ اور وہاں اس نے گندم، آٹا اور چینی اس نرخ پر بیچنا شروع کر دی جس نرخ پر مل سے یا منڈی سے ملتی تھی۔ ایک ہی مہینے بس ہر طرف دکان کا چرچا ہو گیا ہر وقت گاہکوں کا تانتا لگا رہتا۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہے یا بیوقوف یا کوئی نودولتیا —— یا شہرت کا بھوکا۔

مگر نہ وہ پاگل تھا اور نہ ہی بیوقوف۔ سستے ہونے کی بنا پر اس کے ہاں ایک سو بوری گندم، آٹا اور چینی کی فروخت تھی۔

اگلے روز وہ سو خالی بوریوں کو ڈیڑھ روپے بوری کے حساب سے ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیتا اس طرح ایک مہینے بعد ہی اس کی آمدنی ڈیڑھ سو روپے روزانہ یا پانچ ہزار کے قریب ماہانہ ہو گئی تھی۔ گھر کا اور دکان کا خرچہ ملا کر سات آٹھ سو خرچ ہو جاتے اور چار ہزار کے قریب بچنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب اس نے حساب لگایا تو اپنے پچاس ہزار کے علاوہ اب اس کے پاس ساٹھ ہزار کی رقم اور تھی۔

اس کاروبار نے اسے اس قدر مصروف کر دیا تھا کہ اب اسے پریشان رہنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا، تاہم اس کے دل میں ایک خلش تھی، ایک کسک تھی جو اسے ہر اس وقت پریشان رکھتی تھی جب وہ دن بھر کے کام کے بعد بستر پر جاتا۔

اس خلش، اس کسک کا نام تھا۔

غزالہ

غزالہ جو کبھی اس کی زندگی تھی۔ جس نے ساتھ مرنے ساتھ جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ مگر اب اس غزالہ نے نعمان کی زندگی میں اتنے دکھ بھر دیئے تھے، اتنے روگ دیئے تھے کہ اس کی روح تک زخمی ہو گئی تھی۔

نعمان کے ذہن میں جب کبھی وہ آتی تو وہ اسے پوری شدت کے ساتھ جھٹک دینے کی سعی کرتا۔ اس سعی میں کبھی کامیاب ہوتا اور کبھی یہ کوشش سعی رائیگاں ثابت ہوتی۔

ڈیڑھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چلا تھا اور غزالہ نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہ لی تھی آخر بہت سوچ سوچ کر نعمان نے اپنے دل پر جبر کر کے اپنی خواہشوں کے خلاف ایک فیصلہ کر ہی لیا اگلے دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے غزالہ کے نام طلاق نامہ لکھا۔

غزالہ صاحبہ!

ڈیڑھ سال ہوگیا جب تم نے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے تم نے مجھ سے میری شعاع کو چھین لیا تھا۔ میری پیاری امی کی وفات پر تم دو لفظ کہنے نہ آسکیں۔ اور اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں تمہیں اپنی کسی زیادتی پر ندامت کا احساس نہیں ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب زندگی میں تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔ لہٰذا میں اب خود پر جبر کرکے حالات سے مجبور ہو کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔ حالانکہ تم تو اسے پینے کے لئے ڈیڑھ سال پہلے بے تاب تھیں۔ چلو آج تمہاری ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ مہر کے اکیس ہزار روپے کا پے آرڈر اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ لبنیٰ میرے پاس ہے اور شعاع تمہارے پاس۔ زندگی میں تم جب چاہو شعاع کو میرے پاس چھوڑ سکتی ہو۔

نعمان۔

نعمان نے خط دوسری بار پڑھا۔ اس کے دل سے ایک آہ سی نکلی اور ملازم خط رجسٹری کروا آیا۔

پوسٹ مین جب رجسٹری لایا تو غزالہ اندر کمرے میں تھی۔ میمونہ بیگم نے دستخط کرکے رجسٹری وصول کرلی ـــ خط کھولا اور پے آرڈر نکال کر اپنے پاس رکھ لیا اور خط پڑھنے کے بعد غزالہ کو آواز دی۔

"آ گیا تمہارا خط۔"

غزالہ بھاگی ہوئی آئی۔

"امی، کیا نعمان کا خط آیا ہے؟"

میمونہ بیگم نے کہا۔

"ہاں ہے تو نعمان کا ہی۔"

"کیا وہ آرہے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیا مجھے بلایا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو امی کیا لکھا ہے؟"

"بس یوں سمجھ لو، تمہارے لئے ایک بڑی خوشخبری ہے۔"

غزالہ بے تاب ہوگئی۔

"امی کیا ہے وہ خوش خبری؟" غزالہ کے چہرے پر سرخی آ چلی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نعمان نے کیا لکھا ہے۔ اس نے خط لے کر جلدی سے پڑھنا شروع کیا اور خط اس کے ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔

میمونہ بیگم نے کہا

"اے بیٹی، تم خوش نہیں ہوئیں کیا؟"

غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

میمونہ بیگم نے پھر کہا۔

"اے بیٹی اٹھ کر مٹھائی منگوا کر تقسیم کرو۔ اس مردوئے سے جان چھٹی۔"

غزالہ نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ اس پر تو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

میمونہ بیگم نے بھی محسوس کر لیا کہ ابھی خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ زخم پر آیا ہوا کھرنڈ اُتر گیا ہے زخم تازہ ہوگیا ہے تاہم میمونہ بیگم خوش تھی کہ اس نے انتقام لے لیا ہے اور اکیس ہزار کی رقم کا چیک تصور ہی تصور میں اکیس ہزار کے نوٹ اس کے سامنے میز پر دھرے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ بیگم نے پوری جان سے شجاع کو جھنجوڑ ڈالا۔ تو غزالہ برداشت نہ کر سکی اور زور سے چیخی۔

امی۔

کیا امی امی لگا رکھی ہے، اپنی لاڈلی کو تو دیکھو۔

"بچی ہے ذرا سی چائے گر بھی گئی تو کیا ہوا"

"ارے میرے اللہ یہ ذرا سی ہے"

میمونہ بیگم نے اپنی قمیص کا دامن سامنے کر دیا۔ جو چائے کے دھبوں سے براؤن ہو رہا تھا۔

غزالہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

امی اس نے جان بوجھ کر تو نہیں گرائی۔

"میں کب کہہ رہی ہوں مگر تمیز سکھانا کوئی بُری بات تو نہیں"

تمیز سکھانا اور بات ہے مگر آپ نے اسے اس بری طرح جھنجوڑا ہے کہ سہمی جا رہی ہے۔

"اے ہے بی تم تو بات کا بتنگڑ بنائے دے رہی ہو"

غزالہ نے شجاع کو سینے سے لگا رکھا تھا میمونہ بیگم نے اسے اتنی بے دردی سے جھنجوڑا تھا کہ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ لاڈلی بیٹی کا یہ حال دیکھ کر غزالہ کو خواہ مخواہ غصہ آئے جا رہا تھا اور بات بڑھتی جا رہی تھی میمونہ بیگم کی بات سن کر بولی۔

"بتنگڑ بنانے کی مجھے عادت نہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا سلوک شجاع سے بہت بُرا ہے"

میمونہ بیگم نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

اوئی نوج جو میں تم سے یا تمہاری بیٹی سے کوئی بات کروں۔ تم تو کھانے کو دوڑتی ہو۔ ایک وہ نعمان تھا مردوا"

غزالہ غصے سے سُرخ ہو کر بولی۔

امی جان، آپ حد سے بڑھتی جا رہی ہیں میں آپ سے آخری بار کہے دیتی ہوں کہ آپ نعمان کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کریں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

اے لو، طلاق دینے کے بعد بھی اس کو دل میں بسائے پھر رہی ہیں۔

غزالہ بیگم نے کہا۔

امی میں بات بڑھانا نہیں چاہتی مگر میرا گھر برباد کرنے والی بھی آپ ہیں۔

میمونہ بیگم نے کہا

"تو کیا، میں نے زبردستی کی تھی تم تو خود اس سے بیزار تھیں اور میں نے کوشش کر کے خود کو بُرا بنا کر اس سے تمہارا چھٹکارہ کرایا تو مجھے ہی الزام دینے لگی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ نیکی برباد در۔۔"

غزالہ نے کہا۔

"آج میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ آپ نے میرا گھر برباد کیا ہے۔ امی، ذرا یہ تو بتائیے کہ امی جان کے مرنے پر جانے سے کس نے روکا، نعمان کو دھمکی والے خط کس نے لکھوائے، میں بھی کیسی بیوقوف اور ناعاقبت اندیش تھی، شوہر سے میں چھٹی بچی مجھ سے دور ہوئی۔

ساس، نند کی نظر میں میں گنہگار، میں نے آپ کی باتوں میں آکر عاقبت خراب کر لی۔

میمونہ بیگم پہلے تو غزالہ کے تیور دیکھ کر ذرا سٹپٹائیں مگر جلد ہی بولیں۔

میں نے تمہارا گھر برباد کیا، تو تم نے میری بات مانی ہی کیوں۔ میں تمہیں منع تھوڑی کرتی ہوں تم اب گھر بسالو اپنا۔

غزالہ نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"امی آپ کیا کہہ رہی ہیں —— جایئے آپ بھی یہاں سے چلی جایئے۔ میں یہاں اکیلی رہ لوں گی۔"

میمونہ بیگم ہاتھ نچا کر بولیں۔

"کھڑے کھڑے نکال دوں گی یہاں سے کسی بھروسے پر نہ رہنا مکان کے کاغذات میرے قبضے میں ہیں۔"

غزالہ نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

غزالہ بیگم تو چلی گئیں مگر میمونہ بیگم کے دل کا غبار ابھی ہلکا نہیں ہوا تھا۔ اس نے شعاع کی طرف گھور کر دیکھا وہ غریب اور بھی سہم گئی۔ اسے اپنے ابو بہت یاد آتے تھے مگر جونہی وہ ابو کہتی میمونہ بیگم نعمان کو گالیاں اور کوسنے دینے شروع کر دیتی تھی۔ اس لئے شعاع اب بھولے سے بھی ابو کو یاد نہ کرتی تھی اور میمونہ بیگم سے تو وہ بہت ہی ڈرتی تھی۔ ان وقت اس کے گھور کر دیکھنے سے وہ سہم رہی تھی مگر ذرا دیر بعد ہی میمونہ بیگم نے اسے گود میں لے لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔

"بیٹی تمہارے ابو بہت خراب آدمی ہیں تمہاری امی کو مارتے تھے اور تمہاری بہن کو چھین کر لے گئے ہیں اور اس بے چاری کو روز مارتے ہیں تم ان کے پاس نہ جانا، وہ بہت خراب آدمی ہیں تمہیں بھی ماریں گے —— نہیں جاؤ گی نا؟"

شعاع نے ڈر کر گردن ہلا دی۔

"نہیں جاؤں گی۔"

"امی بھی کہیں تو مت جانا نہیں تو گلا کاٹ ڈالیں گے۔"

"وہ بڑے خراب آدمی ہیں۔"

"اچھا نانی اماں۔"

شعاع کی آواز کانپ رہی تھی اور وہ گھٹی گھٹی سی سسکیاں لے رہی تھی۔ نوکر پکار رہا تھا اس لئے میمونہ بیگم باہر لپکیں اور شعاع اسی طرح کرسی پکڑ کر کھڑی تھی۔ اگر نعمان اس کا سفید چہرہ دیکھ لیتا تو غصے سے پاگل ہو جاتا۔ اور ویسے میں نہ جانے کیا کر گزرتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام گزری، رات آئی مگر غزالہ دنیا کی ہر بات سے بے نیاز اپنے غموں میں کھوئی بیٹھی رہا
اور رات تو اس کے لئے قیامت کی رات تھی۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی اس سے
بھی زیادہ تکلیف دہ رات آئی ہو۔ وقت کا ہر لمحہ اس کے سامنے ایک پہاڑ کی مانند کھڑا تھا۔ نہ دل
کو قرار تھا اور نہ دماغ کو سکون تھا ذہن، دل و دماغ سب اپنے غم پر نوحہ کناں تھے۔ گزرے دن
کا ہر لمحہ اپنے دامن میں بے شمار یادیں سمیٹے ہوئے تھا۔ ان یادوں پر اس کا کوئی بس نہیں
کوئی اختیار نہیں تھا وہ تو ایک سیلِ بے پناہ کی مانند اُمڈی چلی آرہی تھیں۔
شادی کے دن سے لے کر ڈیڑھ سال قبل تک کے واقعات اس کی نظروں میں سینما کی
تصویروں کی مانند گھوم رہے تھے۔
چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹے چھوٹے قصے۔
چاہت کے انداز،

نعمان کی نگاہوں کا والہانہ پن
اس کے رُوٹھ جانے کے اور نعمان کے منا لینے کے انداز۔
یہ سب کچھ وہ کیسے بُھلا سکتی تھی۔؟ جب انسان کا دل و دماغ اپنے بس میں نہ ہو تو سوچوں
پر کیسے پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں۔؟
ماضی کی یادوں سے چند لمحوں کے لئے فرصت ملی تو مستقبل کا خوف لرزتے سایوں کی مانند
اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔
اُس نے سوچا
اب میرے جینے کا انداز کیا ہوگا۔؟
پھر وہ بڑبڑائی
نعمان! اگر میں ناعاقبت اندیش تھی تو تم تو سمجھ داری سے کام لیتے۔
پھر اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
آج صبح تک مجھے ایک آس تھی، ایک اُمید تھی۔ تمہارے لوٹ آنے کی۔
تمہارا انتظار تھا
مگر اب
نہ تمہارے آنے کی کوئی آس ہے اور نہ اُمید
ہر آس
ہر امید دم توڑ چکی ہے۔
اس کی نگاہیں سرہانے رکھے طلاق نامے پر پڑیں تو اس کے سینے میں درد کی ایک شدید
لہر اُٹھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ

اب تم ایک طلاق یافتہ عورت ہو۔

تم طلاق شدہ ہو۔

طلاق کا ٹیکہ تمہاری پیشانی پر لگ چکا ہے۔

اب تمہیں یہ داغ سہنا پڑے گا۔

یہ ٹیکہ اب مٹائے نہ مٹے گا۔

کاغذ کا وہ ایک ٹکڑا محض ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی نہیں ہے اس کی بگڑی ہوئی تقدیر کا آئینہ ہے صاف اور شفاف آئینہ۔ مگر اس تقدیر کو بگاڑنے کا ذمہ دار کون ہے؟

نعمان۔ یا وہ خود ــــــ؟

مجرم تو وہ خود تھی۔ اسی نے تو ماں کے کہنے میں آکر نعمان کی نیک فطرت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

پھر

اب اس روٹھی ہوئی قسمت پر یہ ماتم کیا تھا ــــــ؟

اسے احساس ہوا،

کہ اب اس کے اور نعمان کے درمیان ایک دیوار حائل ہو چکی ہے۔

ایک آہنی دیوار

اس دیوار کو اب نہ وہ خود گرا سکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا۔

اب جو یہ خلیج اس کے اور نعمان کے درمیان حائل ہو چکی ہے اسے کوئی نہ پاٹ سکتا تھا

ایک چھوٹے سے لفظ نے اس کی اور نعمان کی زندگی کی راہوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا تھا

لفظ طلاق

کہنے کو کتنا چھوٹا سا لفظ ہے۔

مگر اب زندگی بھر اس کی پیشانی پر یہ لفظ سیاہ داغ کی طرح چمکتا رہے گا۔

اپنے اور نعمان کے متعلق سوچتے ہوئے اسے ماں کا خیال آیا کیا اس تمام حادثے کی زیادہ تر ذمہ داری ماں پر عائد نہیں ہوتی؟

یہ سچ ہے کہ قصور میرا بھی ہے۔

میں کوئی ناسمجھ بچی تو نہ تھی مجھے تو اپنا اچھا برا سوچنا چاہیئے تھا۔

میں نے کیوں ماں کی باتوں پر عمل کیا؟

اگر میں ماں کے کہنے میں نہ آتی تو نعمان مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوتا۔

نہ میں نعمان کو ناراض کرتی۔

اور نہ ہی آج کاغذ کا یہ ٹکڑا میری تقدیر کا آئینہ بن کر میرا منہ چڑاتا۔

مگر ــ اب جب یہ سب کچھ ہو ہی چکا ہے تو میں ان باتوں کے متعلق کیوں سوچ رہی ہوں۔؟

میری سوچیں اور میرے تصورات گزرے ہوئے دنوں کو واپس نہیں لا سکتے

ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان سوچوں سے یادوں کے نقوش اور گہرے ہو جائیں۔

اب تو میرے لئے زندگی بھر کی پریشانیاں ہیں، فکریں ہیں رسوائیاں ہیں۔

سوچوں کے دھارے میں بہتے ہوئے۔ اُسے ننھی شعاع کا خیال آیا تو وہ یکدم چونک پڑی

میری زندگی تو شاید یادوں کے سہارے گزر جائے مگر شعاع

اس کا کیا ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور

اب میرے جینے کا انداز کیا ہوگا۔؟

اب زندگی میرے لئے سچ مچ زندگی نہیں رہی۔ اب تو یہ کانٹوں کی سیج بن گئی ہے۔

پوری رات غزالہ نے انہی پریشانیوں اور فکروں میں گزار دی۔ اذان کے وقت اس کی بمشکل آنکھ لگی۔

دوسری طرف میمونہ بیگم کو بھی نیند نہیں آئی انہوں نے بھی تقریباً آدھی رات سوچتے ہوئے گزار دی مگر اس کی سوچوں کا انداز مختلف تھا۔ ان کی نیند غائب ہونے میں غم اور صدمے کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ ان کی نیند بے پناہ خوشی کے باعث اُچاٹ ہوئی تھی۔

صبح قدرت دیر سے ان کی آنکھ کھلی تو انہیں گزشتہ روز کے واقعات کا خیال آیا فوراً بستر سے فارغ ہو کر وہ غزالہ کے کمرے کی طرف گئیں اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گئیں اسے سوتا دیکھ کر ان کے دل کو اطمینان ہوا وہ اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

غزالہ ابھی جوان ہے اور امیر بھی۔ اگر کسی بڈھے امیر کو پھانس کر غزالہ کی شادی اس سے کر دی جائے تو اور دولت ہاتھ آئے گی اگر وہ بڈھا کچھ بیمار بھی ہو تو کیا کہنے۔ وہ جتنی جلدی یہ دوسرا کانٹا بھی درمیان سے ہٹے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ پھر میرے پاس دولت ہو گی، کوٹھیاں ہوں گی کاریں ہوں گی لیکن سوال غزالہ کو رضامند کرنے کا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر ابھی تو نعمان کی محبت کا بھوت سوار ہے۔ یہ بھوت اترنے میں ظاہر ہے کچھ عرصہ لگے گا۔ ابھی نعمان کی یادوں کے زخم تازہ ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ زخم مندمل ہو جائے گا تو غزالہ سے اس موضوع پر بات کروں گی۔

ابھی تو اسے خاموش ہی رہنے دینا چاہئے۔ ابھی اُسے چھیڑنا مناسب نہیں۔

غزالہ بیاہ کر اس گھر سے چلی جائے گی تو پھر یہ کوٹھی اور یہ ساری دولت میرے قبضے میں ہوگی۔

ابھی کچھ دنوں تک تو مجھے غزالہ کی دلجوئی کرنی چاہئیے۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی ظاہر کرنا چاہیئے کہ میں اس کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔

میمونہ بیگم اپنی اسکیم پر دل ہی دل میں غور کرتے ہوئے مطمئن ہو گئیں۔

اذان کے وقت غزالہ کی آنکھ لگی تو وہ کافی دیر تک سوئی رہی۔ سوتے وقت بھی وہ نعمان اور شجاع کو ہی خواب میں دیکھتی رہی۔ آنکھ کھلی تو پریشان خیالات نے اسے گھیر لیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی گزشتہ روز کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس روز کے بارے میں جو اس کے مستقبل پر سیاہی کی ایک لکیر کھینچ کر گزر گیا تھا۔

میمونہ بیگم نے کچھ دیر بعد پھر غزالہ کے کمرے میں جھانکا اور اداس صورت بنا کر اندر داخل ہو گئیں۔ غزالہ نے ایک نگاہِ غلط ان پر ڈالی اور دوبارہ اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔ میمونہ بیگم نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

اُٹھو بیٹی! آج تو تم بڑی دیر تک سوئیں۔

غزالہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

اب اُٹھ جاؤ۔

میمونہ بیگم نے دوبارہ اپنی شفقت کا مظاہرہ کیا۔

غزالہ پھر بھی خاموش رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ بیگم نے پوچھا

کیا رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی؟

نہیں

مجھے بتاتیں میں سر میں تیل کی مالش کر دیتی۔

تیل کی مالش سے کیا فرق پڑ جاتا؟

سر میں خشکی کے سبب بعض اوقات نیند نہیں آتی۔

بیٹی! تیل کی مالش سے خشکی دور ہو جاتی۔

ان سب باتوں میں کچھ نہیں رکھا امی۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔

میمونہ بیگم اداسی سے سر جھکا کر اس کے سرہانے بیٹھ گئیں اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی بات کرنے کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتی رہیں۔

پھر دبی ہوئی آواز میں بولیں۔

بیٹی! جو ہونا تھا ہو چکا اب تم یوں سوچ سوچ کر اپنی جان تو ہلکان مت کرو۔

غزالہ کو میمونہ بیگم کی اس بات پر سخت غصہ آیا مگر اس وقت میمونہ بیگم سے بات کرنے کو اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

پریشان رہنے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

پھر کیا کروں؟ غزالہ بیگم نے کہا

اے بیٹی! اپنے آپ کو کاموں میں مصروف رکھو تو اپنے آپ بیکار کی سوچوں سے نجات پا جاؤ

امی! یہ بیکار کی سوچیں نہیں ہیں۔ میرے سامنے میری ساری زندگی کا سوال ہے اور آپ میرا پریشان سوچوں کو بیکار کہہ کر ٹال رہی ہیں۔

غزالہ کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

بیٹی! مجھے تو تمہاری صحت کا خیال آتا ہے۔

غزالہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پریشان رہنے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔

یک دم غزالہ بیگم کا خیال شجاع کی طرف گیا۔

شجاع کہاں ہے

میرے کمرے میں کھیل رہی ہے۔

غزالہ نے ایک طویل سانس لے کر تھوڑی گھٹنے پر ٹکا دی اور سوچوں میں گم ہو گئی۔

اُٹھو بیٹی۔! منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔

مجھے بھوک نہیں ہے

تم نے تو کل رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس وقت تو کچھ کھا لو۔

میرا دل نہیں چاہتا۔

دل چاہے یا نہ چاہے مگر تمہیں یوں بھوکا رہ کر اپنی جان پر مصیبت نہیں ڈالنی چاہیئے۔

غزالہ نے کہا۔

جو مصیبت جان پہ گزری تھی وہ تو گزر گئی۔

غم اور خوشی تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں بیٹی!

غزالہ چپ چاپ بیٹھی فرش کو گھورتی رہی۔ اُٹھو منہ دھو لو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ پھر بھی نہ اٹھی تو میمونہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی

امی! خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔

تمہیں میری قسم ہے بیٹی! ضد نہ کرو۔

میں سچ کہتی ہوں میرا دل کسی بات کے لئے کسی کام کے لئے نہیں چاہتا۔

کام کے لئے کون کہتا ہے نہیں تم تھوڑا سا کھا لو میمونہ بیگم نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

غزالہ میمونہ بیگم سے بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی ان کے خوشامدانہ انداز سے تنگ آکر وہ بڑی بے دلی سے بستر سے نیچے اتری اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے بادلِ نخواستہ ایک سلائس اور ایک پیالی چائے زہر مار کی۔ میمونہ بیگم ایک کے بعد دوسری پلیٹ اٹھا کر اس کی خوشامد کرتی رہیں مگر اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شجاع کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

شجاع نے اس وقت اپنی نانی کو قریب نہ پا کر بے حد سہمے ہوئے انداز میں غزالہ سے پوچھا۔

امی! ابو کب آئیں گے؟

شجاع کی بات غزالہ کے دل میں تیر کی طرح لگی۔

اس کا اداس اور سہما ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شجاع نے جب دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو غزالہ ضبط نہ کر سکی۔ اس نے بے بس نگاہوں سے شجاع کی طرف دیکھا اور اس کے بالوں میں منہ چھپا کر رو پڑی ننھی شجاع حیران اور پریشان ہو کر ایک دم چیخ اٹھی۔

امی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟

مگر اس کی امی اس کی بات کا کیا جواب دیتی؟ وہ بھلا اپنی لغزشوں کی داستان اسے کیسے سنا سکتی تھی؟ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کے ابو کو وہ اپنی حماقتوں کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے کھو چکی ہے۔

اس کے ابو اب ان دونوں سے زندگی بھر کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔

کچھ دیر آنسو بہانے سے اس کے دل کا غبار قدرے کم ہوا تو اس کی الجھی ہوئی سوچوں نے اسے پھر آگھیرا۔ وہی ماضی کے قصے تھے اور مستقبل کے اندیشے۔ اپنی غلطیوں پر ندامت کا احساس شدید سے شدید تر ہو رہا تھا۔ مستقل سوچتے رہنے سے اسے اپنے دماغ کی نس پھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ مگر وہ ان سوچوں سے کیسے خود کو دور رکھے۔ سانس میں جو پھانس چبھی تھی اسے کیسے نکالے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔ غزالہ نے اپنی زندگی کو وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ میمونہ بیگم نے بھی ان دنوں اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا اس کی دلجوئی کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن دوسری طرف وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتی تھیں۔

غزالہ کی زندگی میں یہ جو اندوہناک حادثہ ہوا تھا اس کو بمشکل تمام ایک ماہ گزرا تھا کہ ایک روز میمونہ بیگم نے بڑے پیار بھرے لہجے میں اس سے آئندہ زندگی کے بارے میں پوچھا۔

غزالہ نے ان کی بات کو ٹال دیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوسرے روز میمونہ بیگم نے دوپہر کے کھانے میں بڑا اہتمام کیا۔ غزالہ کی پسند کے کئی کھانے تیار کئے۔ اپنی جان کی قسمیں دے کر اسے کھانے پر مجبور کیا۔ غزالہ نے ان کے اس قدر اصرار کے سامنے شکست تسلیم کر لی۔ اس روز اس کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ساتھ ہر جذبے اور ہر احساس کی شدت میں کمی واقع

ہو جاتی ہے۔ نعمان سے علیحدگی نے اسے جو غم دیا تھا اس کا احساس اگرچہ اب بھی بہت شدید تھا لیکن اب اس نے اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ رہنا بھی سیکھ لیا تھا۔

میمونہ بیگم نے اس کا موڈ بہتر دیکھ کر اسے چند ادھر اُدھر کے قصے سنائے۔ پھر اصل مطلب کی طرف آ گئیں۔

غزالہ بیٹی! پھر تم نے کیا سوچا؟

غزالہ نے پوچھا

کس بات کے بارے میں؟

ارے یہی اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں۔

سوچنا کیا ہے امی؟ جیسے تیسے گزر ہی جائے گی۔

اُوئی بیٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں

میمونہ بیگم نے کہا

یہ سب پاگل پن کی باتیں ہیں۔

اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟

اور نہیں تو کیا ہے کہیں یوں بھی زندگی گزرتی ہے؟

غزالہ نے اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

اگر عمر کچھ زیادہ ہو جائے تو پھر بھی غنیمت ہے مگر تم سی جوان جہان لڑکی کی زندگی یوں کس طرح گزرے گی۔

چھوڑیئے امی اس ذکر کو مجھے وحشت ہوتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ ذکر میں نے چھوڑنے کے لئے نہیں نکالا۔ میمونہ بیگم نے بڑی سنجیدگی سے کہا

غزالہ نے بڑی عجیب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

اب چاہے تم کچھ بھی کہو بیٹی! میرا تو دل دُکھتا ہے تمہاری زندگی کو یوں تنہا دیکھ کر۔

غزالہ نے کہا

آپ سوچتی ہی کیوں ہیں میرے بارے میں؟

میمونہ بیگم نے کہا

اے لو۔ اور سنو: میں تمہارے بارے میں نہیں سوچوں گی تو کیا کوئی راہ چلتا سوچے گا۔؟

مگر ضرورت ہی کیا ہے میرے بارے میں سوچنے کی؟

کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی؟ آخر میں تمہاری ماں ہوں مجھ سے زیادہ تمہارا خیال اور کسی کے دل میں ہوگا؟

غزالہ نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا۔

ہاں! آپ میری ماں ہیں ماں یا دشمن آپ نے تو میری زندگی برباد کرنے میں بھرپور حصّہ لیا ہے۔

مگر وہ یہ بات صرف سوچ کر ہی رہ گئی زبان سے کچھ نہیں کہا۔

میں تو ایک بات جانتی ہوں غزالہ!

غزالہ نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

زندگی میں جذباتی بن کر فیصلے کرنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

صاف صاف کہلوانا چاہتی ہو تو سن لو کہ میں اب تمہاری دوسری شادی کرنا چاہتی ہوں۔

میں تمہیں آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔

امّی ——! غزالہ ایک دم چیخی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

ہاں بیٹی! یہ دنیا بہت بری جگہ ہے، تم جوان ہو خوبصورت ہو بغیر کسی مرد کے سہارے کے تمہاری زندگی کیسے گزرے گی؟

خدا کے لئے امّی! مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کیجئے ورنہ میں یہاں ایک پل نہ رہوں گی۔

پھر وہی بیوقوفی کی بات۔

میمونہ بیگم نے پیار بھرے غصّے سے کہا

غزالہ چڑ گئی

اس میں بیوقوفی کی کونسی بات ہے؟

یہ بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ زمانے کی اُونچ نیچ کو سمجھتی نہیں ہو بے کار کی ضد کئے جا رہی ہو۔

آپ کچھ بھی کہیں امّی! میں آپ کا یہ مشورہ زندگی بھر قبول نہیں کر سکتی۔

آخر کیوں۔؟ میں کوئی تمہاری دشمن بن کر تو یہ مشورہ نہیں دے رہی ہوں۔

یہاں دوست اور دشمن کا سوال نہیں۔

غزالہ نے کہا

پھر کیا بات ہے؟

بس میرا دل اور دماغ ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہتا۔

میمونہ بیگم نے کہا

بیٹی! انسان کو اپنے دل دماغ پر اختیار ہونا چاہیئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ نے کہا

اگر مجھے اپنے دل و دماغ پر اختیار ہوتا تو آج یہ صورت نہ ہوتی، آج میرے ارد گرد مایوسیاں، ویرانیاں نہ ہوتیں۔ اگر میں نے اپنے دل اور دماغ سے مشورہ کیا ہوتا تو آج میرے ماتھے پر یہ طلاق کا ٹیکہ نہ لگا ہوتا۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

اب تم اس بات کو بھول جاؤ، نعمان تمہارے قابل نہ تھا، اسے تم سے محبت ہی نہ تھی اگر محبت ہوتی تو کبھی اس گھر کو چھوڑ کر نہ جاتا۔

غزالہ نے بات کاٹ کر کہا

امی! بس دھکے دینے کی کسر باقی رہ گئی تھی ورنہ آپ نے یا میں نے اور کوئی کسر تو نہیں چھوڑی

میمونہ بیگم نے کہا

خیر۔ خیر تم اس قصے کو جانے دو، اب تو میں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہی ہوں کہ تم شادی کر لو کیونکہ بغیر شادی کے رہو گی تو ہر کسی کی نظریں تم پر اٹھیں گی؟ اور لوگ تمہیں حلوہ سمجھ کر کھانے کی کوشش کریں گے۔ تم کتنی بھی پارسائی سے زندگی گزارو مگر لوگ رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ دو چار سال کی بات ہو تو انسان کاٹ لے مگر اتنی پہاڑ سی زندگی مرد بغیر کیسے کٹے گی؟ اور پھر تمہارا ہی نہیں اس بچی کا بھی تو سوال ہے۔

میمونہ بیگم نے تھوڑی دیر چپ رہ کر غزالہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی باتوں کا نشانہ ٹھیک بیٹھ رہا ہے یا نہیں۔ جب وہ غزالہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے چکیں جب اس نے دیکھ لیا کہ لوہا تپ چلا ہے!۔ اس پر چوٹ پڑی تو جس طرف چاہا موڑا جا سکتا ہے تو میمونہ بیگم نے آنکھوں میں مگرمچھ کے آنسو بھر کر کہا۔

بیٹی! میرا کیا ہے، میں بوڑھی اور کمزور عورت ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن، بس تم ہاں کر دو، میں نے تمہارے لئے ایک رشتہ دیکھ لیا ہے عمر ذرا بڑی ہے لیکن سونے میں پیلی کر دی جاؤ گی۔ لائلپور میں کپڑے کی مل ہے۔ لاہور میں ایک سینما ہے۔ کراچی میں کوٹھیاں، بنگلے اور ریس کے گھوڑے ہیں۔ بس ساری عمر عیش کرو گی۔

غزالہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا، اور نہ ہی اس نے سنا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہی ہے۔ بلکہ وہ تو نعمان اور لبنیٰ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پتہ نہیں کس حال میں ہوگا نعمان۔

میمونہ نے دیکھا کہ غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے کہا

اچھا بیٹی! آج شام میں اسے چائے پر بلا رہی ہوں۔

غزالہ نے چونک کر پوچھا

امی! کسے چائے پر بلا رہی ہو۔؟

میمونہ بیگم نے کہا۔

ارے تمہارے دولہا کو، اور کسے

غزالہ سمجھی کہ ماں نعمان کو بلا رہی ہے۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گئی کہ شاید دوبارہ ملاپ کی کوئی صورت امی نے سوچ لی ہے۔

غزالہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

کیا امی! تم واقعی انہیں بلا رہی ہو؟

ہاں ہاں کیوں نہیں

کیا آج ہی !

ہاں آج ہی بلا رہی ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ نے خوش ہو کر کہا

امی تم کتنی اچھی ہو۔

میمونہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اچھا اچھا اب تم تھوڑا سا آرام کر لو، اور شام کو ڈھنگ کے کپڑے پہن کر تیار ہو رہنا ذرا اچھا سا میک اپ بھی کر لینا۔ شجاع کو ساتھ نہ رکھنا۔

کیوں امی؟

تم ابھی بچی ہو، ان باتوں کو کیا جانو۔

غزالہ نے سمجھ لیا کہ ماں شجاع کو نعمان کی نظروں سے اُوجھل رکھنا چاہتی ہے تاکہ نعمان اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے بے تاب رہے اور اگر ان کے دل میں میرے لئے ناراضگی ہوگی بھی تو بیٹی کی خاطر انہیں بھول جائے۔

غزالہ دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ چلو ماں ایک کام تو سمجھ داری کا کر رہی ہے۔

نعمان اب پوری طرح کاروبار کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے شہر میں تین برانچیں کھول لی تھیں۔ اب اس کی آمدنی پانچ ہزار ماہوار سے بڑھ کر پندرہ ہزار ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نے ایک ایسی مل کا سودا کر لیا، جس میں کچھ رقم اسے نقد ادا کرنی تھی اور باقی کی ماہانہ قسطیں تھیں۔ نعمان نے مل کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی مل کے پورے اسٹاف کو مل کے لان میں جمع کیا اور کہا۔

بھائیو! جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ مل خسارے میں چل رہی تھی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سابقہ مالکان پچھلے تین مہینوں کی تنخواہ بھی نہ دے سکے تھے۔ اور اب اس بات کے امکانات تھے کہ مل بند کر دی جاتی اور آپ سب بیکار ہو جاتے۔ میں آپ لوگوں کی طرح ایک غریب اور مزدور آدمی ہوں، میرے پاس کچھ پونجی تھی جو میں نے مالکان کو دے کر یہ مل خرید لی ہے اور باقی رقم مجھے اگلے دو سال میں ادا کرنی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا۔

اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ مل چلتی رہے، آپ لوگوں کی ملازمتیں برقرار رہیں تو آپ سے اس مل کو اپنی سمجھ کر چلائیں، آج سے آپ سب کی تنخواہیں بند۔ آج سے آپ لوگ اس کے آدھے کے حصے دار ہیں۔ ہر ماہ جو منافع ہوگا، اس کا آدھا آپ لوگوں میں بانٹ دیا جایا

ایک طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

نعمان سیٹھ زندہ باد

دوسری طرف سے نعرہ اُبھرا۔

نعمان سیٹھ زندہ باد۔

اس کے بعد بہت دیر تک کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ورکرز کے نعرے گونج رہے تھے۔

نعمان سیٹھ زندہ باد، نعمان سیٹھ زندہ باد۔

اور کچھ مزدور تو خوشی سے ناچنے بھی لگ گئے تھے۔

شور ذرا کم ہوا تو نعمان نے کہا۔

بھائیو! ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ فوراً منافع شروع ہو جائے، ہو سکتا ہے ابھی چند مہینے تک آپ لوگوں کو تنخواہ سے بھی کم پیسے ملیں۔

منظور ہے۔ منظور۔ ہم آدھی تنخواہ لے کر دن رات کام کریں گے۔

جلسہ برخاست ہو گیا اور نعمان نعروں کا جواب دیتا ہوا اپنے دفتر میں چلا گیا۔

مزدوروں اور ورکرز کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی اور مشینیں چالو ہو گئیں۔ دن رات کام ہونے لگا۔

وہ مل ـــــ جو خسارے میں چل رہی تھی۔

وہ مل ـــــ جس کے بند ہونے کا خطرہ تھا، جہاں آئے دن ہڑتالیں ہوتی رہتی تھیں، جہاں ورکرز کو تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی۔

اب اس مل میں

دن رات کام ہو رہا تھا۔ مال پہلے سے چھ گُنا تعداد میں بن رہا تھا اخبارات میں خوب بڑے بڑے اشتہار چھپے اور چند ہی مہینوں میں مل کا، اور اس کی پروڈکس کا شمار اعلیٰ درجے میں شمار ہونے لگا مزدوروں کو وقت پہ تنخواہیں ملنے لگیں اپنے حصے میں سے ایڈوانس کی سہولتیں دے دی گئیں منافع کی شرح کا یہ عالم تھا کہ دو سال میں اتارا جانے والا قرضہ چھ ماہ میں اُتر گیا۔

نعمان اب نعمان نہیں تھا۔

نعمان سیٹھ تھا۔

مل کا پورا اسٹاف انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مل کا ہر ورکر خوش تھا۔ نعمان کے پاس دولت کی ریل پیل تھی مگر اداسی اور غم اس کی قسمت میں لکھے گئے تھے۔ دولت اور مل اس کے غموں کا علاج تو نہ تھے۔

بیٹھے بیٹھے وہ ماضی میں کھو جاتا، کام کرتے کرتے اس کا ہاتھ رُک جاتا۔ زندگی نے کس قدر مذاق کیا ہے مجھ سے، ہنستی کھیلتی زندگی جہنم بن گئی۔

پھر وہ سوچنے لگا

کہ چلو اچھا ہی ہوا، جلد ہی غزالہ کے چہرے کا خول اتر گیا، جلد ہی اس کی اصلیت سامنے آ گئی ورنہ میں زندگی بھر فریب میں مبتلا رہتا۔ زندگی بھر دھوکے کھاتا رہا۔

پھر اس کے دل سے اک ہوک سی اُٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے میری شعاع کیسی ہوگی۔؛ کاش! ابتی کی طرح وہ بھی میرے پاس ہوتی تو شاید ہم اتنے دکھ نہ ہوتے۔

اب خط نہ سندیسے، باتیں نہ ملاقاتیں ہیں
بس جلتے سلگتے دن ہیں تو بے کل راتیں ہیں
اور دل کا یہ حال کہ کڑھے سمجھانے پر
ہم آپ بہت حیران ہیں اس دیوانے پر

غزالہ بستر پر جا کر لیٹ تو گئی مگر نیند کا کہاں سوال تھا۔ وہ بھاگ کر شیشے کے سامنے گئی اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ پہلے چہرے پر پیلاہٹ اور اداسی تھی مگر شیشے کے سامنے جاتے ہی وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اب پھر سے آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا خوشی کے مارے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

بس آج وہ آجائے۔ میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی، میرے دل پر جو غم کی بدلیاں چھائی ہوئی ہیں آج وہ سب برس جائیں گی۔

آج

آج میں نعمان سے اپنی تمام زیادتیوں کی معافی مانگ لوں گی اور ہم پھر سے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

قدآدم شیشے میں غزالہ کے سامنے ایک دوسری غزالہ بھی کھڑی تھی، اس کے چہرہ پر ایک خوشی تھی، اور وہ نئی نویلی دلہنوں کی طرح شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

اس شام وہ کُل کُل کر نہائی، بھاری غرارہ کا سوٹ پہنا اور سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں میک اپ کیا

اس میک اپ اور بھاری جوڑے میں غزالہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی نئی نویلی دلہن ہو۔ اسے خود ہی احساس ہو رہا تھا۔ جیسے آج اس کی برات آنے والی ہے۔

برات

جس کا دولہا اس کا نعمان ہوگا۔

اس کا اپنا نعمان

غزالہ شرما سی گئی۔ اس وقت اس کے ذہن میں گزرے ہوئے ناخوشگوار دنوں کا سایہ بھی نہ تھا۔ وہ عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس کا نعمان آنے والا تھا۔ آج اس کے دل کی یہی کیفیت تھی جو شادی کے روز تھی۔ جس طرح وہ شادی کے دن نعمان کو پا کر خوش تھی۔

نعمان

نعمان جو اس کا مقصدِ حیات تھا۔

لیکن

یک لخت اس کے شاداب چہرے پر غم کی لہر سی گزر گئی۔

اسے اپنی بے وفائی اور زیادتیاں یاد آگئیں۔ آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی غزالہ نے خجل سی ہو کر گردن جھکا لی۔

وہ شرمندہ تھی، بے حد شرمندہ اور تصور میں اپنے مجازی خدا کے سامنے شرمندگی اور ندامت سے سر جھکائے ہوئے تھی۔

میں ان کا سامنا کیسے کر سکوں گی۔

وہ بڑبڑائی۔

پھر اس نے سوچا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ان کے قدموں میں گر کر غلطی کی معافی مانگ لوں گی۔

اور میں جانتی ہوں وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ وہ مجھے کسی طرح علیحدہ نہیں کر سکتے۔ کبھی گوشت بھی ناخن سے الگ ہوا ہے۔

شاہانہ جوڑے میں ملبوس غزالہ ایک زرد سی کلی لگ رہی تھی ایک اندیشہ سا اس کے دل میں اُبھرا۔

کیا خبر وہ معاف نہ کریں۔

تو پھر؟

اس پھر کے ساتھ ہی بھیانک مستقبل اس کی نظروں سے گزر گیا۔ اسے اپنی لبنیٰ کی یاد ستانے لگی اور سسکیاں آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے اس کے دامن پر گرنے لگے، وہ رونے لگی —— آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے اور ان آنسوؤں نے اس کے "بھاری" جوڑے کو تر کر دیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں نعمان سے معافی مانگ رہی تھی۔

اپنے اللہ سے کہہ رہی تھی۔

اے میرے خدا تو نعمان کے دل کو نرم کر کے اس میں میری محبت ایک بار پھر ڈال دے۔ مجھے میری خوشیاں واپس دے دے۔

روتے روتے کتنا وقت گزرا، غزالہ کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ اس کا میک اپ بھی آنسوؤں سے دُھل گیا تھا مگر پھر بھی نعمان کے آنے کی اطلاع کا سن کر اس کا دل خوش تھا۔ رونے سے آنکھیں اور بھی خوب صورت ہو رہی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے خود کو آئینے میں دیکھے جا رہی تھی اتنے میں میمونہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ غزالہ اس کی آمد سے بے خبر بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر

میمونہ بیگم دل میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکیں اور سوچنے لگیں۔

سیٹھ صاحب غزالہ کو پسند کر ہی لیں گے۔

چند لمحے وہ غزالہ کی محویت کو دیکھتی رہی پھر پاس آ کر پیار سے بولی۔

وہ آ گئے۔

غزالہ سن سی ہو کر رہ گئی۔

اللہ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں، میرے اللہ مجھے ہمت دے۔

میمونہ بیگم نے جو غزالہ کو اس حالت میں دیکھا تو کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ غزالہ خود کو کسی اجنبی کے سامنے جانے کے لئے تیار کر لے۔

غزالہ دل میں کہہ رہی تھی

نعمان تم آ گئے۔ اس کا مطلب ہے تم نے مجھے اس حد تک تو معاف کر دیا۔ ورنہ تم یہاں نہ آتے آج میں تمہارے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں گی۔ مجھے معاف ضرور کر دینا میرے نعمان۔

یہ سب سوچتے ہوئے غزالہ خود کو نعمان کے سامنے جانے کے لئے تیار کرنے لگی۔ اس وقت اپنے لباس کو دیکھ کر عجیب سی شرم محسوس ہوئی۔

بھڑکیلا غرارہ سوٹ۔ ان کپڑوں کو پہننے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے نعمان کو اپنی زندگی سے وابستہ کیا ہوا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھی۔ آہستہ چال سے وہ کمرے کے دروازے تک ہی گئی تھی کہ دل نے کہا

لوٹ جا —— واپس چلی جا —— مت جا ان کے سامنے۔

وہ پلٹنے ہی والی تھی کہ میمونہ بیگم اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تم ابھی تک یہاں بیٹھی ہو، جاؤ بیٹی وہ لان میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ خاموش رہی۔

میمونہ بیگم نے پھر کہا۔

"اچھا ٹھہرو تم ایسا کرو، چائے لے کر چلی جاؤ۔"

چند لمحوں بعد فیصلہ بدل کر بولی۔

"نہیں تم جاؤ۔ چائے میں فضلو کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔"

غزالہ نے خاموشی سے سر جھکا دیا اور بمشکل قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف آ گئی۔ وہ لان میں برآمدے کی طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ غزالہ نے نگاہ نیچی کر لی۔ اور اس کے پاس جا پہنچی قدم تھے کہ لڑکھڑا رہے تھے۔ آنسوؤں کو اس نے بمشکل سے ضبط کیا ہوا تھا مگر وہ وہاں جا پہنچی۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔ پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آداب عرض ہے۔"

غزالہ دہل کر رہ گئی۔ یہ نعمان کی آواز تو نہیں تھی۔ اس نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر دیکھا وہ کوئی اور تھا۔

کوئی انجانا مرد، ادھیڑ عمر اور بارعب شخصیت کا مالک۔

"تشریف رکھیے۔"

غزالہ بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

نعمان کیوں نہیں آیا۔

اس نے چور نظروں سے سامنے دیکھا۔ وہ شخص آنکھوں میں مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہا تھا

غزالہ کو خیال ہوا، ہو سکتا ہے یہ نعمان کا کوئی رشتہ دار ہو جو مصالحت کے لئے درمیان میں پڑا ہو، ہو سکتا ہے نعمان کو آتے ہوئے شرم آتی ہو۔

وہ بولا۔

"میں نے جتنی آپ کی تعریف سنی تھی آپ اس سے بڑھ کر خوبصورت ہیں۔"

غزالہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"جی۔"

اس نے پھر کہا۔

"میں نے جتنی آپ کی تعریف سنی تھی، آپ اس سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔ آپ جب آئیں تو میں سمجھا کہ بجلی کوند گئی ہے۔"

غزالہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

وہ بولا

"حسن کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

غزالہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا وہ نہیں آئے۔"

"وہ کون ——؟"

غزالہ خاموش ہو گئی۔ عجیب بے تکی سی خاموشی تھی۔ اتنے میں فضلو چائے لے کر آ گیا۔ میمونہ بیگم نے بہت اہتمام کیا ہوا تھا۔ غزالہ نے ٹرالی اپنے قریب کر لی اور پوچھا۔

"چینی؟"

ایک چمچہ۔

غزالہ نے کانپتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ اور غزالہ اپنے پالش شدہ ناخنوں کی بناوٹ کو گھورتی رہی۔ لمحے بہت بوجھل ہو گئے تھے۔ شام کا سلونا پن عروج پر تھا۔ غزالہ کو ہر سانس نمایاں طور پر چلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر چلی جائے پھر خیال آیا۔

ہو سکتا ہے چائے کے بعد یہ نعمان کا کوئی پیغام دیں۔

ذرا کسمسا کر اس نے کرسی میں پہلو بدلا ہی تھا کہ وہ بولا۔

آپ کا نام غزالہ ہے۔

جی ہاں

"مجھے نواز کہتے ہیں"

غزالہ خاموش رہی وہ پھر بولا۔

تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔

غزالہ کے چہرے پر سے عجیب سایہ گزرا۔ بمشکل بولی۔

"جی ہاں، مدت ہوئی"

"اوہ، آج کل کیا مشاغل ہیں آپ کے؟"

"جی کچھ نہیں، بس گھرداری ہی مشغلہ ہے"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ چند لمحے ہنستا رہا، پھر بولا۔

"لڑکیوں کے منہ سے گھرداری کا لفظ کتنا عجیب لگتا ہے"

غزالہ نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ خجل سا ہو کر بولا۔

"برا نہ ماننا۔ گھرداری تو شادی کے بعد ہوتی ہے، لیکن اچھا ہے کہ آپ کو گھرداری سے دلچسپی ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے، کیونکہ ہر مرد کو شوق ہوتا ہے کہ اس کا خوب صورت گھر ہو اور

سگھڑ بیوی ہو"

غزالہ اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی، عجیب سی باتیں تھیں جو اس کی سمجھ میں نہ آ سکیں۔ وہ کہتا رہا۔

"آپ کی والدہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتی ہیں۔ گو میری عمر زیادہ ہے مگر میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ دراصل آج تک مجھے ایسی کوئی لڑکی نہ ملی جسے میں بیوی بنا سکوں میرے پاس دولت ہے، عزت ہے مگر سکون نہیں، آپ سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے آپ ہی کی تلاش تھی۔ میری عمر بھر کی تلاش رائیگاں نہیں گئی۔ آپ ماشاء اللہ خوبصورت بھی ہیں، ذہین بھی اور سب سے بڑھ کر سلیقہ مند بھی۔ مجھے آپ پسند آئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بارے میں بھی چند باتیں جان لیں۔ میرا نام نواز ہے اور میں . . . . "

غزالہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھنکارتی آواز میں بولی۔

"سیٹھ صاحب، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ بکاؤ مال نہیں۔ میں شادی شدہ عورت ہوں دو بچوں کی ماں، میری اپنے شوہر سے آج کل ناچاقی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ آپ اس کے کوئی بزرگ ہیں جو مصالحت چاہتے ہیں۔ براہِ مہربانی تشریف لے جائیے۔ مجھے افسوس ہے آپ کی ہتک ہوئی جب کہ آپ ہر بات سے بے خبر ہیں"

نواز ہکا بکا اسے دیکھا جا رہا تھا۔ طیش میں آ کر چیخا۔

"کہاں ہے وہ بڑھیا جو لوگوں کو دھوکہ دیتی ہے"

غزالہ بولی۔

"آپ دھوکے میں نہیں آئے اس لئے تشریف لے جائیں۔ قصوروار آپ بھی ہیں جو دولت کے بل بوتے پر بڑھاپے کو جوانی کے قدموں میں جھکانے کو آ جاتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چلے جائیے، فوراً چلے جائیے۔ اس سے پیشتر کہ میں آپ کو یہاں سے نکال دوں۔"
دیکھ لوں گا۔

یہ کہتا ہوا وہ جھٹکے سے اٹھا اور فوراً اپنی شاندار کار میں بیٹھ کر ہوا ہوگیا۔ کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر میمونہ بیگم بھاگی آئیں۔

"ہائے وہ چلے گئے۔"

"جی ہاں!" غزالہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"اے بیٹی، خفا تو نہیں کر دیا انہیں۔"

"جی نہیں، وہ تو بہت خوش گیا ہے اور کل ہی بارات لے کر آئے گا۔"

میمونہ بیگم نے کہا

"تم کتنی اچھی ہو ——— عمر بھر راج کرو گی۔"

غزالہ بیگم نے کہا۔

مجھے نہیں کرنا راج، میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں شادی شدہ عورت ہوں، دو بچوں کی ماں۔

کیا غضب کیا تم نے ——— اری بے وقوف وہ اتنا دولت مند آدمی ہے کہ نعمان جیسے ہزاروں اس کے قدموں میں پڑے ہیں۔ ساری عمر پھولوں کی طرح رکھتا، سدا عیش کراتا۔

مجھے نہیں چاہیئے یہ عیش و آرام۔

"ہاں ہاں، تمہیں کیوں چاہیئے یہ عیش و آرام تو تو اس نکھٹو کے لئے روئے گی اور بوڑھی ماں کو دنیا کے فکروں میں ڈالے رکھے گی کہ وہ سوچے کہ تمہیں کہاں سے کھلائے، کہاں سے گھر کا خرچ چلائے۔"

"انہوں نے جو پیسے بھیجے تھے وہ کہاں ہیں؟"

"اے لڑکی خدا سے ڈرو، وہ پیسے کتنے دن چلتے۔ تبھی تو کہہ رہی ہوں کہ نواز سے شادی کر لے عیش کرو گی۔"

"آپ کو میرے عیش و آرام کی فکر کب سے ہوئی ہے؟"

تو ٹھیک ہے مگر ماں کا بھی کوئی خیال کر لیا ہوتا۔ سوچتی تھی اچھے گھرانے میں شادی کروا دوں تمہاری، تو خود بھی آرام سے زندگی گزار لوں۔"

غزالہ سانپ کی سی تیزی سے پلٹی اور زہریلے لہجے میں بولی۔

"تو یوں کہیئے آپ کو عیش و آرام کی ضرورت ہے تو بہتر ہے کہ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ہی نواز سیٹھ سے شادی کر لیں۔ آپ کی تو ہم عمری بھی ہے۔"

غزالہ تو یہ کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی، مگر میمونہ بیگم نے سینہ کوبی شروع کر دی۔ ساتھ ہی نعمان اور غزالہ کو بد دعائیں کوسنے اور اللہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا اور سینہ پیٹتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔

میمونہ بیگم نے کہا

"اری کلموہی تیرے بھلے کا کہہ رہی تھی۔ اتنی پہاڑ سی زندگی کیسے گزارے گی، پیسہ پلے نہیں۔ اس بدبخت نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔"

میمونہ بیگم زار و قطار رونے لگی۔ ماں کو روتا دیکھ کر غزالہ کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ تڑپ کر ماں کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور بولی۔

"امی آپ کیوں فضول کاموں میں پڑ گئی ہیں۔ میں نوکری کروں گی اور جیسا بھی ہوگا آپ کا اور شجاع کا پیٹ بھروں گی۔"

"نوکری؟" میمونہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نوکری کرو گی؟"

"امی کیا میں پہلے نوکری نہیں کرتی تھی۔ شجاع کی پیدائش تک میں نے نوکری کی ہے۔"

"اے بیٹی استانی گیری میں پیسے ہی کتنے ملتے ہیں"

"امی عزت تو ہوتی ہے۔ لیکن اب کی بار میں کہیں اور نوکری تلاش کروں گی۔"

میمونہ بیگم کا خواب گو ادھورا رہ گیا تھا مگر غزالہ کی کہی ہوئی بات اس کے دل میں چبھ سی گئی تھی۔ اتنی بڑی بات اور کوئی کہتا تو وہ ہرگز برداشت نہ کرتی مگر غزالہ تو سونے کی چڑیا تھی اسی مصلحت کے تحت انہوں نے اپنا غصہ ختم کر دیا تھا مگر دل میں ٹھان لیا تھا کہ کر دوں گی اپنی مرضی اب غزالہ کا نوکری کا ارادہ سن کر وہ دل ہی دل میں ہنس دی، مگر بظاہر بہت ہمدردی دکھائی اور بار بار سمجھانے کی کوشش کی، مگر غزالہ بھی اسی ماں کی بیٹی تھی۔ اپنے ارادے پر اٹل رہی۔ میمونہ بیگم اس وقت تو ٹل گئی۔

دوسرے دن غزالہ نے اخباروں میں ضرورت ہے، کے کالم دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس کے دل میں ایک نئے جذبے نے سر اٹھایا تھا۔ اسے شجاع کے لئے زندہ رہنا تھا اس کے لئے محنت کرنی تھی۔ محنت کا سوچ کر اکثر غزالہ کے دل میں نعمان کے نام سے ایک ہُوک سی اٹھتی۔ سوچنے لگی۔

کاش میں نے امی کے کہنے میں آ کر اپنا گھر برباد نہ کیا ہوتا، کاش میں نے نعمان کی قدر کی ہوتی تو میری زندگی بھی جنت کا نمونہ ہوتی۔ میرا گھر بھی پرسکون ہوتا۔

مگر وقت گزر گیا تھا۔ ڈور کا آخری سرا بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور نعمان اس کے آنسوؤں کے دھندلکے میں کہیں دور کھو چکا تھا۔

اخبار میں روزانہ ہی ضرورت ہے کے اشتہار چھپتے وہ جگہ جگہ جاتی مگر جو باتیں اب تک

اس نے سن رکھی تھیں وہ اس کو پیش آ رہی تھیں۔ ایک دن وہ ایک بڑے دفتر میں گئی لیڈی کلرک کی آسامی کے لئے۔ ڈائرکٹر عمر رسیدہ آدمی تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اتنی لمبی لائن میں اس کا نمبر بہت دیر سے آیا تھا۔ متوقع تھی کہ سوالات شروع ہوں گے سوال ہوا۔

آپ نوکری کیوں کرنا چاہتی ہیں۔

جی ضرورت کے تحت۔

"اتنی خوبصورت لڑکیوں کو بھی نوکری کی ضرورت ہوتی ہے؟"

جناب خوبصورتی زندگی کی ضروریات پوری نہیں کرتی۔

بہت خوب، ذہین بھی ہو۔ میری پرائیویٹ سیکرٹری ہو گی۔ معاف کرنا میرا بزنس ایسا ہے کہ مجھے خوبصورت لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے ان کو الگ سے پیسے ملتے ہیں، عیش کرو گی۔

غزالہ نے سہم کر سر اُٹھایا، بوڑھا شیطان خباثت بھری مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"منظور ہے؟"

جی نہیں، میں نوکری کرنے آئی ہوں عزت بیچنے نہیں۔

غزالہ جواب دے کر چلی آئی۔ گھر آ کر بہت روئی ——— پھر اس نے سوچا

غزالہ بیگم یہ دنیا ہے اور تم بغیر شوہر کے، جوان عورت ہو تمہیں یہ سب سہنا ہوگا۔

غزالہ نے سب کچھ برداشت کرنے کا عزم کیا مگر ہر بار اسے تلخ تجربے ہوئے۔

ایک نوجوان آفیسر نے اسے شادی کی پیشکش پہلی ہی ملاقات میں کر دی۔

ایک افسر نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جانِ من بس ذرا میرا دل بہلا دیا کرنا، کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا ساری زندگی تمہیں
ایک اور فرم کے مالک نے کہا۔

"میری بیوی جاہل اور پھوہڑ عورت ہے مجھے تو دراصل ایک دوست کی ضرورت ہے۔ جو میرے ساتھ پارٹیوں میں، محفلوں میں جا سکے، میرے ساتھ زندگی کی خوشیاں لوٹ سکے"

تو آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

"شادی" وہ بوکھلا سا گیا۔ جی نہیں شادی نہیں، میرا مطلب ہے کہ وہ میری ساتھی بن سکے تنخواہ معقول ہوگی۔

غزالہ نے کہا

"بہت خوب، یہ آپ نہیں بول رہے آپ کی دولت بول رہی ہے"

اور وہ کہتی رہی۔

میں تو خیر بکنے والی شے نہیں، لیکن ایک بات آپ سن لیں کہ دولت سدا کسی کے پاس نہیں رہتی۔ بڑے بڑے سیٹھ اور نوابوں کو جوتیاں چٹخاتی پڑی ہیں ___ سیٹھ صاحب خدا نہ وقت سے بچائے کہیں آپ کی بیٹی یا بہن کو نوکری کے لئے نکلنا پڑے اور اسے بھی داشتاؤں کی نوکری کی آفر نہ ملے۔

وہ چلایا۔

نکل جاؤ میرے دفتر سے۔

اور غزالہ چپ چاپ باہر نکل آئی۔

اسے ذرا کوئی شریف آدمی ملا تو نوکری نہ ملی اور جہاں جیسی نوکری ملی وہ اسے گوارہ نہ تھی۔ وہ بیوی بھی رہ چکی تھی۔ ماں بھی تھی مگر اسے داشتہ بننا گوارہ نہ تھا۔ وہ سوچتی کسی شریف گھرانے میں آیا ہی بن جاؤں۔ مگر آیا کی ملازمت میں پیسے بہت کم ملتے تھے ایک بار اسی سلسلے میں ایک بڑے گھر میں گئی تو بڑے صاحب کی بھوکی نگاہوں سے گھبرا کر آ گئی۔ اس نے زندگی بھر میں اتنے آنسو نہ بہائے تھے جتنے وہ نعمان سے بچھڑنے کے بعد بہا چکی تھی۔ ہر جگہ سے نااُمید ہو کر وہ گھر آتی تو خوب روتی۔ ان دنوں میمونہ بیگم نے اس سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ اور غزالہ چاہتی بھی یہی تھی۔ اس لئے کہ میمونہ بیگم جب بھی بولتی غزالہ کو دوسری شادی کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ غزالہ ان کی خفگی سے سُکھ میں تھی۔

ان دنوں وہ شعاع کی طرف بھی توجہ نہ کر سکی۔ بہت دنوں بعد اسے سینے سے لگا کر وہ صبح صبح ہی بہت روئی۔ شعاع اب ماں کے آنسوؤں کی عادی ہو چکی تھی خاموشی سے غزالہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سینے سے لگی رہی۔ غزالہ نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے دیکھا۔ شعاع بہت کمزور ہو گئی تھی اور بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ ہونٹ سفید ہو رہے تھے، وہ خاصی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ماں کیوں روتی ہے۔ وہ اپنے ننھے منھے ذہن میں منصوبے بناتی کہ کسی طرح معلوم ہو کہ ابو کہاں ہیں تو میں چپکے سے جا کر ان کو بلا لاؤں گی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ابو کہاں ہیں۔ اسے اکثر لبنیٰ یاد آتی تھی۔ وہ سوچتی میری باجی کہاں چلی گئی، وہ یہاں کیوں نہیں آتی اب جو غزالہ نے اسے سینے سے لگایا تو وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

"امی، ابو کیوں نہیں آتے؟"

"آئیں گے بیٹی۔"

غزالہ نے اس کے ریشمی بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

اور امی باجی کہاں ہیں؟

باجی؟

غزالہ کے دکھی دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"لبنیٰ میری بچی کہاں ہے تو، تجھے کبھی ماں کی یاد نہ آئی۔"

امی، وہ بھی ابو کے ساتھ آئیں گی؟

"ابو ـــــ ابو ـــــ ابو" میمونہ بیگم کمرے میں گھستے ہوئی بولی۔

"اس کو منع کیا کر، میرا کلیجہ جلتا ہے۔ یہ اس نامراد کو کیوں یاد کرتی ہے چل ری لڑکی اٹھ جا اسکول کا کام کر۔ اور سن لے مر گئے تیرے ابو، وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

امی۔

غزالہ نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر پلنگ پر گر گئی۔ میمونہ بیگم نے کہا۔

"دیکھا شعاع تمہارے ابو کتنے برے آدمی ہیں، تمہاری امی بیمار ہیں اور وہ نہیں آتے۔ تم ان کو یاد نہ کیا کرو۔ وہ تمہیں بھی اسی طرح بیمار کر دیں گے۔ جان سے مار ڈالیں گے۔"

"اور باجی۔"

شعاع نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"لو اور سنو، اس نے تمہاری باجی کو بھی مار ڈالا ہو گا، ورنہ وہ آتی ضرور، جاؤ اب تم پانی کا ایک گلاس لاؤ۔"

شعاع پانی لے آئی۔ میمونہ بیگم نے بڑی بے دردی کے ساتھ غزالہ کے منہ پر چھینٹے مارے اور بولی۔

"اٹھو اب، بہت ہو چکی، اس کم بخت کا خیال اب چھوڑ بھی دو۔"

غزالہ ہوش میں آئی تو بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ اسی شام اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

شاداب گالوں پر زردی چھا چکی تھی۔

ہونٹوں کی کلیاں مرجھا گئی تھیں۔

آنکھوں کے حسین کنول دھندلے سے ہو گئے تھے۔

وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ رونا چاہتی تو رویا نہ جاتا اور برداشت کرنا چاہتی تو برداشت نہ ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن کے اخبار میں ایک اشتہار چھپا۔ کسی مل میں مزدور عورتوں کے لئے نگران کی ضرورت تھی جو تنخواہوں کا حساب بھی رکھ سکے۔ غزالہ نے سوچا ایک کوشش اور سہی۔ یوں بھی یہ نوکری مل جاتی تو اسے دفتر میں صاحب کے روبرو نہ بیٹھنا پڑتا۔ اس لئے دوسرے دن سفید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساڑھی باندھ کر بل جانے کو تیار ہوئی۔ میمونہ بیگم نے اسے عجیب گہری گہری نظروں سے دیکھا۔ تو غزالہ کا دل رو پڑا۔ کہ یہ کیسی ماں ہے۔ اخبار اور سند لے کر وہ بل کی طرف روانہ ہوئی۔ صاحب کے کمرے کا باہر کا برآمدہ عورتوں کی لمبی قطار سے بھرا تھا۔ وہ بھی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ ہر عورت کے چہرے پر مجبوری کی چھاپ تھی۔ وہاں کوئی فیشن ایبل عورت نہ تھی۔ سیدھی سادی سی عورتیں جو خاموشی سے کھڑی تھیں۔ غزالہ نے نگاہ اٹھا کر کمرے کی طرف دیکھا۔ انٹرویو شروع ہو چکے تھے۔ دروازے پر نام کی تختی لگی تھی۔

نعمان احمد

کسی مزدور نے چاک سے اضافہ کیا ہوا تھا۔

نعمان احمد سیٹھ۔

غزالہ کے دل میں ہوک اُٹھی۔ نعمان تم کہاں ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں گم ہو گئے۔ آخری بار تمہاری نوکری چھوڑنے کی خبر ملی تھی۔ خدا جانے تمہیں بھی کہیں اور نوکری ملی یا نہیں۔ پتہ نہیں کن حالات میں گزارا کر رہے ہو۔

قطار کم ہوتی جا رہی تھی مگر غزالہ نعمان کو یاد کر رہی تھی۔ اس سے محبت بھرے گلے شکوے کر رہی تھی۔ اچانک وہ چونک اٹھی۔

ایک عورت نے کہا تھا "بی بی تمہاری باری ہے"

غزالہ نے پلّو کو ماتھے تک جھکایا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ غزالہ کے تصور سے کہیں بڑا کمرہ تھا۔ وہ سُرخ قالین پر کھڑی تھی۔ شیشے کی بڑی بڑی خوبصورت الماریوں میں کتابیں بھری تھیں۔ قیمتی پردے کھڑکیوں کو چھپائے ہوئے تھے۔ کمرے براؤن رنگ کی میز پر ترتیب سے کاغذات رکھے تھے۔ بڑے صاحب کے سامنے پانچ مختلف رنگوں کے ٹیلی فون پڑے تھے اور غزالہ نے دیکھا۔

خوب صورت کرسی پر جو شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی اس کا نعمان تھا۔ مگر آج وہ صرف نعمان سیٹھ تھا۔

اور

غزالہ نے دیکھا

نعمان کے سامنے کے سیاہ بال سفید ہو چلے تھے۔

اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔

نعمان کے ہنستے مسکراتے چہرے کی بہار پر خزاں کا ڈیرا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک زخم اس کے چہرے پر لکیریں ڈال گیا تھا۔ اس کی شخصیت بارعب ہو گئی تھی مگر اس کے لبوں کی ہنسی کو غزالہ کی بے وفائی نے ڈس لیا تھا۔

وہ اس کا نعمان تھا۔

غزالہ سحر زدہ کھڑی رہی۔

وہ نگاہ اٹھائے بغیر بولا۔

"تشریف رکھیے۔"

اور غزالہ معمول کی طرح بیٹھ گئی۔

اور

غزالہ اپنے شوہر کے دفتر میں نہ آئی تھی، وہ نعمان سے ملنے نہ آئی تھی۔

بلکہ

اسے ملازمت کی تلاش تھی، زندہ رہنے کے لئے اسے ملازمت کرنا پڑ رہی تھی۔

اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ملازمت کی تلاش میں خوار ہوتی ہوئی اب وہ نعمان کے سامنے بیٹھی تھی۔

نوکری کے لئے۔

ملازمت کے حصول کے لئے۔۔

اس وقت غزالہ کا بے اختیار جی چاہنے لگا کہ

چیخ چیخ کر کہے

نعمان! نعمان!! میں غزالہ ہوں، تمہاری غزالہ جو تمہیں زندگی سے زیادہ عزیز تھی جسے دیکھ دیکھ کر تم زندہ تھے۔ آج تمہاری غزالہ ملازمت کے حصول کے لئے دفتروں میں گھوم رہی ہے، رسوا ہو رہی ہے

یہ رسوائی اسے اب تمہارے سامنے لے آئی ہے۔

آج تمہاری غزالہ تمہارے سامنے شرمندہ ہے، شرمسار ہے۔

اسے معاف کردو نعمان۔

اسے زندگی لوٹا دو۔

مگر

آج اس کی ہمت نے جواب دے دیا، قوت گویائی جاتی رہی، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ہاں آنسو ضرور تھے جو اپنی بے بسی پر آنکھوں میں امنڈ آئے تھے دل پر جو گھٹا سی چھائی تھی وہ اب برسنا چاہتی تھی۔

اتنے میں نعمان نے کہا

خاتون آپ درخواست لائی ہیں۔

غزالہ نے پھر بولنے کی کوشش کی، مگر یہ سعی بھی رائیگاں گئی۔

نعمان نے کہا۔

خاتون آپ شاید پہلی بار ملازمت کے لئے آئی ہیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ بھی ہماری طرح کی انسان ہیں۔ کوئی بڑا نہیں، کوئی چھوٹا نہیں، سب انسان برابر ہیں اور پھر یوں بھی کل تک میں ایک معمولی آدمی تھا اور خود ملازمت کرتا تھا۔ پتہ نہیں کیا حالات اور زندگی کی کیا گردشیں تھیں کہ آج میں آپ کو اس کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا ہوں۔

اور وہ کہتا رہا۔

اگر آپ کا تعلیمی معیار ایسا ہے کہ ہمارے دفتر میں کام کر سکیں تو یقین کریں کہ آج کے بعد آپ یہاں ملازم نہ ہوگی، مالک ہوگی، حصہ دار ہوگی، یہاں کا ہر مزدور، ہر کارندہ اس مل کا حصہ دار ہے اس لئے یہاں کوئی کسی پر حکم نہیں چلا سکتا، یہاں پر ہر شخص کو وقت پر آنا اور اپنی ڈیوٹی انجام دے کر واپس چلے جانا ہوتا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے اس مل کے آدھے کا حصہ دار ضرور ہوں۔ مگر آپ مجھے بھی ایک مزدور سمجھیں، میں نہ خود کسی پر حکم چلاتا ہوں اور نہ چلانا چاہتا ہوں ویسے بھی اللہ نے میری قابلیت سے میری سوجھ بوجھ سے کہیں زیادہ مجھے دے دیا ہے لہٰذا آپ بلا خوف و خطر اپنی درخواست دے دیں اگر ممکن ہوا تو میں ابھی سے آپ کا تقرر کردوں گا۔

غزالہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کے پاس کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

اس کے دل سے نعمان کی ترقی کے لئے دعائیں نکلیں اس نے ایک سسکی بھری اور کرسی سے اٹھ کر واپس چلی گئی۔

نعمان آوازیں دیتا ہی رہ گیا اور اسے خاتون خاتون پکارتا رہا۔

مگر وہ غزالہ تھی۔

نعمان کے منہ سے وہ اپنے لئے ایک اجنبی لفظ سننا نہیں چاہتی تھی۔

اور وہ چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھر پہنچ کر غزالہ کو ایک سکون سا پڑ گیا۔ ایک اطمینان سا ہو گیا کہ چلو میں نہ سہی نعمان تو آرام کے ساتھ ہے، دولت اس کے قدم چوم رہی ہے اور پھر میری لبنیٰ اس کے پاس ہے۔

لبنیٰ

میری بیٹی لبنیٰ

اب لبنیٰ کی طرف سے اس کی فکر کم ہو گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نعمان نہ صرف یہ کہ ایک اچھا شوہر تھا بلکہ وہ ایک باپ بھی ہے حالات کچھ بھی ہوں انسان کو سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے اور غزالہ نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا سینے پر صبر کی سل رکھ لی۔

اور

اگلے روز وہ اپنے سابق سکول میں گئی اس کا پچھلا ریکارڈ اچھا تھا پرنسپل نے خوش آمدید کہا حالات سنے تو بہت، افسوس کیا اور اسی دن سے اسے اس کی سابقہ جگہ پر رکھ لیا۔

غزالہ کے جانے کے بعد نعمان پریشان تھا وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کون تھی اور کن ات میں تھی کہ ایک لفظ کہے بغیر واپس چلی گئی۔ وہ سخت پریشان تھا کہ حنا آ گئی۔

نعمان کو اس قدر پریشان بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھ ہی بیٹھی۔

کیا بات ہے نعمان! آج پریشان ہو؟

نعمان نے کہا کوئی خاص بات نہیں

کوئی عام بات؟

عام تو نہیں ـــــ بات تو خاص ہی ہے مگر

تو پھر کہہ ڈالئے نا۔

تب نعمان نے اُسے وہ واقعہ سنایا، بات واقعی معمہ کی تھی، مگر حنا نے کہا کہ اب پریشان ھونے سے کوئی فائدہ نہیں خدا جانے کیا حالات ہوں گے مگر جب وہ خاتون جا ہی چکی ہیں تو ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں، یہاں تو ہر شخص کی زندگی میں دکھ ہیں ہر شخص اپنے ساتھ دکھوں کا بوجھ لئے پھر رہا ہے ——— کیا تم ——— کیا میں

نعمان نے سر اٹھا کر حنا کی طرف دیکھا

تمہیں کیا دکھ ہیں حنا؟

حنا نے کہا

چھوڑیئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ہاں آج ایک بات کہنی ہے

فرمایئے

میں دیکھتی ہوں کہ آپ اکثر کھوئے کھوئے رہتے ہیں، پریشان رہتے ہیں۔

قسمت کی بات ہے حنا

کیا آپ پرانی یادوں کو بھول نہیں سکتے۔

یاد رکھ کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔

حنا نے کہا

ایک بات ہے نعمان

کیا

کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

نہیں تم کہو تو سہی

کہی ہوئی بات پرائی ہو جاتی ہے

نعمان نے کہا

نہیں تم کہو

حنا نے کہا

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم زندگی کے باقی دکھ بانٹ لیں۔

نعمان نے کہا

حنا میری زندگی تو ایسے ہی دکھوں کا مجموعہ ہے، میری زندگی تو یاس ہے، ناامیدی ہے۔ آہ ہے ——— میں تو آج کل اس مل میں اپنے کو زبردستی مصروف رکھے ہوئے ہوں مزدوروں کے اور دیگر عملے کے دکھ درد دیکھ کر اپنے دکھ بھول جاتا ہوں ——— تم کیوں اپنی زندگی کو روگ لگانا چاہتی ہو، تم کیوں اپنی زندگی میں کانٹے بھر لینا چاہتی ہو۔

اور وہ کہتا رہا۔

تم ابھی جوان ہو، تمہارا دل امنگوں سے بھرا ہے اور میرا دل جل کر راکھ ہو چکا ہے تم کیوں اپنی زندگی میں دکھ بھرنا چاہتی ہو۔

آرام اور چین کے ساتھ تو سبھی زندگی گزار لیتے ہیں، لیکن سخت اور دشوار زندگی گزارنا ہی اصل زندگی ہے۔

تو تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے۔

ہاں ——— میں نہایت خلوص کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی ہوں۔

حنا کی آنکھوں سے صداقت جھلک رہی تھی۔

ایک بار پھر سوچ لو۔

نعمان صاحب! آپ بار بار ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں۔

تمہیں معلوم ہے میری ایک بیٹی بھی ہے۔

ہاں تو کیا ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں معلوم ہے میں اپنی بیٹی کو کتنا چاہتا ہوں۔

سبھی باپ اپنی بیٹیوں کو چاہتے ہیں۔

تمہیں اس چاہت کا اندازہ نہیں ہے جو مجھے لبنیٰ سے ہے۔

حنا نے کہا۔

تم کیا کہنا چاہتے ہو ذرا کھل کر کہو۔

نعمان نے بڑی صاف گوئی سے کہا

میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر لبنیٰ کی وجہ سے میرے اور تمہارے تعلقات خراب ہو جائیں۔

اوہ میں سمجھ گئی۔

حنا مسکرائی اور سوچ میں ڈوب گئی۔

نعمان خاموش بیٹھا اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

حنا نے دو ایک لمحوں کے بعد کہا

لبنیٰ جیسی تمہاری بیٹی ہے ویسی ہی میری بیٹی ہے تم سمجھتے ہو کہ میں لبنیٰ کو ماں کا پیار نہیں دے سکتی۔

اس بات کے پورے امکانات ہیں کہ جب تک تمہاری اپنی اولاد نہ ہو تم لبنیٰ کو ماں کا پیار دے سکتی ہو لیکن۔۔۔

نعمان ایک لمحہ کے لئے رکا۔

لیکن بعد میں سوچنے کا انداز بدل جائے۔

نعمان نے بات پوری کہہ دی۔

حنا نے کچھ برا مان کر کہا۔

مجھے بہت افسوس ہے نعمان کہ تم میرے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہو

نعمان نے کہا اس میں برا ماننے کی بات نہیں حنا۔ دنیا میں عموماً ایسا ہی ہوا کرتا ہے

مگر یہ تم کیوں بھول جاتے ہو کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

حنا نے اسے قائل کرنا چاہا۔

یہ درست ہے مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس وقت جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس پر عمل بھی کرو گی۔

نعمان نے بحث کی۔

میں سوائے اس کے اور کیا کہوں نعمان کہ اس بات کا ثبوت آنے والا وقت دے گا۔

حنا نے افسردگی سے کہا۔

نعمان چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

حنا نے بڑے عزم سے کہا۔

اگر مجھے موقع ملے اور مجھ پر اعتماد کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ میں عورت کی پیشانی سے سوتیلے پن کا یہ داغ مٹا کر ہی رہوں گی۔

نعمان نے کہا۔

کاش ایسا ہو سکے۔

سچی بات تو یہ ہے نعمان یہ لفظ اتنا برا نہیں ہے جتنا دنیا والوں نے اسے بدنام کر رکھا ہے

حنا نے بے حد تاسف سے کہا۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں نعمان نے اس کی تائید کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد کمرے میں کئی منٹ تک خاموشی رہی آخر کار اس خاموشی سے تنگ آ کر حنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں چلتی ہوں

اچھا

مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو گے۔

حنا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

کوشش کروں گا۔

کوشش نہیں وعدہ

اور حنا چلی گئی

پھر ——— نعمان نے کئی دنوں تک اس مسئلے پر سوچا اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیا تو سوائے اس کے وہ اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ حنا سے شادی کر لے۔

اور جیت آخر کار حنا کی ہی ہوئی اور وہ مسز نعمان بن کر نعمان کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

پھر وقت بڑی خاموشی سے گزرنے لگا۔ گردشِ حالات کے ہاتھوں دو سگی بہنیں ایک اپنے باپ سے دور اور دوسری ماں سے دور الگ الگ ماحول میں اور گھروں میں پرورش پاتی رہیں، زندگی میں جیسے ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ ہر شخص نے اپنے ماحول سے۔ وقت سے اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے کیونکہ سمجھوتہ کئے بغیر تو زندگی میں ایک قدم بھی آگے بڑھانا دشوار نظر آ رہا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میمونہ بیگم جیسی عورت نے خاموشی اختیار کر لی تھی وہ نہ اب غزالہ سے دوسری شادی کے لئے اصرار کرتی تھی اور نہ ہی اس کی کسی اور بات میں

دخل دیتی تھی روپیہ پیسہ اور مکان ویسے بھی اس کے قبضہ میں تھا بہرحال اس نے چپ سادھ لی تھی۔

شجاع نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اسے اب نہ ابو کی یاد آتی تھی اور نہ ہی وہ کسی بات پر مچلتی تھی بلکہ وہ تو کسی حد تک اس حادثے کو بھول چکی تھی اب تو اسے ابو کی یاد بھی نہیں آتی تھی تاہم اس کی ذہنی نشوونما پر اس کے اثرات ضرور تھے وہ تو اب تک ڈری ڈری اور سہمی سہمی رہتی تھی اس کی فطرت میں زود حسی، کم سخنی اور افسردگی رچ بس گئی تھی لیکن اپنی فطرت کی ان تمام خصوصیات کو اس نے اپنی تعلیم پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا زود حس اور افسردہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذہین اور سمجھدار بھی تھی اس لئے اس کا تعلیمی معیار شروع ہی سے اچھا رہا وہ تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی اس کی زندگی بغیر کسی نشیب و فراز کے چپ چاپ گزر رہی تھی کہ ایک روز،

ایک روز!

اس کے دماغ کو زبردست دھچکا لگا۔

وہ سن سی رہ گئی۔

اس کی امی نے

غزالہ بیگم نے

دوسری شادی کر لی تھی۔

دوسری شادی

وہ چپ چاپ کمرہ بند کر کے پہروں روئی۔ کسی نے اس کا دکھ جاننے کی کوشش نہ کی۔ کسی نے نہ پوچھا کہ اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر کیوں لگ گئی ہے بہرحال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک دن اسے ان بہتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانا پڑا ـــــــ افتخار صاحب اس کا باپ بن کر اس کی دنیا میں داخل ہو گئے۔

اب تک شعاع کو کسی سے نفرت نہ ہوئی تھی۔

مگر

افتخار صاحب کو دیکھ کر

اس کا دل نفرت سے بھر گیا اس کے دل میں مرد کے لئے نفرت بیٹھ گئی۔

دوسری طرف شعاع کی بہن لبنیٰ کی زندگی بے حد پرسکون، مطمئن اور خوشگوار گزر رہی تھی اس کے لئے نہ روپے پیسے کی کمی تھی اور نہ ماں باپ اور نہ بہن بھائیوں کی شفقت و محبت کی، وہ گھر میں سب سے بڑی تھی، اس کے چھوٹے تین بھائی سلمان، عمران اور ذیشان اس کی بہت عزت کرتے تھے اپنی امی حنا سے بھی بے حد پیار تھا جو اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کو انتہائی دلچسپی سے سن کر مشفقانہ بلکہ دوستانہ انداز میں بھی مشورے دیتی تھیں ان لوگوں کے ساتھ ہی اس کی بے پناہ چاہنے والی پھوپھی بھی تھیں جو کچھ ہی عرصہ قبل بیاہ کر اپنی سسرال گئی تھیں اور نعمان' ان سب باتوں کے لئے حنا کا احسان مند تھا جو اپنے کہے ہوئے الفاظ پر پوری طرح عمل کر رہی تھی۔ وہ بڑے خلوص سے اپنے فرائض کو انجام دے رہی تھی اپنی محبت اور توجہ سے اس نے نعمان کی پریشانیوں اور اس کی الجھنوں کو دور کر دیا تھا۔ گھر کے ماحول میں نہ کسی قسم کی تلخی تھی اور نہ الجھاؤ بچوں کی تربیت بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلجھے ہوئے انداز میں ہو رہی تھی۔

شجاع کے ساتھ لبنیٰ بھی تعلیم کی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ایک دن ایسا آیا کہ دونوں اسکول اور کالج کے ماحول سے نکل کر یونیورسٹی کے بالکل نئے اور جداگانہ ماحول میں داخل ہوگئیں یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ ایم اے میں دونوں کا مضمون ایک ہی تھا ——— دونوں کی پہلی ملاقات بہت ہی عجیب انداز میں ہوئی۔ شجاع گرلز کا... روم سے نکل رہی تھی اور لبنیٰ درمیان میں پردہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں اور دونوں کے سر بڑی زور سے ٹکرائے دونوں کے ہاتھوں میں فائلیں اور کتابیں تھیں وہ اس ٹکر سے نیچے گر پڑیں مگر انہیں اپنی گری ہوئی چیزوں کا ہوش کہاں تھا۔ سر میں چوٹ اس قدر زور سے لگی تھی کہ دونوں نے پہلے اپنے سر سہلانے ضروری سمجھے، سر کی تکلیف کم ہوئی تو دونوں نے ایک دوسرے سے معذرت کر کے اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیں۔

اور

یہ تھی پہلی ملاقات جوان بہنوں کی، جس نے ظاہر ہے کوئی خوشگوار اثر نہ چھوڑا تھا۔ معذرت کرتے وقت دونوں نے ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نظر سے ضرور دیکھا تھا۔

داخل ہونے والے طلباء وطالبات کی لسٹ لگ چکی تھی لیکن ابھی کلاسیں شروع نہ ہوئی تھیں ابھی فیس جمع کرنے کا سلسلہ ہی جاری تھا اس لئے دونوں میں سے کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ دونوں ایک ہی شعبے میں ہیں اور آئندہ دونوں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑے گا۔

شعبے کی بات تو الگ رہی وہ بیچاری لڑکیاں تو اس بات سے بھی ناواقف تھیں

کہ انھوں نے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور ان کے درمیان خون کا اٹوٹ رشتہ ہے۔

کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔ پروفیسر صاحب ابھی کلاس میں نہیں آئے تھے اس لئے سب لڑکے لڑکیاں خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ لبنیٰ کی نظر شجاع پر پڑی۔ وہ اس سے بات کرنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے پاس بات شروع کرنے کا کوئی بہانہ نہ تھا وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کس طرح بات شروع کرے کہ شجاع کی ایک دوست نجمہ نے اس کیفیت کو بھانپ لیا اور اس نے شجاع کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی دراصل وہ لبنیٰ کو دیکھ کر بلاوجہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی لبنیٰ کو صبح کار چھوڑ کر جاتی تھی واپسی کے لئے بھی ڈرائیور پہلے سے منتظر ہوتا تھا۔ نجمہ کا خیال تھا کہ یہ لڑکی مغرور اور امیر ہے۔ اس لئے وہ مستقلاً اس کوشش میں تھی کہ لبنیٰ شجاع سے بات نہ کرنے پائے بلکہ ایک دن اس نے شجاع سے اس بارے میں بات بھی کی تھی شجاع اس معاملے میں کچھ نہ بولی تھی اس کے دل میں لبنیٰ کے خلاف کوئی بات نہ تھی لیکن وہ نجمہ کو بھی کسی طرح ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔

دونوں ایک ہی شعبے میں تھیں اس کے باوجود اب تک دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی تھی۔

کر

ایک دن شجاع کو لائبریری میں دیر ہو گئی اور جب باہر نکلی تو آسمان ابر آلود تھا۔ گھٹا اُمڈی کھڑی تھی اور کوئی دم میں برسا چاہتی تھی۔ وہ جلدی جلدی بس سٹاپ کی طرف گئی تاکہ بارش ہونے سے پہلے بس پکڑ سکے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو لبنیٰ کو بھی خلاف معمول بس سٹاپ پر کھڑے پایا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ——— دونوں کے درمیان جو حجاب تھا وہ قائم رہا اور دونوں خاموشی سے بس کا انتظار کرنے لگیں۔

دس منٹ گزر گئے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی ایک کار آکر ان دونوں کے پاس رُکی

لبنیٰ جلدی سے کار کی طرف بڑھی

ابو ڈرائیور نہیں آیا۔

اس کے ابو نعمان نے کہا

ممی اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔

لبنیٰ باپ کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

نعمان نے ایک نظر شعاع پر ڈالی اور لبنیٰ سے کہا اس بچی کو بھی بٹھا لو

لبنیٰ نے شعاع سے آنے کو کہا وہ ہچکچائی تو نعمان نے کہا' آؤ بیٹی بارش ——— ہوا چاہتی ہے ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔

شعاع نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گئی۔

کار روانہ ہو گئی

اور

اس طرح دو بہنیں دو بیٹیاں ایک ساتھ جمع ہو گئیں۔

لیکن اس طرح

کہ

حالات سے بے خبر

اجنبیوں کی طرح

اور کار چل رہی تھی، بارش زور پکڑ چکی تھی اور بارش کا اس قدر زور تھا کہ بڑی مشکل سے ہلکی رفتار سے چل رہی تھی، نعمان صاحب بار بار کار کے شیشے صاف کرتے تھے اور شعاع سوچ رہی تھی کہ اگر یہ فرشتہ آج نہ ہوتا تو کس طرح گھر پہنچتی

لیکن

اس کے ساتھ ساتھ ایک خیال آیا اور وہ پریشان ہو گئی کہ اسے کار میں سے اترتے دیکھ کر اس کی امی نے سوالات شروع کر دیئے تو کیا ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عجیب کردہ پریشان سی ہوگئی۔ اس کی سوچوں کا رُخ اپنی امی کی طرف مڑ گیا، جو اب افتخار کی بیوی تھی، لیکن شعاع نے کبھی افتخار کو اس نظر سے نہ دیکھا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے، سوتیلا ہی سہی مگر دنیاوی رشتے سے اس کا باپ ہی کہلاتا تھا۔ جس کی بیوی بننے کے بعد غزالہ میں وہ پہلے والی بات نہ رہی تھی، ماں کا وہ پہلے والا پیار اب اسے نہ تھا، اب شعاع خود بھی ماں سے دُور رہنے لگی تھی۔

ایک میمونہ بیگم تھی جو بات بات پر اسے باپ جیسی سڑی کہہ کر جلایا کرتی تھی۔ شعاع کو ماں کے ساتھ ساتھ نانی سے بھی نفرت تھی، لیکن اسے سب سے زیادہ نفرت اگر کسی سے تھی تو وہ ہستی اس کے باپ کی تھی۔

باپ

اس کا اپنا باپ

شعاع یہ سمجھتی تھی کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے کر اس حال میں پہنچایا ہے۔ اس کے دل میں اپنے باپ کے لئے ایک نفرت تھی۔

میمونہ بیگم نے اس کے دل میں بچپن سے ہی یہ بات ڈال دی تھی۔ گو شعاع کو بچپن کے واقعات یاد نہ تھے، لیکن اس کے لاشعور میں وحشت و بربریت کی جو تصویر تھی۔

وہ مرد کی تھی۔

جو اس کا باپ تھا۔

وہ ذہن میں اپنے باپ کے نقش ابھارتی، اس سے نفرت کرتی اور ان نقوش کو مٹا دیتی اکثر وہ وحشت میں اِدھر اُدھر باپ کی تصویر تلاش کرتی، چوری چوری بکس کھول کھول کر دیکھتی تاکہ وہ اصل صورت سے نفرت کر سکے تاکہ دنیا کے ہر مرد سے نفرت کرے مگر غزالہ اور

میمونہ بیگم نے نعمان کی ہر یاد کو اس گھر سے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔ مگر نعمان تینوں کے دلوں میں بیٹھا تھا، خواہ وہ لوگ اس سے نفرت ہی کرتے تھے۔

بارش یوں برس رہی تھی، گویا اب کے نہ برسی تو شاید کبھی نہ برس سکے گی۔ نعمان بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی کے بند شیشوں سے پرے وہ بارش کی دھند میں معلوم نہیں کہاں کھو سی گئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کب کار رکی، وہ تو اس وقت چونکی جب لبنیٰ کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

ابّو جی کیا ہوا؟

شعاع نے چونک کر دیکھا کار ایک درخت کے نیچے رکی ہوئی تھی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے نعمان کار سے باہر نکلا اور بارش کی سفید چادر سے گزرتا ہوا سڑک پر جا کر گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکنے لگا۔ ٹیکسی والا کوئی بھلا آدمی تھا۔ جو فوراً ہی جانے کو تیار ہو گیا۔ نعمان نے آ کر کار کا دروازہ کھولا اور بولا۔

بیٹے کار خراب ہو گئی ہے تم ٹیکسی میں چلی جاؤ اور

اور اس بچی کو اس کے گھر پر اتارتی ہوئی چلی جانا۔

نعمان کی نظر شعاع پر پڑی تو وہ چونک سا گیا، وہ کتنے جانے پہچانے انداز میں گھبرائی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اور شعاع کو بھی اس سفید بالوں والے وجیہہ انسان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہوئی، لیکن وہ نعمان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اور بھی گھبرا گئی اور بولی۔

جی —— جی آپ کا شکریہ، میں بس سے چلی جاؤں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔

لبنیٰ نے کہا

یہاں سے کوئی بس نہیں گزرتی آپ تکلف نہ کریں اور اب آجائیں۔

شعاع بمشکل تمام کار سے اتری۔ درختوں کے ٹپکتے پتوں سے کئی بوندیں اس کے سنہری بالوں پر پڑیں اور پھنس کر رہ گئیں۔

نعمان نے دیکھا کہ کار سے اترنے والی لڑکی کے کپڑے معمولی تھے، گو اس نے سلیقے سے پہن رکھے تھے مگر وہ کافی استعمال شدہ تھے۔

نعمان نے ٹیکسی میں انہیں بٹھاتے ہوئے کہا

بیٹی جاتے ہی صمد کو ٹیلی فون کر کے بتا دینا۔ میں اتنی دیر اس کا یہاں انتظار کروں گا

لبنیٰ نے کہا

جی بہت اچھا ابو، خدا حافظ۔

اور ہاں تم لوگ کھانا کھا لینا، مجھے دیر ہو جائے گی بس جاؤ اب، دیر نہ کرو۔

شعاع دھیرے سے بھی شکریے کا رسمی لفظ نہ کہہ سکی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی کہ یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے کہ اس کا باپ ہے جو اس سے اتنی محبت کرتا ہے۔ اس کا دل بھر بھر کر آرہا تھا کہ لبنیٰ بولی۔

آپ کا گھر کس طرف ہے۔

شعاع نے ہاتھ سے سامنے اشارہ کر دیا۔ سیدھی سڑک کی طرف۔

لبنیٰ پھر کہنے لگی۔

آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ میں آپ کو ڈرائیور کے ساتھ

کار میں گھر پہنچوا دوں گی۔ ذرا چائے وغیرہ پی کر چلی جایئے گا۔ کیا خیال ہے بارش تو رک ہی گئی ہے۔

لبنیٰ کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ شعاع اس وقت ناکافی کپڑوں میں تھی اور سردی محسوس کر رہی تھی۔ مگر شعاع نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

جی نہیں، میں اپنے گھر جاؤں گی۔

لبنیٰ فطرتاً اعلیٰ ظرف لڑکی تھی۔ وہ شعاع کے سخت لہجے میں بات کرنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ شعاع کا گھر قریب آگیا تھا، وہ دو بنگلے پہلے ہی اتر جانا چاہتی تھی، اس لئے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بولی۔

بس یہاں روک دیں۔

ٹیکسی ڈرائیور رک گیا تو شعاع اترتے ہوئے لبنیٰ کی طرف دیکھنے لگی۔ لبنیٰ نے مسکرا کر کہا۔

خدا حافظ۔

اور شعاع بھی مسکرا کر بولی۔

شکریہ، افسوس میں آپ کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتی۔

کوئی بات نہیں باہر سے تو دیکھ لیا۔

اور شعاع نے دل میں کہا۔

خوب دیکھ لیا

اور

لبنیٰ نے دیکھا کہ اس موہنی سی لڑکی کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی دکھ تھا

ٹیکسی مڑی اور جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی شعاع دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پلٹ کر اس بنگلے کی طرف دیکھا جس کے سامنے اتری تھی۔

بے حد خوبصورت اور جدید طرز کا سفید بنگلہ جس کے لان میں لگے ہوئے پھول اور پودے بارش میں نہانے کے بعد مسکرا رہے تھے۔ شعاع ذرا کیچڑ سے کپڑے بچا بچا کر چلنے لگی اور ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی۔

اچھا ہوا نا میں نے لبنیٰ سے یہ نہیں کہا کہ میرے گھر چلو۔ اگر وہ آ جاتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میری ماں نے دوسری شادی کر رکھی ہے اور میں تو خود اس گھر میں مہمانوں کی طرح رہتی ہوں۔

پھر شعاع کا ذہن لبنیٰ کے باپ کی طرف مڑ گیا اور وہ اپنے ذہن میں اپنے باپ کے ہیولے بنانے لگی۔ اسی دھن میں وہ شائد گھر سے آگے ہی نکل جاتی مگر دروازے کے عین سامنے اس کا پاؤں چھپ سے پانی میں جا پڑا اور وہ اپنے خیالوں کے دائرے سے نکل آئی۔ میمونہ بیگم کی جھلک برآمدے میں نظر آئی تو شعاع نے ہونٹ سکوڑ لیے اور بڑی بے دلی سے سلام کرتی ہوئی اندر چلی گئی اور سیدھی اپنے کمرے میں جا پہنچی۔ ٹھنڈے یخ کمرے میں جا کر اسے اور بھی کوفت ہوئی۔ اس کا دل چاہا کاش وہ لبنیٰ کے ہاں چلی گئی ہوتی تو وقت پاس ہو جاتا۔

میمونہ بیگم نے آ کر چائے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ میمونہ بیگم چند لمحے کھڑی رہیں لیکن شعاع نے کوئی توجہ نہ دی اور کتابیں ٹھیک طرح رکھتی رہی۔ نہ معلوم کیوں وہ بچپن ہی سے میمونہ بیگم سے خائف رہتی تھی۔ میمونہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ شعاع نے ان کی

بڑبڑاہٹ کی طرف کان لگا دیئے اور خواہ مخواہ ہی اس کے کان بولنے لگے۔

باپ جیسی، باپ جیسی۔

شعاع اوندھے منہ پلنگ پر جا پڑی اس کی آنکھیں سلگتی رہیں مگر آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا اس کا جی جلتا رہا اور وہ جی ہی جی میں اپنے باپ سے نفرت کرتی رہی اور اسی عالم میں نیند آ گئی۔

لبنیٰ گھر پہنچی تو اس کے ذہن میں شعاع کی آنکھوں کا اضطراب پوری طرح نمایاں تھا مگر وجہ واضح نہ تھی۔ اسے ٹیکسی میں آتا دیکھ کر حنا پریشانی کے عالم میں بھاگی اور لبنیٰ کے سلام کے جواب میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

امی پلیز، ایک منٹ ذرا کرایہ تو دے لوں۔

اسی لمحے اسے صمد نظر آیا تو وہیں سے پکاری۔

صمد میں تمہیں ہی دفتر فون کرنے والی تھی، تم اسی ٹیکسی میں چلے جاؤ، ابو کی کار خراب ہو گئی ہے ٹیکسی والے کو وہ جگہ معلوم ہے۔

حنا بولی۔

پاگل ہی ہو گئی ہو بالکل۔ صمد دوسری گاڑی لے جائے گا۔ تمہارے ابو آ جائیں گے صمد گاڑی ٹھیک کروا لے گا۔

امی میرا مطلب تھا ذرا ٹیکسی والے کا بھلا ہی ہو جاتا، بارش کی وجہ سے ذرا۔ ۔ ۔

حنا ہنس پڑی اور بولی۔

ٹھیک ہے صمد تم ٹیکسی میں ہی چلے جاؤ اور صاحب سے کہنا اسی ٹیکسی میں گھر آ جائیں کہیں رکیں نہ ہم کھانے پر انتظار کریں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صمد کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ بہرحال سر ہلا کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور بولا۔

چلو بھائی، چھوٹی بی بی کی تو ہر بات نرالی ہے۔

صمد کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی نعمان اسی ٹیکسی میں گھر آگیا۔ حنا نے محسوس کیا کہ وہ کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ کھانے پر بچے ہنستے بولتے رہے۔ صرف لبنیٰ اور حنا نے نعمان کی طبیعت کی تبدیلی کو محسوس کیا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ نعمان نے کھانا بھی کچھ یوں ہی سا کھایا اور آرام کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حنا نے نوکروں کو کھانا دیا۔ بچوں کو آرام کرنے کی تلقین کی اور بوا سے کہا کہ موسم کے مطابق شام کی چائے کے لئے ڈش تیار کرے۔ مگر اس تمام وقت اس کا دل نعمان کی طرف لگا رہا۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ نعمان کا مزاج اس طرح کا ہوا تھا۔ اسے جب بھی پرانی باتیں یاد آتیں وہ یوں ہی ہو جاتا۔ ایسے حالات میں حنا ایک محبت کرنے والی بیوی کی طرح شوہر کے مزاج سے خوب واقف ہو، اس کو تسلیاں دیا کرتی تھی۔

نعمان اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتا تھا اور اس طرح اس کا دل ہلکا ہو جاتا اور وہ جلد ہی ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اس دن بھی حنا جانتی تھی کہ یقینی ایسی ہی بات ہے، ایسا ہی معاملہ ہے، ورنہ اس نے نعمان کو کبھی کاروبار کے بارے میں پریشان ہوتے دیکھا تھا۔

کام سے فارغ ہو کر حنا پہلے لبنیٰ کی طرف گئی کیونکہ وہ لاپرواہ سی لڑکی تھی۔ لبنیٰ نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول رکھی تھیں اور سرد ہوا کمرے میں سرسراتی پھر رہی تھی اور خود لبنیٰ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

یہ کیا ہو رہا ہے۔

حنا نے اندر جا کر کھڑکیاں بند کرتے ہوئے کہا۔

لبنیٰ نے احتجاجاً ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر کہا

امی ———— امی پلیز، دیکھئے تو کتنا اچھا موسم ہے۔

اور کسی بیماری کا پیش خیمہ بھی۔

حنا نے اسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا

چلو اب آرام کرلو۔

حنا نے واپس جانے کو قدم بڑھائے ہی تھے کہ لبنیٰ نے کہا

امی، ابو آج کچھ پریشان سے ہیں۔

حنا مسکرا کر بولی۔

کوئی بات نہیں ابھی ٹھیک ہو جائیں گے، انسان ہی ہیں نا، یادیں بھی تو تنگ کرتی ہیں۔

لبنیٰ اٹھ کر بیٹھ گئی اور لاڈ سے بولی۔

امی کبھی ان یادوں کی کہانی مجھے بھی تو سنائیے۔ دھندلی دھندلی شکلیں تو میرے ذہن میں بھی ہیں۔ دادی اماں، سیما پھوپو اور

حنا نے بات پوری کی۔

اور ائی ———— بیٹی دوری سے رشتے ٹوٹ نہیں جایا کرتے۔ ذرا اور بڑی ہو جاؤ گی تو ہم دونوں پرانی باتیں کیا کریں گے۔

پیاری امی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لبنیٰ حِنا سے لپٹ گئی۔ اسے اپنی امی کی یاد کبھی نہیں آتی تھی۔ امی لفظ کے ساتھ
اس کے ذہن میں حِنا کی صورت آجاتی تھی۔

اچھی امی آپ کو میری بات محسوس تو نہیں ہوئی۔

پاگل ہو بالکل، چلو اب آرام کر لو۔

لبنیٰ بستر پر جا لیٹی اور حِنا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بارش پھر شروع ہو گئی لیکن اب دھیمی دھیمی سی، نرم نرم آہٹ لیے گر رہی تھی۔ نم زمین کو اور نمی بخش رہی تھی۔

حِنا نے جا کر دیکھا۔ نعمان سو گیا تھا۔ اس کے سامنے کے سفید بالوں کی لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر بکھر گئی تھی اور چہرے پر دنیا جہان کی تھکن جم کر رہ گئی تھی حِنا کا دل بھر آیا۔ اس نے آہستگی سے نعمان کے ماتھے پر سے بال ہٹائے اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ یہ شخص اس کا شوہر تھا جو اتنے سالوں سے رفاقت کے باوجود پرانی یادوں کے بھنور میں سے نہ نکل سکا تھا۔

حِنا نے اپنی اون سلائیاں اٹھائیں اور دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بادل اور گھر آئے تھے اور گرج بھی رہے تھے۔

نعمان شام ڈھلے تک سوتا رہا، بچوں نے چائے اس کے بغیر ہی پی۔ نعمان کی آنکھ کھلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نورات کے قمقمے جل اٹھے تھے اور حِنا کی آواز باہر سے آرہی تھی۔ نعمان غور سے اس کا سنتا رہا اور پھر مسکرا اٹھا۔

یہ حِنا ہی تھی جس نے اس کی سونی زندگی میں آکر اسے نیا رنگ دیا تھا۔

اتنے میں حِنا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اب باوقار سی عورت بن گئی تھی۔ نعمان مسکراتے دیکھ کر حِنا کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جلدی سے اس کے قریب آگئی اور اس کا ماتھا چھو کر بولی۔

طبیعت کیسی ہے؟

نعمان نے کہا۔

ٹھیک ہوں۔

اٹھئے پھر چائے پی لیں، منگواؤں؟

منگوالو۔ نعمان اٹھ کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

حِنا نے آواز دی، فوراً ہی لڑکا چائے لے آیا۔

نعمان باتھ روم سے آگیا اور حِنا نے اسے بھاپ اگلتا چائے کا کپ دیا نعمان کا موڈ خاصا درست ہو گیا تھا۔ دراصل اس دن کا نقش دیر پا تھا۔ پھر بھی نعمان نے کہا۔

معلوم ہے آج کیا ہوا۔

حِنا ہمہ تن گوش ہو گئی اور بولی

کیا ہوا۔

نعمان نے ایک نظر حِنا پر ڈالی اور بولا۔

آج لبنیٰ کو لینے میں اس کے کالج گیا تھا، وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی۔ میں نے لبنیٰ سے کہا اس لڑکی کو بھی بٹھا لو، وہ بھی بیٹھ گئی۔ شائد لبنیٰ سے اس کی واقفیت نہ تھی ورنہ لبنیٰ خود کہہ دیتی بہرکیف راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تو میں نے انہیں ٹیکسی دلوادی اور لبنیٰ سے کہا کہ اس لڑکی کو اس کے گھر تک چھوڑ کے آئے۔

نعمان خاموش ہو گیا۔ حِنا غریب کے ذرا بھی پلے نہ پڑا کہ یہ کونسی اہم بات تھی۔ وہ پوچھنا چاہ ہی رہی تھی کہ نعمان بولا۔

معلوم نہیں کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے غزالہ یاد آگئی۔ اس میں غزالہ کی بہت جھلک تھی۔

حِنا افسردہ سی ہو گئی۔ اب اسے نعمان کی اداسی کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

غزالہ آپ کی بیوی تھی، اسے یاد کرنا کوئی برائی نہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس کے باوجود آپ نے کبھی ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش نہ کی؟ نہ اپنی بچی کی کوئی خبر لی۔ حالانکہ آپ چاہتے تو اسے لا سکتے تھے، مگر آپ نے ادھر کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

نعمان نے کہا

نہیں حِنا یہ نہ سمجھو کہ مجھے اپنی بچی یاد نہیں آتی، وہ اس لئے بھی بہت یاد آتی ہے کہ ایک بار بھی اسے میں نے اپنی پریشانی اور تڑپ کے عالم میں دیکھ لیا ہوتا تو صبر آجاتا مگر انہوں نے اسے مجھ سے چھپا کر رکھا تھا۔ خیر یہ کہو بچے کیا کر رہے ہیں۔

حِنا نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھیل رہے ہیں، کہئے تو بھیجوں۔

ہاں بھیج دو، ذرا ان کے اسکول کی رپورٹ بھی ان سے سن لوں، اور سنو لبنیٰ سے کہنا ذرا پڈنگ خود تیار کر دے۔ سہیل رات کے کھانے پر ہمارے ساتھ ہوگا۔

حنا نے مسکرا کر کہا۔

کہہ دوں گی مگر خدارا کسی کو کھانے پر بلایا کریں تو پہلے سے اطلاع کر دیا کریں۔

نعمان بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

کیوں کیا ہوا جو پکے گا وہ بھی کھائے گا، گھر کا ہی فرد سمجھو، لبنیٰ تعلیم سے فارغ ہو لے تو میں فوراً ہی ان کی شادی کر دوں گا۔

حنا نے کہا۔

پھر بھی، وہ کیا سوچے گا۔

نعمان نے کہا

کچھ نہیں سوچے گا اور ہاں سنو، کل اس کے والد کا ٹیلی فون آیا تھا، وہ منگنی کرنا چاہتے ہیں ——— ذرا لبنیٰ سے پوچھ لینا۔

حنا نے جواب دیا۔

بے فکر رہئے۔ لبنیٰ میری بیٹی ہے اس کی طرف سے کوئی انکار نہ ہوگا، سمجھے آپ۔

نعمان نے خوش ہو کر کہا۔

گڈ ۔۔۔۔ تو میں ان سے کہتا ہوں ان کی بیگم تم سے مل کر منگنی کی تاریخ طے کریں۔

حنا بولی۔

ٹھیک ہے۔

سہیل، نعمان کے ایک عزیز دوست کا بیٹا تھا۔ باپ کا سارا کاروبار سنبھالتا تھا بے حد وجیہہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ بچپن سے ہی نعمان کے ہاں آتا جاتا تھا مگر جوانی تک وہ اپنا وہی انداز رکھے ہوئے تھا۔

لبنیٰ سے اس کی شادی کی بات طے تھی مگر جب بھی دونوں کا سامنا ہوتا وہ عام دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے۔

سہیل ذرا زیادہ متاثر تھا، مگر لبنیٰ محبت وغیرہ کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ نعمان نے ہاں کرنے سے پہلے لبنیٰ سے اس کی مرضی معلوم کی۔ اسے کوئی اعتراض ہوتا تو کرتی۔ اس لئے حنا نے اس وقت اتنے اعتماد سے بات کی تھی۔

رات کو سہیل کھانے پر موجود تھا۔ نعمان اسے دیکھ کر بہت مسرور تھا۔ کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ نعمان کا وقت اچھا خاصا گزر گیا تھا۔ رات بہت ہی ڈھل گئی تو سہیل نے جانے کی اجازت چاہی نعمان نے اسے رخصت کیا اور اس کے جانے کے بعد نعمان نے اس کے باپ سے ٹیلی فون پر معذرت چاہی کہ سہیل کو بہت دیر تک روکے رکھا۔

حنا نے مسکرا کر پوچھا۔

بھلا فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

نعمان نے کہا۔

اس لئے ضرورت تھی کہ سہیل نوجوان ہے اس کا باپ بدگمان بھی ہوسکتا ہے۔ کہ گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات تک لڑکا کہاں رہا۔ اب اسے اطمینان ہو گیا ہو گا اور سہیل باز پرس سے بچ جائے گا۔

حنا کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔

بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں۔

کچھ ایسا ہی ہے دیکھ لو، تمہاری صحبت کا اثر ہے۔

شعاع کی آنکھ کھلی تو بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ شعاع نے آہٹ محسوس کی مگر مڑ کر نہ دیکھا۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سرد ہاتھ نے اس کا چہرہ چھوا۔ شعاع نے دیکھا وہ اس کی ماں تھی۔ غزالہ بیگم۔

بے وقت کیوں سو گئی تھیں۔

شعاع نے کہا۔ ایسے ہی۔

شعاع پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کالے بادلوں نے آسمان ڈھک لیا تھا اور شعاع کے کمرے میں تاریکی در آئی تھی۔

غزالہ بیگم نے پوچھا۔

بتی جلا دوں؟

شعاع نے کہا۔

نہیں، یونہی ٹھیک ہے۔

غزالہ بیگم نے کہا۔

اندھیرا سا ہو گیا ہے۔

شعاع نے کہا

مجھے اندھیرا پسند ہے۔

غزالہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر پلنگ پر رکھا ہوا پیکٹ اٹھا کر اس کے پاس لائی اور بولی۔

یہ لو۔

شعاع نے پوچھا۔

کیا ہے؟

غزالہ بیگم نے کہا۔

تمہارے لئے کپڑے ہیں۔

شعاع نے ہاتھ لگائے بغیر پوچھا "کون لایا ہے؟"

غزالہ بیگم نے کہا۔ وہ، میرا مطلب ہے ہم لائے ہیں۔

"ہم کون؟" شعاع کٹھور بن کر بولی۔

غزالہ بیگم نے کہا "تمہارے ابا اور میں"

شعاع نے کہا۔

وہ میرے ابا نہیں افتخار صاحب ہیں، وہ میرے لئے کپڑے کیوں لائے ہیں ان کے پیسوں کی خریدی ہوئی کوئی چیز نہ لوں گی۔

غزالہ کا دماغ گھوم گیا بولی۔

اور جو ان کے خرچ کا تیار کیا ہوا کھانا کھاتی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع نے پوچھا۔ "گھر کا خرچ افتخار صاحب کے ذمے ہے۔"

جی بالکل، تمہیں بھلا کیا خبر ہو گی۔ میں کوئی نوکری کرتی ہوں۔

شجاع سُن ہو کر رہ گئی کہ جس شخص سے وہ کوئی رشتہ ماننے کو تیار نہ تھی اس کے پیسوں کے خرچ پر وہ پل رہی تھی۔ شجاع کو بہت صدمہ ہوا۔ پھر ہمت جمع کر کے بولی۔

آپ نے یہ بتا کر مجھ پر احسان کیا ہے یہ کپڑے واپس لے جائیے میں خود نوکری کر دوں گی اور اپنا خرچ چلاؤں گی۔

غزالہ نے پھر اسے پیار محبت سے بہلانے کی کوشش کی مگر شجاع پتھر کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ تنگ آ کر غزالہ واپس چلی گئی۔ میمونہ بیگم حسبِ عادت کان لگائے سب کچھ سن رہی تھی۔ غزالہ کے جانے کے بعد شجاع کو میمونہ بیگم کے بڑبڑانے کی آواز دیر تک آتی رہی اور آواز گونجنے لگی۔

باپ جیسی

باپ جیسی

جیسا باپ ویسی بیٹی۔

شجاع بڑبڑائی۔ نہیں میں باپ جیسی نہیں ہوں۔ میری علیحدہ شخصیت ہے۔ میں یہ دکھا دوں گی۔

دوسرے دن اس نے یونیورسٹی جاتے ہی اپنی ساتھی لڑکیوں سے کہا کہ اگر کسی کی بہن بھائی کو ٹیوشن کی ضرورت ہو تو اسے بتائیں یہ سب کہہ کر اس کا دل ذرا مطمئن ہوا نہ جانے اعتماد کہاں سے اس کے اندر آ بیٹھا تھا۔ اس لئے جونہی اس کا سامنا لبنیٰ سے ہوا وہ کھل کر مسکرائی۔ جواباً لبنیٰ اس کے پاس آ گئی۔ اور دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں

دورانِ گفتگو لبنیٰ نے بھی غور کیا کہ شجاع کا لباس کافی پرانا ہے، گو صاف ستھرا اور استری شدہ تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے میں انجانی سی کشش محسوس ہوئی تھی۔ اس لئے لبنیٰ کو ذرا صدمہ سا ہوا۔ اسی لمحے دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

آپ کا نام کیا ہے؟

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں اور اجنبیت کی دیوار پل میں ڈھے گئی۔

لبنیٰ نعمان ——— اور آپ کا

شجاع

بس

ہوں

والد کا نام ساتھ نہیں لگاتیں۔

نہیں شجاع صرف شجاع ہوتی ہے، خواہ چاندنی کی یا دھوپ کی۔

ماشاء اللہ۔

لبنیٰ کو اس سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوئی۔ شجاع نے اس سے اس کے گھر، ماں باپ، بہن بھائیوں سب کی باتیں پوچھ ڈالیں، لبنیٰ اسے تفصیل سے بتاتی رہی اور شجاع کا تصوراتی ذہن ان نقوش کو ابھارنے لگا۔ اسی لئے جب لبنیٰ نے کہا کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتائیے تو شجاع نے کہا۔

عزیز بہن فی الحال مجھے اس سکھی گھر کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے دیں۔ انشاء اللہ بعد میں میں بھی بتاؤں گی۔

لبنیٰ ہنس دی۔ سارا دن وہ اکٹھی رہیں اور دوستی ہو گئی۔ گو لبنیٰ نے محسوس کیا کہ شجاع کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکھڑسی ہے۔ بعض باتوں کا جواب روکھے پن سے دیتی ہے پھر بھی اسے شعاع بہت پسند آئی
یوں بھی اب شعاع کی آنکھوں میں اضطراب نہیں عزم تھا۔ دونوں کے پیریڈ ختم ہوئے تو
لبنیٰ نے اسے کہا۔

"میرے ساتھ چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

شعاع نے ایک لمحہ سوچا اور کہا۔ نہیں لبنیٰ مجھے کام ہے اور یوں بھی میں بس پر جاؤں گی
دیکھو موسم آج کتنا اچھا ہے۔

"تمہاری مرضی" لبنیٰ جاتی ہوئی شعاع کو دیکھتی رہی اور پھر مسکرا دی۔ نہ جانے کیوں اسے
محسوس ہوا کہ شعاع کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔

اور شعاع واقعی معمولی لڑکی نہ تھی۔

اس نے جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کرنے کا عزم بھی کیا تھا۔

شعاع نے دوسرے دن سے ہی اخبار میں ضرورت ہے کا کالم پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ گھر سے صبح ہی نکل آتی اور سیدھی لائبریری میں جا کر اخبار دیکھتی پھر پڑھائی کا وقت
شروع ہو جاتا۔ لبنیٰ سے اس کی دوستی خاصی ہو گئی تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے خوب گھل مل
کر باتیں کرتی اور بعض اوقات اس کی باتوں کا جواب بھی نہ دیتی ——— بولنے پر آتی تو بولے
چلی جاتی اور جو چپ ہوتی تو لگتا منہ میں زبان نہیں ہے۔

لبنیٰ بہت حد تک اس کی طبیعت سے واقف ہو چکی تھی۔

شعاع نے کبھی اس سے وقفے میں کھانے کی دعوت قبول نہ کی۔ بہت دنوں سے اس کے
پاس جیب خرچ سے بچے ہوئے پیسے بنک میں پڑے تھے۔ شعاع نے نکلوا لئے اور بہت سوچ
سمجھ کر خرچ کرنے لگی۔ تنہا بیٹھی وہ ہر وقت سوچتی رہتی مستقبل اس کے سامنے تاریک سا تھا۔

وہ کیا کرے کیسے نوکری تلاش کرے۔ جن لڑکیوں سے اس نے ٹیوشن کا کہا تھا۔ انہوں نے ابھی
تک جواب نہ دیا تھا۔ اس لئے اخبار کا سہارا تھا۔ مگر ابھی تک وہ ناکام تھی۔

اسی طرح شب و روز گزرنے لگے۔

ایک صبح اس نے بیکنگ گرلز کی ضرورت ہے کے عنوان کو پڑھا اور نظر انداز کر دیا۔ وہ
اشتہار کئی دن سے مسلسل آ رہا تھا۔ ایک دن اس نے درخواست دے ہی ڈالی۔ اس بات کو
وہ تقریباً بھول ہی چلی تھی کہ ایک دن اسے انٹرویو لیٹر ملا۔ اسے درخواست کے جواب میں
انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔

شعاع نے پہلے تو سوچا کہ نہ جائے پھر سوچا کہ کیا حرج ہے تجربہ ہی سہی معلوم تو ہو جائے
گا کہ انٹرویو کس طرح ہوتے ہیں۔

پھر ایک دن وہ ایک لمبے برآمدے میں لڑکیوں کی طویل قطار سے ہٹ کر کھڑی تھی۔ اس
کے سامنے ایک کمرہ تھا جس کے دروازے پر تختی لگی ہوئی تھی۔

سیٹھ نعمان۔

شعاع نے عجیب سے احساس سے ہونٹ سکوڑ لئے۔

اس نے سوچا۔

بعض لوگ کتنے خود پسند ہوتے ہیں اپنے نام کے ساتھ خود ہی سیٹھ کا لفظ لکھ لیتے ہیں
اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب قطار ختم ہوئی اور وہ خود اب انٹرویو کے لئے کمرے میں
داخل ہو رہی تھی۔

انٹرویو نعمان کا ذاتی ملازم نور الٰہی لے رہا تھا۔ کمرہ نعمان کا تھا اور وہ خود بھی کمرے
میں اس لئے موجود تھا کہ ملازم کسی سے سفارش وغیرہ کی بنا پر رعایت نہ کر سکے نعمان صرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرورت مندوں کو ملازمت دینا چاہتا تھا۔ وقت گزارنے والی لڑکیوں کو وہ اہمیت
دیتا تھا۔ اور یوں بھی مالک کی ذرا سی لاپرواہی سے ملازم اور زیادہ لاپرواہی کا ثبو
دینے لگتے ہیں۔ نورالٰہی بہت ذمہ دار لڑکا تھا اور نعمان دیکھ رہا تھا کہ وہ بہت سوچ
کر سوال کرتا ہے۔ کٹے ہوئے بالوں والی کرسچین لڑکی کے جانے کے بعد دوسری نے ا
میں کچھ دیر ہی لگا دی تھی۔ نعمان نے مسکرا کر نورالٰہی کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیا
منہ دھونے کے لئے غسل خانے کی طرف جانے کو اٹھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سینہ
والی لڑکی کی لمبی سنہری چوٹی کے بال دروازے کے ہینڈل میں پھنس گئے تھے۔ نعمان غیرا
طور پر آگے بڑھا ہی تھا کہ لڑکی نے بڑی مہارت سے بال چھڑائے اور اب وہ میز کی طر
آ رہی تھی۔ بچے تلے قدموں سے ـــــ

نعمان کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

اس کے دل نے کہا

یہ کون ہے؟

یہ جانا پہچانا انداز کس کا ہے؟

یہ انداز وہ پہلے کہاں دیکھ چکا ہے؟

نعمان کا ذہن اس دن کا واقعہ بھول چکا تھا جب اس نے لبنیٰ کے ساتھ شعاع
دیکھا تھا۔ مگر شعاع نعمان کو فوراً پہچان گئی۔ اسے کافی حیرت سی ہوئی۔ لبنیٰ طبیعت کے
سے بہت سادہ تھی۔ شعاع کو دکھ سا ہوا کہ اتنی سادہ سی لڑکی کا باپ اتنا خودپسند
ہے کہ بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ خود ہی سیٹھ لکھتا ہے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر عجیب
نگاہ نعمان پر ڈالی، مگر یہ دیکھ کر اسے بڑی کوفت ہوئی کہ نعمان اس کی طرف بڑے غور

دیکھ رہا تھا۔ شعاع کے ماتھے پر ناگواری کا بل ابھرا اور اس کا جی چاہا وہ واپس چلی جائے
نعمان بھانپ گیا کہ لڑکی نے اس کا یوں دیکھنا بری طرح محسوس کیا ہے، وہ دل ہی دل میں
شرمندہ سا ہو کر باتھ روم میں چلا گیا۔

شعاع کھڑی رہی۔ نورالٰہی نے کہا۔

تشریف رکھیئے۔

شعاع بیٹھ گئی۔ گو اس کا دل چاہتا تھا کہ واپس چلی جائے۔ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا
کہ وہ وہاں نوکری نہ کرے گی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے، وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ سوال ہوا۔

آپ کی تعلیم؟

غیرارادی طور پر شعاع بولی۔

پرائمری پاس۔

ہوں۔ آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں؟

غیر ضروری سوال ہے۔

جی نہیں بے حد ضروری ہے بلکہ بنیادی سوال ہے۔

کیوں ضروری کیوں ہے؟

اچھا یہ بتائیے آپ نوکری کیوں کرنا چاہتی ہیں۔

"جی نہیں، میں قطعاً یہ نوکری نہیں کرنا چاہتی، سمجھے آپ"

شعاع نے ہکا بکا نورالٰہی کے سامنے سے اپنی درخواست اٹھالی اور تیزی سے
باہر نکل گئی۔

نعمان غسل خانے میں بہت دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ ایسا انداز ایسی صورت وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے کہاں دیکھ چکا ہے۔ اسے غزالہ بہت شدت سے یاد آرہی تھی۔شادی سے پہلے غزالہ کے ان اندازوں پر فدا تھا اور شادی کے بعد وہ منتظر رہتا تھا کہ غزالہ کبھی اُسے حیرت سے دیکھے، کبھی سوچ میں ڈوبی نگاہ اٹھا کر دیکھے۔یہ یاد کرتے کرتے نعمان کو بہت سے گزرے ہوئے ستم یاد آ گئے۔اس کی نظروں کے سامنے وہ سماں گھوم گیا جب وہ اور غزالہ ایک تھے۔دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے غزالہ کہا کرتی

نعمان اگر میں مر گئی تو کیا روؤ گے؟

نعمان اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

میں تمہیں مرنے ہی نہ دوں گا۔

ملک الموت سے لڑو گے کیا؟

بالکل لڑوں گا۔

اگر وہ نہ مانا اور مجھے لے کر ہی ٹلا ——— تو؟

تو کھدی ہوئی قبر میں جا لیٹوں گا اور جب تک تم دوبارہ زندہ نہ ہو جاؤ گی، لیٹا ہی رہوں گا۔

غزالہ کا دل دہل جاتا اور وہ جلدی سے نعمان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی۔

کتنی بُری بُری باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔

نعمان روٹھ کر کہتا۔

اور تم تو بہت اچھی باتیں کر رہی ہو۔

وہ دونوں چند لمحوں تک خفا خفا سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر مسکرا دیتے

سارے گلے شکوے دور ہو جاتے، وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے کہتے تھے۔ہم ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔

نعمان نے آنسوؤں کی دھند کے پار سفید بالوں والے شخص کو آئینے میں دیکھا تو اس کے دل سے آواز نکلی۔

نعمان تم نہ صرف غزالہ کے بغیر جی رہے ہو بلکہ مدت سے اس کی خبر بھی نہیں لی۔

نعمان کے ذہن سے یہ بات قریباً نکل ہی چکی تھی کہ پرانی باتیں کیوں اس کے ذہن میں آ گئی ہیں۔وہ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔اس نے منہ صاف کرتے ہوئے آئینے میں غور سے دیکھا کہ کہیں آنکھیں سوجی ہوئی تو نہیں ہیں۔

ذرا ذرا سی سُرخی جھلکنے لگی تھی۔اس نے چہرے پر زبردستی کی بشاشت لا کر دروازہ کھولا۔کمرے میں نور الٰہی کو دیکھ کر اسے فوراً اس لڑکی کی یاد آ گئی۔لیکن غزالہ سے اس درجہ مشابہت کے باوجود بھی نعمان کے ذہن میں بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس کی ایک بیٹی غزالہ کے پاس بھی ہے وہ ہر لمحے شعاع کو یاد رکھنے کے باوجود اس اجنبی لڑکی کو اس شک سے نہ دیکھ سکا کہ وہ اس کی بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔

نعمان نے پوچھا۔

کیوں بھئی نور، ہو چکے انٹرویو؟

نور الٰہی نے پہلے سر ہلایا اور بولا۔

جی صاحب ہو گئے ہیں، زیادہ تر لڑکیاں ضرورت مند ہیں۔

تو سب کو رکھ لو۔

جی اچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نورالٰہی درخواستیں چھانٹنے لگا۔ جن پر اس نے خاص نشان لگا رکھے تھے۔

نعمان اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند دنوں سے اس کے چھوٹے بچے کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نعمان نے گھر پر فون کر کے اس کی طبیعت دریافت کی۔ حِنا نے اسے بچے کی طبیعت کی طرف سے اطمینان دلایا۔ مگر نعمان کے دل میں عجیب سی خلش تھی۔ اس نے چشمہ اتار کر ہتھیلی سے آنکھوں کو زور سے دبایا۔ درد کی عجیب سی لہر پیشانی تک دوڑ گئی۔ وہ بار بار آنکھیں دبانے لگا۔ نورالٰہی نے دو ایک بار نظریں اٹھا کر نعمان کی طرف دیکھا۔ آخر پوچھ ہی بیٹھا۔

صاحب طبیعت کیسی ہے۔

ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔

نعمان نے چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بولا۔

لسٹ بن گئی۔

جی ہاں یہ ہیں نام۔

نورالٰہی درخواستیں نعمان کے آگے رکھتے ہوئے بولا۔

نعمان نے درخواستیں اٹھا کر دیکھیں کُل نو لڑکیاں تھیں۔

ہوں، نو لڑکیاں ہیں تم آج ہی انہیں اطلاع دے دو کہ وہ جلد سے جلد کام پر آجائیں۔

جی بہتر۔

نعمان نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

نورالٰہی وہ لڑکی جو آخر میں آئی تھی کیا اس کی درخواست اس میں شامل ہے؟

نورالٰہی مسکرا دیا۔ وہ اب تک شعاع کے انداز پر حیران سا تھا بولا۔

نہیں نعمان صاحب، وہ لڑکی تو جیسے کسی سے لڑ کر آئی تھی میرے سوالوں کے جواب میں اس نے میرے ہاتھ سے اپنی درخواست چھینی اور بولی مجھے نوکری کی کوئی ضرورت نہیں اور چلی گئی۔ عجیب لڑکی تھی۔

نعمان نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہاں عجیب لڑکی تھی۔

جی صاحب۔؟

کچھ نہیں، تم اطلاع کے خطوط ٹائپ کرواؤ اور ذرا صمد کو بھی بھیجنا، دوائیں بھیجنا ہیں گھر

جی اچھا۔

نورالٰہی چلا گیا، تو نعمان بکھری ہوئی یادوں کو پھر سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا حالانکہ ان یادوں سے دل دکھتا تھا مگر پھر بھی ان میں انجانا سا مزا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع دفتر سے نکل کر سیدھی یونیورسٹی جانے کے لئے بس میں جا بیٹھی۔ غصے کے مارے اس کا ذہن کھول رہا تھا۔

بے وقوف، اسے کس نے ملازم رکھ چھوڑا ہے بھلا یہ سوالات پوچھنے والے ہیں۔

پھر اس کے ذہن کا رُخ پلٹا۔

توبہ توبہ دیکھنے میں لبنیٰ کتنی سادہ ہے مگر اس کے باپ کو تو دیکھو کتنا خود پسند ہے اپنے نام کے آگے خود ہی سیٹھ لکھتا ہے۔ بیٹی میں بہت نہیں تو تھوڑی سی خو بو ضرور باپ کی ہوگی۔ جبھی تو ہر تیسرے روز کہتی ہے، چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ کار کا رعب ڈالا ہے۔ بھلا میں اس سے دب جاؤں گی کیا۔ یہ سارے امیر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں دماغ ان کے آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ مگر جھک جھک کر یوں ملتے ہیں جیسے ان جیسا عاجز کوئی نہیں ہے۔

دراصل یہ لوگ اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ دیکھو ہم کتنے اچھے ہیں، غریبوں سے کیسا جھک کر ملتے ہیں۔ توبہ توبہ ایسے لوگوں سے تو میں کبھی نہ ملوں۔

شعاع دل ہی دل میں جلتی کڑھتی یونیورسٹی جا پہنچی۔ ماتھے پر سو سو بل ڈالے اس نے لبنیٰ کو نظر انداز کر دیا اور زور زور سے ہاتھ ہلاتی ہوئی سعدیہ کے پاس جا کر چیخی۔

کیا بات ہے؟

سعدیہ دہل کر بولی۔

توبہ شعاع کتنے زور سے چیختی ہو، تمہارے مطلب کی بات تھی۔

شعاع نے ماتھے پر اور بھی بل ڈال کر اسے دیکھا اور بولی۔

میرے مطلب کی کیا بات تھی۔

سعدیہ کو ہنسی آگئی۔ شعاع کا سرخ چہرہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ سعدیہ کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دی۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔

ہنس کیوں رہی ہو۔

تمہیں دیکھ کر۔

شعاع کو بھی ہنسی آگئی۔ صبح کی کوفت ذرا سی کم ہوئی تو اس نے سارا واقعہ سعدیہ کو سنا دیا۔ یہ وہ گول کر گئی کہ وہ شخص لبنیٰ کا باپ تھا۔ اس نے بات ختم کی تو سعدیہ بولی

"تمہاری الف لیلیٰ ختم ہو گئی ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں؟"

کرو

سعدیہ نے دیکھا لبنیٰ ان کی طرف آرہی تھی بولی۔

تمہاری دوست آرہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنے دو، تم بات کرو۔

تمہاری ٹیوشن کا انتظام ہوگیا ہے۔

شعاع تڑپ کر بولی۔

اللہ کی قسم، سچ کہو، کہاں۔

سعدیہ نے ایک کارڈ اس کے سامنے ڈال دیا اور بولی۔

یہ رہا پتہ، ایک پیاری سی لڑکی کو پڑھانا ہوگا۔ کب جاؤ گی؟

ابھی۔

ابھی؟

ہاں ابھی۔

شعاع کتابیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لبنیٰ قریب آگئی تھی۔ شعاع کے لئے یہ ذرا کٹھن تھا۔ نگاہ اٹھا کر لبنیٰ کو دیکھا اور بولی۔

ہیلو لبنیٰ!

لبنیٰ نے کہا۔

ہیلو، ذرا سنو۔

شعاع نے کہا۔

سوری، میں ذرا ضروری کام سے جا رہی ہوں۔

اور شعاع یہ جا وہ جا۔ لبنیٰ کا دل اس رکھائی پر ذرا دکھ سا گیا۔ وہ دُور جاتی ہوئی شعاع کو دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ گھر میں آج تک کسی نے اس کا دل نہ دکھایا تھا۔ ایک لڑکی اس کے دل کو بھائی تو وہ اتنی روکھی کہ بات بات پر اس کا دل

دکھاتی ہے۔ سعدیہ کی لبنیٰ سے علیک سلیک نہ تھی اس لئے وہ مزے سے گھاس پر بیٹھی تنکے چباتی رہی۔ لبنیٰ پلٹ گئی تو سعدیہ کو ذرا شعاع پر غصہ سا آگیا۔ پھر آپ ہی آپ وہ مسکرادی شعاع اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھتی تھی۔

شعاع نے کارڈ کو غور سے دیکھا اور پھر اس بڑی سی سفید کوٹھی کی طرف نگاہ ڈالی۔ پتہ وہی تھا، مگر پھر وہی امارت اور رُعب، اس کا دل چاہا وہ واپس چلی جائے مگر اس کے ذہن میں ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ نوکری بہرحال دولت والوں کے ہاں ہی مل سکتی ہے۔ اس جیسے لوگ تو نوکری کی تلاش ہی کر سکتے ہیں۔ شعاع نے گیٹ کے نیچے سے جھانک کر دیکھا، کوئی نوکر، کوئی چوکیدار نظر نہ آیا۔ پھر اس نے ذرا سا گیٹ کو دھکیلا وہ جیسے اشارے کا منتظر ہی تھا۔ یک دم کھل گیا۔

شعاع ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کنکریٹ کا بنا ہوا پکا راستہ برآمدے تک جا کر گھوم گیا تھا۔ شعاع نرم نرم قدموں سے اس پر چلتی گئی۔ جھکتے ہوئے برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے اس نے اپنے سفید نرم پیروں کی طرف دیکھا جن پر نرم مٹی کی تہہ جم گئی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر ان نشانوں کو دیکھا جو اس کے پیروں کے تھے۔ اور پھر اس نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کو ڈرتے ڈرتے دبایا، دُور کہیں گھنٹی ٹنٹنائی۔

کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ شعاع نے پلٹ کر لان میں لگے ہوئے پودوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی کہ آواز آئی۔

فرمائیے۔

شعاع اچھل کر رہ گئی۔ دروازے میں کھڑی خاتون نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور مسکرا کر رہ گئیں۔ یہ بکھرے بکھرے بالوں والی لڑکی کتنی پیاری ہے۔ اس کے دل نے کہا شعاع اس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑی تھی۔ چند لمحے یونہی کھڑی رہی پھر ذرا حواس میں آئی تو تھوک نگل کر بولی۔

جی مجھے سعدیہ نے بھیجا ہے۔

وہ دروازے کے ایک طرف ہو کر بولی۔

تشریف لے آیئے۔

شعاع نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ امیرانہ ٹھاٹ باٹ ہر بات سے ہر چیز سے عیاں تھا۔ کھڑے کھڑے بولی۔

آپ سعدیہ کو جانتی ہیں؟

اچھی طرح، آپ تشریف تو رکھیے۔

شعاع دھپ سے بیٹھ گئی۔ فوم کا نرم صوفہ زیادہ ہی نیچے دب گیا شعاع نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ عورت نے بڑے پیار سے اس کے بکھرے بالوں کی طرف دیکھا اور بولی۔

ٹیوشن کے لئے آئی ہیں نا، میری ہی بچی کو پڑھانا ہوگا۔

شعاع سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ عورت اُٹھی اور معذرت کرتے ہوئے اندر کہیں چلی گئی۔

اتنے بڑے کمرے میں شعاع تنہا رہ گئی۔ بہت دیر تک وہ سرخ قالین کو گھورتی رہی پھر اس کا دل چاہا کہیں بھاگ جائے۔ یہ سوچ کر وہ کھڑی ہو گئی لیکن اتنی دیر میں وہی عورت ٹرے میں چائے کا کپ لئے اندر داخل ہوئی۔ شعاع جلدی سے بیٹھ گئی۔ عورت نے تپائی اس کے قریب رکھی اور چائے کا کپ رکھتی ہوئی بولی۔

آپ تھکی ہوئی لگتی ہیں، اس لئے میں چائے لے آئی۔

شعاع عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

جی وہ... شکریہ... دراصل وہ

وہ بڑی شفقت سے بولی۔

میں نے آبگینہ کو اطلاع دی ہے وہ آتی ہی ہوگی۔ آبگینہ میری بیٹی کا نام ہے جس کے لئے آپ آئی ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

شعاع کو بھوک بھی ستا رہی تھی۔ اس لئے اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا اور چھوٹے گھونٹ لے کر پینے لگی۔ عورت خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ چائے پی چکی تو اس عورت نے کہا۔

میرا نام طیبہ ہے۔ میرے شوہر فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ آبگینہ کو ٹیوشن کی ضرورت ہے ویسے آپ کو زیادہ محنت نہ کرنی ہوگی۔ آبگینہ ماشاءاللہ بہت ذہین لڑکی ہے۔

شعاع سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کا دل موم ہوا جا رہا تھا۔ اس ماں کو اپنی بچی سے کتنی محبت ہے، اس کا باپ اسے کس قدر چاہتا ہوگا۔ ایک میری ماں ہے جس نے باپ بھی دیا تو سوتیلا۔

سوتیلا باپ ——— اور اب وہ مسز افتخار بن گئی ہیں۔

اور میرا باپ؟

وہ ظالم مرد جس نے مجھے دنیا کی ٹھوکروں میں تنہا چھوڑ دیا ہے اور خود معلوم نہیں کہاں غائب ہے۔

وہ کیسا باپ تھا۔

طیبہ بڑے غور سے اس کی سفید ساڑھی کے پھٹے ہوئے کنارے اور سر کے روکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنہری بالوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اس معصوم سی لڑکی کے چہرے پر جمی ہوئی
کی دھول دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا۔ شعاع کا چہرہ اندرونی کرب سے سرخ ہو رہا
طیبہ نے دیکھا وہ اپنے ہاتھ کی انگلی مسلے جا رہی ہے۔ آخر اس کی سوچوں کے ٹھہرے ہوئے
پتھر گرا۔ شعاع چونک گئی۔ طیبہ اس سے مخاطب تھی۔

بیٹی کیا بات ہے تم کچھ پریشان سی ہو۔

شعاع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

جی نہیں تو، بچی نہیں آئی آپ کی۔

آ جائے گی۔ سچ کہو تم پریشان ہو۔

شعاع خواہ مخواہ کو مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

جی نہیں، پریشان تو نہیں ہوں۔

طیبہ نے پوچھا۔

تمہارے والد صاحب کیا کام کرتے ہیں؟

غیر ارادی طور پر شعاع کے منہ سے نکلا۔

جی میرے والد نہیں ہیں۔

اوہ، والدہ ہیں؟

شعاع نے ایک پل سوچا اور بولی۔

جی نہیں میری والدہ بھی نہیں ہیں۔

طیبہ کے چہرے پر غم کے بادل سے لہرائے، اسے اس موہنی سی لڑکی پر بہت ا
آیا۔ بہت پیار سے بولی۔

رہتی کہاں ہو؟

جی رشتہ داروں کے ہاں رہتی ہوں۔ اب انشاء اللہ ہوسٹل میں رہوں گی۔

تنگ کرتے ہوں گے۔

جی ہاں۔

اتنی دیر میں آبگینہ آ گئی۔ اچھی خاصی چودہ پندرہ برس کی خوبصورت لڑکی تھی، ذرا چنچل سی۔
سلام دعا کے بغیر ہی بولی۔

ہائے امی، یہ میری استانی ہیں، مجھ سے بھی چھوٹی ـــــ اور اتنی پیاری ـــــ اور ہنسنے لگی۔

طیبہ بیگم نے غصے سے کہا۔

یہ کیا کھی کھی لگا رکھی ہے، آداب کرو آخر ٹیچر ہیں تمہاری۔

آبگینہ نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ملا کر کہا

اچھا تو آداب کرتی ہوں، لیجئے آداب۔

مگر امی یہ استانی نہیں میری باجی ہیں۔

شعاع مسکرا دی۔ آبگینہ نے کہا۔

کیوں باجی ٹھیک ہے نا؟

بالکل۔

کب سے پڑھانا شروع کریں گی۔

کہو تو ابھی سے شروع کر دوں۔

آبگینہ فوراً تیار ہو گئی، بولی۔

تو چلئے میرے کمرے میں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طیبہ بیگم شعاع کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھ رہی تھیں بولیں۔

نہیں بیٹی، کل سے شروع کرنا۔ تم ذرا جا کر میرا کالا پرس تو لا دو۔

آبگینہ پرس لینے چلی گئی تو طیبہ نے کہا۔

بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟

جی، شعاع۔

ماشاء اللہ، ایک بات کہوں۔

جی ضرور۔

برا نہ ماننا۔

جی نہیں فرمایئے تو۔

میں کہہ رہی تھی کہ اس اتنے بڑے گھر میں ہم میاں بیوی اور ہمارے دو بچے رہتے ہیں۔ بہت سے کمرے خالی پڑے رہتے ہیں۔ تم ہوسٹل میں جانے کی بجائے یہاں آ جاؤ، ہم تمہیں اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔

شعاع کو اس بات کی توقع بھی نہیں تھی۔ حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

جی نہیں شکریہ، میں عملی زندگی میں قدم رکھنا چاہتی ہوں، مجھے بہت کچھ کرنا ہے اس لئے میں ہوسٹل میں رہنا پسند کروں گی۔

اتنی دیر میں آبگینہ ماں کا پرس جھلاتے ہوئے آ گئی۔ طیبہ نے دو ایک بار پکڑنا چاہا۔ مگر آبگینہ زور سے جھلا کر آگے پیچھے کر دیتی۔ طیبہ نے گھور کر بیٹی کی طرف دیکھا تو اس نے مصنوعی ڈر سے پرس ماں کی گود میں رکھ دیا۔ اور کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی آ کر شعاع کے پاس بیٹھ گئی۔ طیبہ نے پرس کھول کر تین سو روپے نکالے اور آ کر شعاع کو دیتے ہوئے بولی۔

یہ ایڈوانس ہے، کل سے آ کر آبگینہ کو پڑھانا شروع کر دو۔

شعاع نے حیرت اور خوشی سے روپے پکڑے اور دو موٹے موٹے آنسو طیبہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ٹپکے، تو اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر شعاع کو کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور سینے سے لگاتے ہوئے اس کے روکھے بالوں کو چومتے ہوئے بولی۔

میری بچی تمہارے عزم اور حوصلے کے آگے مجبور ہوں۔ ورنہ تمہیں زبردستی اپنے پاس رکھ لیتی۔ پھر بھی میں آج سے یہی سمجھوں گی کہ آبگینہ اور نگینہ کے ساتھ مجھے اللہ نے تیسری بیٹی بھی دے رکھی ہے۔ تم ہوسٹل میں اپنا انتظام کرو۔ کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو، کوئی دقت ہو تو مجھ سے کہنا۔

شعاع کا دل اور بھی بھر آیا۔ آج تک غزالہ نے اسے سینے سے لگا کر کبھی تسلی کے دو بول نہ کہے تھے۔ آج ایک پرائی عورت نے اسے بیٹی کہہ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ یہ سوچ کر شعاع کے آنسو رک گئے۔ وہ آہستہ سے علیحدہ ہو کر بولی۔

مسز فاروقی، میں آپ کی شکر گزار ہوں اور تا زندگی شکر گزار رہوں گی۔

مجھے شرمندہ نہ کرو۔

شعاع نے آبگینہ کو منہ اٹھائے حیرت سے دیکھتے ہوئے پایا تو مسکرا دی اور ساڑھی کے پلو سے چہرہ صاف کرتے بولی۔

اب مجھے اجازت دیجئے۔

طیبہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

آہنی گیٹ سے باہر نکل کر شعاع نے ایک بار پھر پلٹ کر اس کوٹھی کی طرف دیکھا جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے پیار اور اعتماد کی دولت ملی تھی۔ آج کا دن اس کے لئے بہت مصروف تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو کر سوچنے لگی کہ اب کیا کرے۔ خالی رکشا اس کے سامنے رکا تو وہ کمرشل ایریا کہہ کر بیٹھ گئی۔ بازار میں جا کر اس نے کاٹن کے دو سوٹ اور کاٹن کی ایک سفید ساڑھی خریدا ایک چپل کا جوڑا خریدا۔ کوکا کولا کی ٹھنڈی بوتل پیتے ہوئے وہ بہت کچھ سوچتی رہی —— یونیورسٹی کے ہوسٹل میں جگہ نہ تھی۔ کسی کالج کے ہوسٹل میں اتنی آسانی سے جگہ نہ مل سکتی تھی۔ اور گھر میں رہنے کو وہ تیار نہ تھی۔ آخر اس نے اسی اسٹور سے سعدیہ کو فون کیا۔ وہ ابھی یونیورسٹی سے آکر کھڑی ہی ہوئی تھی۔ شعاع نے فوراً اس کو ساری بات بتا کر مشورہ مانگا۔ وہ غریب بوکھلا گئی، آخر بولی۔

پے انگ گیسٹ بن جاؤ۔

تمہاری؟

شعاع نے غصے سے کہا تو سعدیہ ہنس کر بولی۔

تم سامان لے کر میرے پاس آجاؤ کسی کے ہاں جگہ تو ہے۔ ممی سے پوچھ کر بتاؤں گی بلکہ تمہارے آنے تک انتظام کر رکھوں گی۔

گڑبڑ نہ کرنا۔

تم سے مار کھانی ہے کیا؟

اچھا، بکو نہیں، میں شام کو آرہی ہوں۔

شعاع نے فون بند کر دیا۔ پے انگ گیسٹ بننا اسے بھایا تو نہیں خیر اس نے سوچا بعد میں ہوسٹل میں کوشش کروں گی۔ بنڈل سنبھال کر وہ بس میں سوار ہو گئی گھر جانے کے لئے۔ آئندہ واقعات سے وہ کس طرح نمٹے اسی ادھیڑ بن میں وہ گھر جا پہنچی۔ حسب معمول میمونہ بیگم

سے سامنا ہوا۔ وہ اسے سلام کرتے ہوئے اپنے کمرے میں جا پہنچی اور جاتے ہی اٹیچی نکال کر اپنے کپڑے اور کتابیں سمیٹنے لگی۔ میمونہ بیگم نے اس کے ہاتھوں میں بنڈل دیکھے تھے۔ مارے تجسس کے وہ آہستہ آہستہ شعاع کے کمرے میں آئیں، مگر اسے اٹیچی میں کتابیں بھرتے ہوئے دیکھ کر ذرا حیران ہوئیں مگر ان کی حیرت یہ دیکھ کر اور بھی بڑھ گئی کہ شعاع نے اپنے کپڑے اور جوتے بھی ایک جگہ جمع کر رکھے تھے اور سوٹ کیس بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ عجیب سی صورت حال دیکھ کر میمونہ بیگم جا کر غزالہ کو بلا لائیں۔ دونوں ماں بیٹیاں کمرے میں داخل ہوئیں تو شعاع نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا مگر اپنے کام میں مصروف رہی۔ اب وہ کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔

غزالہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟

شعاع نے اب کے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور جوتوں کو ادھر ادھر سوٹ کیس کے کونوں میں پھوہڑپنے سے ٹھونس دیا۔ میمونہ بیگم غزالہ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بولیں۔

اے ہے ہم پوچھ رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

جو آپ ملاحظہ فرما رہی ہیں۔

شعاع نے نئے کپڑوں کو بنڈل سے نکال کر سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔

یہ جواب سن کر غزالہ اور میمونہ بیگم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ یوں بھی شعاع کا اس طرح بکس ٹھیک کرنا ہی اس کے ارادے ظاہر کر رہا تھا، پھر بھی انہیں جوان لڑکی سے یہ توقع تو نہیں تھی۔ غزالہ نے تنک کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب کیسے دے رہی ہے۔

میمونہ بیگم نے بھی کہا۔

اے ہے جواب کیسے دے رہی ہے۔

سوٹ کیس بند کر کے شعاع نے کہا۔

کیسے دے رہی ہوں جواب؟

غزالہ بولی۔

ٹھیک سے کیوں نہیں بتاتی ہو، یہ سامان کیوں سمیٹ رہی ہو؟

میں نے ہوسٹل میں رہنے کا انتظام کر لیا ہے، اس لئے سامان ٹھیک کر رہی ہوں۔

شعاع نے بہت سمجھانے کے لہجے میں آہستہ آہستہ ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟

میمونہ بیگم نے کہا۔

شعاع نے ایک تیکھی نظر ان پر ڈالی اور بولی۔

ایک تکلیف ہو تو کہوں۔

اب غزالہ سے پھر نہ رہا گیا، پوچھنے لگی۔

ایک ہی بتا دو۔

بتانا کوئی ضروری تو نہیں۔

شعاع نے کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی، مگر اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔

کاش اس کے باپ نے اس کی ماں کو نہ چھوڑا ہوتا۔

کاش اس کی ماں نے دوسری شادی نہ کی ہوتی۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ نانی ان کے پاس نہ رہتی ہوتی۔ اسی خیال میں اسے ایک بار پھر اپنے باپ پر غصہ آ گیا جس نے انہیں بربادی کی سیڑھی پر سے ایسا دھکا دیا تھا کہ وہ لوگ اب تک گرے جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس گھر میں کتنی خوش ہوتی۔ اس کا باپ بھی سارا دن کام کاج سے تھک کر آنے کے باوجود رات کو ان کے ساتھ بہت دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ وہ ضدیں کر کے اس سے پیسے لیتی، نئے نئے کپڑے بناتی ماں باپ سب کچھ اسے دیتے مگر وہ بسورتی رہتی اور وہ لوگ اسے مناتے جاتے۔ ان کے ساتھ فلمیں دیکھنے جاتی اور سہیلیوں میں ابو کا ذکر کرتی اور چھٹی کے بعد گھر آ کر امی کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی۔ اسی طرح ہنستے کھیلتے دن گزرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ خدا جانے وہ آج کل اتنی رونی کیوں ہو گئی تھی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ایک آہ اس کے دل سے اٹھی مگر ہونٹوں پر آنے سے پہلے رک گئی۔

غزالہ بیگم کہہ رہی تھی۔

اب چپ کیوں لگ گئی ہے بتاتی کیوں نہیں کیا تکلیف ہے تمہیں یہاں؟

تکلیف یہ ہے کہ یہاں کوئی میرا نہیں ہے اور جہاں کوئی اپنا نہ ہو وہاں کیسا رہنا۔

میمونہ بیگم نے سینے پر ہاتھ مارا اور آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔

اے ہے لڑکی حواسوں میں ہے کہ نہیں، یہاں تمہارا کون نہیں ہے۔ یہ تمہاری ماں

جس نے تمہیں جنا اور پال پوس کر اس قابل کیا اور میں تمہاری نانی ہوں۔

شعاع نے بکھرے بالوں کو داہنے ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے کہا۔

جی نہیں، یہ میری ماں نہیں مسز افتخار ہیں اور آپ ان کی والدہ محترمہ ہیں، مجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی کا کوئی رشتہ نہیں ہے، کوئی واسطہ نہیں۔

میمونہ بیگم نے غصے سے کہا۔

ہاں، ہاں، کیوں نہیں سگا تو تمہارا باپ ہی تھا۔

شجاع نے چیخ کر کہا۔

اس کا نام بھی مت لیجئے میرے سامنے میرا کوئی باپ نہیں تھا۔

دروازے پر سے آواز آئی۔

کیا ہو رہا ہے بھئی۔ اور افتخار دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ وہ پہلی بار شجاع کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے شجاع کے بندھے ہوئے سامان کو دلچسپی سے دیکھا اور بولا۔

"کیا کوئی آیا ہے؟"

جواب میں خاموشی رہی، وہ پھر پوچھنے لگا۔

بھئی واہ، یا تو اتنا شور تھا یا سب چپ ہیں۔

آپ باہر جائیے۔ غزالہ نے کہا تو مسکرا کر بولا۔

واہ کیوں جائیں باہر، پہلے ہماری بات کا جواب دیں۔

کیا جواب دوں۔ غزالہ نے بے بسی سے کہا تو شرارت سے بولا۔

"یہ سامان کس کا ہے؟"

شجاع کو اس کا انداز زہر لگ رہا تھا۔ یک دم بولی۔

محترم، یہ سامان میرا ہے، کوئی آیا نہیں بلکہ میں ہوسٹل میں جا رہی ہوں۔ آپ کسی تردد میں نہ پڑیں۔

افتخار نے کھسیا کر کہا۔

بہت تیز لڑکی ہے، بڑوں کی عزت کرنا بھی نہیں جانتی۔ اور چلا گیا۔

غزالہ بولی۔

تمہیں اس سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔

اور کیسے کرنا چاہئے تھی۔

"آخر وہ تمہارا با......"

جی میں بہت پہلے عرض کر چکی ہوں کہ وہ آپ کا شوہر ہے، میرا باپ نہیں۔ اب آپ لوگ اپنے کمروں میں تشریف لے جائیے مجھے پریشان نہ کریں۔

غزالہ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

دیکھو بیٹی رنجشیں ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ بھلا کوئی اس طرح گھر بھی چھوڑ جاتا ہے۔

جب سے شجاع نے ہوش سنبھالا تھا، غالباً پہلی بار غزالہ نے اسے پیار سے بلایا تھا شجاع کو اس کا لہجہ عجیب سا لگا۔ نرمی سے اس کا ہاتھ الگ کر کے بولی۔

جب مجھے ان تسلیوں کی ضرورت تھی، اس وقت آپ کو خیال نہ تھا، آپ نے ابو کا بدلہ مجھ سے لیا۔ اب مجھے کسی کی پرواہ نہیں، نہ ہی آپ کے الفاظ مجھے روک سکتے ہیں۔

میمونہ بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔

ٹھیک تو کہہ رہی ہے غزالہ، دیکھو بیٹی.....

شجاع نے گستاخی سے بات کاٹی اور بولی۔

آپ لوگ اب خاموش رہیں، آپ ہی نے شروع سے میرے ذہن میں نفرتوں کے بیج بوئے ہیں۔ آپ ہی نے سدا مجھے ابو کی جلن میں جلایا ہے، کاش ایک بار ابو مجھے مل جائیں تو میں ان پوچھوں گی ——— ان سے کہ.......

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد شعاع کے لبوں سے ایک آہ نکلی۔

غزالہ کا دماغ پھر ایک دم پلٹ گیا غصے سے بولی۔

کیسے اسے ابو ابو کہہ رہی ہے' بدبخت وہ تو عیش کر رہا ہے اور تو اس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر جا رہی ہے، مگر یاد رکھ وہ تمہیں گھر میں نہیں گھسنے دے گا۔

میمونہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

ایسے ہے تو وہ اس سے ملتا ہے جب ہی میں بھی کہوں کہ اس کے دیدے کیوں پھٹے ہیں۔ اے لڑکی جس نے تمہیں پالا پوسا تجھے اس کی محبت کبھی نہ آئی، آخر ہے کس باپ کی بیٹی وہ بھی اسی طرح صندوق تیار کر کے چلتا بنا تھا۔

اتنی دیر میں بچی کے رونے کی آواز شعاع کے کانوں میں پڑی تو جھلا کر بولی۔

جائیے آپ کی صاحبزادی آپ کو یاد کر رہی ہے۔

غزالہ نے کہا

تمیز سے بات کرو۔

مجھے تمیز سکھانے کی اب کیا ضرورت ہے بقیہ اولاد کو تمیز سکھائیے۔ میں تو جا رہی ہوں۔

شعاع نے یہ کہتے ہوئے بھاری سوٹ کیس اور کتابوں سے بھرا ہوا اٹیچی گھسیٹ کر برآمدے میں نکال لیا اور گیٹ تک جا کر باہر نگاہ ڈالی، شائد کوئی رکشا یا ٹیکسی مل جائے ساتھ کے بنگلے سے خالی ٹیکسی نکلی تو شعاع نے اسے روک لیا۔ ڈرائیور نے سامان خود ہی رکھا۔ جب شعاع ٹیکسی میں بیٹھی تو غیر ارادی طور پر اس نے برآمدے کی طرف نگاہ کی۔ اسے صرف میمونہ بیگم کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ شعاع کو یوں لگا۔ جیسے وہ کہہ

رہی ہو'

باپ جیسی

باپ جیسی

شعاع نے ہونٹ بھینچ کر کہا

نہیں میں باپ جیسی نہیں ہوں۔

غزالہ وہاں نہیں تھی۔ شعاع کا دل بھر آیا، کوئی بیٹی باپ کے گھر سے یوں رخصت ہوتی ہے بھلا' اور پھر بہت سے آنسو اس کے آنچل پر ٹپک پڑے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سعدیہ اسی کے انتظار میں تھی۔شجاع نے سامان اتارا تو سعدیہ نے سب سے پہلا سوال کیا۔

تم نے کھانا کھایا آج؟

نہیں ——— شجاع گڑبڑا گئی۔

سعدیہ نے کہا۔

"ممی نے تمہاری رات کے کھانے کی دعوت کی ہے۔"

مَیں نہیں کھاؤں گی۔

کیوں نہیں کھاؤ گی ——— سعدیہ نے اس کی پیٹھ پر دھموکا جڑا۔

بھئی مجھے اچھا نہیں لگتا۔

کیا اچھا نہیں لگتا۔

یہ کھانا وانا۔

تم کھانا کھا لینا وانا چھوڑ دینا۔

شجاع چڑ گئی۔بلا وجہ یہ سعدیہ کی بچی تنگ کئے جا رہی ہے، رکھائی سے بولی۔

تم نے کوئی انتظام کیا یا نہیں؟

سعدیہ نے بھی سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں" اور ساتھ ہی دینو کو آوازیں دینے لگی کہ شجاع کا سامان اندر لے جائے۔

شجاع بگڑ کر بولی۔

"رہنے دو ہمدردی، یہی تمہاری دوستی ہے کہ مجھے بلا کر صاف جواب دے رہی ہو۔"

"تو میں کیا کروں کوئی انتظام نہیں ہو سکا، تم چند دن میرے پاس ہی رہ لو پھر کوئی بات سوچیں گے۔"

شجاع کو بہت غصہ آیا، وہ واپس جانے کے لئے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے ہی لگی تھی کہ سعدیہ کی ممی اسے ایک غیر ملکی عورت کے ساتھ باہر آتی نظر آئیں۔اس نے سلام کیا تو سعدیہ کی ممی نے کہا۔

"لیجئے مسز قاضی، وہ بچی بھی آگئی ہے، اس کو رہنا ہے آپ کے پاس، اور شجاع بیٹی یہ مسز لوئی قاضی ہیں۔جاپان کی رہنے والی ہیں، میں نے تمہارے رہنے کا بندوبست ان کے ہاں ہی کر دیا ہے، گھبرانا نہیں ساتھ کا بنگلہ ہی ہے۔"

شجاع گھبرا سی گئی۔سعدیہ نے اسے پریشان سا کر دیا تھا۔اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا بولے، آخر میاؤں کی سی آواز میں مسز قاضی سے مخاطب ہوئی۔

"ہیلو"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مسکرا کر بولی۔

"نہیں بیٹی، اردو میں بات کرو، ہم اردو بہت سیکھا ہے، اب تم سے باتیں کرے گا تو ہمارا والا اردو اچھا بن جائے گا۔"

شعاع شرمندہ سی ہو گئی۔

مسز قاضی سعدیہ کی ممی سے رخصت ہو کر جاتے جاتے شعاع کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہوئی گئیں شعاع سعدیہ کی ماں مسز تجمل کے ساتھ اندر چلی گئی۔

شعاع سعدیہ سے روٹھ گئی مگر وہ بھی ایک بدتمیز تھی، اس کے سامنے بیٹھی ہنستی رہی۔ شعاع نے بہت ضبط کیا مگر آخر ہنس ہی دی۔ سعدیہ کی ممی اسے مسز قاضی کے بارے میں بتاتی رہیں کہ وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی، مگر نہ دوسری شادی کی اور نہ ہی وطن واپس گئی۔ وہ باتیں کر رہی تھیں کہ خانساماں بلانے آگیا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور سعدیہ بھی ادھر لپکی، شعاع اکیلی رہ گئی۔

یہ کمرہ خالی ہونے کے باوجود کتنا بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ شعاع نے سوچا اس گھر میں زندگی اور زندہ دلی رقص کرتی ہے۔ سعدیہ کتنی خوش قسمت ہے کہ اس کی ماں اور باپ دونوں اسے کس قدر چاہتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ ماں بھی ہے اور باپ بھی مگر دونوں کو اپنے آپ سے فرصت نہیں ہے۔ اس گھر کی دیواریں کیسی ٹھنڈی مُردہ سی دیواریں تھیں اور وہاں کے لوگ کتنے پتھر دل تھے۔ پتہ نہیں اتنے سال میں وہاں کیسے رہی —— کتنا دم گھٹتا تھا وہاں —— جیسے سانس ہی رک جائے۔

شعاع نے دیکھا، تجمل صاحب برآمدے میں کھڑے ہیں اور سعدیہ ان کی جیبوں سے چاکلیٹ نکال نکال کر کھا رہی ہے اور باتیں بھی کئے جا رہی ہے۔

شعاع نے یہ سب کچھ بہت حسرت سے دیکھا۔

کاش اس کا باپ بھی اچھا آدمی ہوتا جو اپنی بیوی سے محبت کرتا اور بچوں پر جان دیتا —— کاش میری ماں نے میرے باپ کے جانے کے بعد دوسری شادی نہ کی ہوتی کیا وہ مسز قاضی کی طرح باقی زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

سعدیہ اپنے چھوٹے بھائی سے جھگڑ رہی تھی۔

کاش —— شعاع نے سوچا —— میرا بھی کوئی چھوٹا بہن بھائی ہوتا میرے گھر میں بھی خوشیاں ہوتیں، میں بھی چھوٹوں سے لڑتی اور ماں سے پیار بھری ڈانٹ سنتی، اور ابو سے لاڈ کرتی، دن بھر کی معمولی باتوں کو اہم بنا بنا کر سناتی۔

یہی سوچتے سوچتے شعاع کا ذہن اس گھر کی طرف مڑ گیا جہاں اس کی ماں تھی جو دوسرے شوہر کی رفاقت اور بچوں میں اتنی مگن تھی کہ بعض اوقات وہ دو دو تین تین دن اس کی صورت نہ دیکھ سکتی تھی اور اس کا سوتیلا باپ افتخار جو اس کے حق پر قبضہ جمائے اس کے گھر میں اتنی ڈھٹائی سے رہ رہا تھا۔ وہ بے غیرت اور بے شرم انسان، جو آج تک اس کے ابو کے پرانے کپڑے پہنتا تھا، جو ابو کے لائے ہوئے صوفوں پر بیٹھتا تھا، ابو کے خون پسینے کی کمائی سے خریدے ہوئے گھر کو اپنے باپ کا گھر سمجھ کر رہتا تھا۔ ابو کی جائیداد کے کرائے وصول کرتا ہے اور جس نے جب بھی سوتیلی بیٹی کو دیکھا آنکھوں میں تضحیک کی ہنسی لئے ہوئے۔

شعاع کو اس سے بے حد نفرت تھی اور پھر میمونہ بیگم جیسی بس کی گانٹھ کا خیال آتے ہی شعاع کے ماتھے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے، اس کی صبیح پیشانی پر ہلکے ہلکے بل اس طرح پڑے جیسے کسی نے ٹھہری جھیل میں پتھر پھینک کر اس کی لہروں کو جگا دیا ہو۔

یا الٰہی خیر، آج معلوم ہوا محترمہ جاگتے میں بھی سوتی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع نے چونک کر دیکھا، سعدیہ کمر پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے وہ پہچان نہ سکی۔ سعدیہ نے اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھی تو ششدر رہ گئی۔ مگر شعاع ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی ـــــ نارنجی کاٹن کے سوٹ میں سعدیہ کا سلونا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس پر آسودگی اور سکون کی پرچھائیاں تھیں اور ذہن کسی بھی پراگندگی سے پاک۔ شعاع سوچ رہی تھی یہ کتنی خوش قسمت لڑکی ہے، ایک میں ہوں جس کا سب کچھ ہے مگر پھر بھی خالی ہاتھ ہوں۔ سعدیہ کتنی خوب صورت لگ رہی ہے، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ بکھرے بکھرے سنہری بالوں کی چوٹی آگے ڈالے سفید ململی ساڑھی میں وہ خود بھٹکی ہوئی شہزادی دکھائی دے رہی تھی۔

سعدیہ نے گھبرا کر اسے بلایا۔

شعاع، کیا ہوا بھئی؟

ہیں؟ وہ چونکی، سفید چہرے پر خفت کی لالی پھیل گئی۔

کچھ نہیں، وہ مشکل سے بولی۔

سعدیہ نے کہا۔

تم تو اس طرح گم ہو گئی تھیں کہ میں ڈر ہی گئی، ذرا دیر تم اور اسی طرح رہتیں تو میں ممی کو بلانے والی تھی۔

شعاع گھبرا کر بولی۔

نہیں، نہیں۔

سعدیہ نے شرارت سے اس کے کندھے پر مُکا جڑا اور بولی۔

کیا نہیں، نہیں لگا رکھی ہے، چلو تمہیں ابو بلا رہے ہیں۔

شعاع گھبرا کر معصومیت سے بولی۔

کیوں؟

تمہاری پٹائی کرنے کو۔

وہ کیوں؟

شعاع، پر سچ کہنا تم ہو ہی اتنی بدھو یا تم بنتی ہو؟

چلو ہٹو، میں کیوں بدھو ہونے لگی۔

اس کا مطلب ہے بنتی ہو؟

شعاع چڑ گئی، غصے سے بولی۔

کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔

ایک تو تمہیں بات بات پر غصہ آتا ہے۔

ہاں، آتا ہے بس

تو آنے دو مگر چلو تو سہی ابو بلا رہے ہیں۔

شعاع تجمل صاحب کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے شفیق لوگوں سے مل کر اسے اپنی محرومیوں کا احساس شدت سے ہونے لگتا تھا۔ مگر سعدیہ تھی کہ اسے ٹھوکے دیئے جا رہی تھی۔ اٹھو اٹھو۔ اسی وقت دینو آگیا کہ بی بی شعاع کا سامان مسز قاضی کے ہاں پہنچانا ہے۔

شعاع نے کہا۔

اچھا تو سعدیہ، میں جا رہی ہوں۔

پاگل ہوئی ہو، کھانا کھا کے جانا۔

شعاع خاموش ہو گئی۔ دوسرے کمرے سے پلیٹوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانے کی میز پر برتن لگا رہا تھا۔ گرم چاولوں کی خوشبو شعاع کے نتھنوں میں پہنچی تو اس کی بھوک چمک اٹھی۔ دن بھر اس نے ایک کپ چائے کے سوا کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ اتنے میں تجمل صاحب نے پکارا۔

آؤ بھئی بچو، جلدی آجاؤ۔

سعدیہ اور شعاع وہاں پہنچ گئیں۔ شعاع نے ادب سے سلام کیا تو تجمل صاحب مسکرا کر دعا کہنے لگے۔

تجمل صاحب بہت خوش مزاج آدمی تھے۔ بچوں میں بچے بن جاتے۔ کھانے کی میز پر سعدیہ اس کے چھوٹے بھائی رونی اور تجمل صاحب نے جو باتیں شروع کیں تو ختم ہونے میں نہ آئیں۔

شعاع آہستہ مگر بے تکلفی سے کھانا کھاتی رہی۔ ایک لمحے کے لئے وہ بھول گئی کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔

مسز تجمل نے کہا۔

بیٹی کھانا ٹھیک سے کھانا تکلف نہ کرنا۔

تجمل صاحب نے بھی کہا۔

ہاں ہاں بھئی۔

شعاع کے حلق میں نوالہ جیسے اٹک سا گیا جسے اس نے پانی کے بڑے سے گھونٹ سے اتارا۔ آہستگی سے اس نے اپنے آگے کی پلیٹ کھسکا دی۔

مسز تجمل نے دیکھا وہ غیر ارادی طور پر چمچ کو انگلی سے میز کی سطح پر انگلی سے گھما رہی تھی اس کے جھکے ہوئے چہرے پر غور و فکر کی لہریں تھیں اور رنگ سفید سفید سا ہو رہا تھا۔

شعاع، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

شعاع نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

آنٹی، سر میں درد ہے۔

یک دم سب خاموش ہو کر کھانا ختم کرنے لگے۔ شعاع کے سر میں درد تھا اور وہ لوگ شور مچائے جا رہے تھے۔ سعدیہ نے کھانا ختم کیا تو مسز تجمل بولیں۔

سعدیہ شعاع کو اپنے کمرے میں لے جاؤ، میں سر درد کی گولی بھیجتی ہوں۔

آنٹی، مجھے اجازت دیں میں مسز قاضی کے ہاں ہی جاؤں گی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کل تمہاری چھٹی ہے، مسز قاضی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ سامان احتیاط سے رکھوا دیں، شعاع کل رات کو آئے گی۔

مگر آنٹی ——— شعاع نے بے بسی سے کہا۔

اگر مگر کچھ نہیں ——— بڑوں کو جواب دیتی ہے۔

سعدیہ نے کہا۔

سیدھی طرح چلو ورنہ پٹائی ہو جائے گی۔

اس پیار بھری ڈانٹ کے جواب میں شعاع کچھ نہ بول سکی، مگر آنسو اس کے حلق میں اٹک گئے اس نے سوچا۔

یہ کیسے لوگ ہیں جو دوسروں سے اتنا پیار کرتے ہیں، ایک میرے ماں باپ ہیں جو سگی اولاد سے پیار نہ کر سکے۔

سعدیہ کے کمرے میں جا کر وہ بستر پر گر سی گئی۔ سعدیہ نے دیکھا اس کی آنکھیں لال لال سی ہو رہی تھیں۔ سعدیہ کو پیار آ گیا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

شعاع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر چونک کر بولی۔

ارے تمہیں تو بخار ہے۔

نہیں تو ــــ شعاع زبردستی مسکرائی ــــ یوں ہی تھکن سی ہو رہی ہے۔

سعدیہ باہر بھاگی۔

ممی، ممی دیکھئے شعاع کو بخار آ گیا ہے۔

ممی نے کہا۔

کوئی بات نہیں، سر درد سے اکثر حرارت ہو جاتی ہے، دودھ کے ساتھ یہ گولی کھلا دو، ٹھیک ہو جائے گی۔

شعاع کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ غنودگی کی لہروں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے وہ اس میں ڈوبتی گئی۔ ساری رات وہ بخار میں پھنکتی رہی اور صبح تک اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ سعدیہ نے کتنی مشکلوں سے اسے دوا کھلائی تھی اور کتنی بار رات کو اٹھ اٹھ کر اسے دیکھا تھا اور شعاع نے کیسے گھبرا گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

پریشانیوں نے مل کر اس کے ذہن اور جسم پر بُرا اثر ڈالا تھا۔

چھٹی کا دن تھا اس لئے بچارے نجل صاحب خود ہی ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ شام کو ذرا اسے ہوش آیا تو سعدیہ کا پریشان چہرہ اس کے سامنے تھا، وہ بھول چکی تھی کہ وہ خود سعدیہ کے گھر میں ہے بلکہ پریشان ہو گئی کہ سعدیہ کہاں سے آ گئی۔ نحیف آواز میں بولی۔

سعدیہ تم کب آئیں؟

بائیس برس پہلے۔

شعاع مسکرا دی۔ اجنبی کمرہ اور سعدیہ کی موجودگی، آخر وہ حواس میں آ ہی گئی۔

یہ کیا جواب ہوا؟

جیسا سوال تھا ــــ جی چاہتا ہے ایک جھانپڑ دوں۔

دے دو۔

ہلدی کی گانٹھ ہو رہی ہو تمہیں کیا ماروں۔

مجھے کیا ہوا ہے؟

وہی جو ہو سکتا ہے۔

بہت غصے میں ہو۔

تم بیمار ہو کیا خوش ہو جاؤں۔

شعاع کو مسز فاروقی کا خیال آ گیا وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، اسے تو وعدے کے مطابق ان کے ہاں آبگینہ کو پڑھانے جانا تھا۔

اسے اس طرح اٹھتے دیکھ کر سعدیہ دہل کر بولی۔

الٰہی خیر، کیا ہوا تمہیں؟

شعاع کی آنکھوں میں تاسف کا اثر تھا، شرمندگی کے لہجے میں بولی۔

سعدیہ میں نے مسز فاروقی سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی بچی کو پڑھانے آج آؤں گی مگر بُرا ہو بخار کا جس نے ہوش ہی گم کر دیئے۔

سعدیہ کو بہت جھنجلاہٹ ہوئی بولی۔

تمہارا تو دماغ خراب ہے اتوار کے روز کون پڑھانے جاتا ہے اور اگر تمہیں ایسا ہی صدمہ ہو رہا ہے تو میں مسز فاروقی کو ٹیلی فون کر دیتی ہوں کہ شعاع چند دن ادھر نہ آ سکے گی۔

شعاع جلدی سے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں سعدیہ مت کہنا بس معذرت کر دینا، بلکہ ابھی ٹیلی فون کر دو۔

بہت اچھا، سعدیہ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی اور شجاع کھڑکی کے لہراتے گلابی پردوں کی طرف غیرارادی طور پر دیکھنے لگی۔

شام کا وقت تھا جب فضا بھی سنسنانے لگتی ہے اور درختوں پودوں پر چپ سی طاری ہو جاتی ہے۔ پردہ ذرا سا ہلتا تو سیاہ پڑتا ہوا آسمان ذرا سا نظر آتا تو شجاع نے سوچا۔

یہ آسمان اور ایسے ہی کئی آسمانوں کے اوپر خدا ہے جس نے انسان تو بنائے مگر محبت اور خلوص سب میں نہیں بھرا۔ کیا مسز فاروقی، مسز تجمل اور سعدیہ محبت کرنے والوں میں آگے موجود تھیں اور میرے ماں باپ دور تھے۔ ایک شخص کے سخت دل نے سارے لوگوں کو کٹھور بنا دیا تھا اور وہ اس کا باپ تھا۔

شجاع عجیب عجیب سے ہیولے بنانے اور مٹانے لگی۔ ہر بار نئی شکل بناتی مگر اس کا دل کہتا۔

نہیں یہ میرے باپ کی شکل نہیں ہے۔

اس نے سوچا۔

کاش میں نے اس کی صورت تو دیکھی ہوتی۔ اور اگر دیکھی تھی تو مجھے یاد کیوں نہیں، ہو سکتا ہے وہ بچپن میں مجھ پر بھی غصہ کرتا ہو یا مارتا پیٹتا ہو۔

اتنا کچھ سوچنے کے بعد اچانک ہی شجاع کو محسوس ہوا جیسے اسے اپنے باپ پر پیار آ رہا ہے آخر میمونہ بیگم کیوں اسے بار بار باپ جیسی کہتی رہتی ہیں۔ شجاع نے سوچا کیا مجھ میں بہت برائیاں ہیں، آخر میں نے بھی تو گھر چھوڑا ہے کس بنا پر۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا باپ بھی کوئی خوددار آدمی تھا۔ جہاں اس کی انا کو ٹھیس پہنچی ہو اور اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہو۔

یہ نیا خیال ذہن میں آتے ہی شجاع اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آخر اتنی مدت سے اس کے ذہن میں یہ

بات کیوں نہ آئی — آخر امی اور نانی میں کون سی مظلومیت اور خوبی ہے۔

سعدیہ اندر آئی تو شجاع سر تھامے بیٹھی تھی۔ سعدیہ دہل کر اس کے پاس آئی۔

کیا ہوا شجاع؟

ہاں — کچھ نہیں۔

سر میں درد ہے؟

ہاں، تھوڑا تھوڑا۔

دبا دوں؟

نہیں، تم نے کھانا کھا لیا؟

یہ کھانے کا ٹائم نہیں ابھی صرف سات بجے ہیں۔

اوہ دراصل مجھے نیند آ رہی تھی میں سمجھی رات ہو گئی۔

سعدیہ نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی واقعی رات کا اندھیرا ڈال ڈال پات پات اتر رہا تھا۔ بولی۔

اچھا ہے سو جاؤ، جب اٹھو گی میں کھانا لے آؤں گی، روشنی گل کر دوں؟

ہاں کر دو۔

شجاع نے لیٹ کر اپنا بازو آنکھوں پر رکھ دیا، سعدیہ روشنی گل کر کے دبے پاؤں کمرے میں سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شجاع کے آنسو بہہ نکلے۔ وہ بھی کتنی پاگل ہے اپنے باپ کے بارے میں کیا کیا سوچتی رہی، پھر وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے باپ کے ہیولے بناتی رہی مگر آج کے انداز میں فرق تھا، پہلے وہ نفرت کرنے کے لئے ہیولے بناتی تھی مگر آج وہ بے تابی سے نقش ترتیب دے رہی تھی تاکہ وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھ سکے۔ اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ مگر سب کہتے تھے کہ وہ اپنی ماں سے ملتی جلتی ہے، اس کا دل پکارا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابو! کاش میں آپ کو دیکھ سکتی اور نہیں تو تصویر ہی دیکھ سکتی۔

بہت دیر تک وہ انجانے نقوش گھڑتی اور مٹاتی رہی اور پھر نیند دبے پاؤں اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں اتر آئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کھڑکی کے سامنے کا درخت دھوپ میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ اور کھڑکی کے گلابی پردے نکھرے نکھرے سے لگ رہے تھے، وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ یک دم تجمل صاحب کی گرج دار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں میں خود ہی کہیں چلا جاؤں گا۔ یہ گھر ہے یا دوزخ، ذمہ داریاں ذمہ داریاں سن سن کر دل اکتا گیا ہے، سنبھالو اپنا گھر بار۔

جواب میں خاموشی رہی۔ باپ کا جو بت اس نے رات کو بنایا تھا وہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ تجمل صاحب کو ایسا شخص سمجھتی تھی جسے اپنے گھر بار اور بیوی بچوں سے بے انتہا لگاؤ ہے۔ مگر شجاع نے اس گھریلو جنت کی بکھرتی ہوئی دھجیاں اس جنت کے پاسباں کے ہاتھوں دیکھیں، تو اسے ایک بار پھر اپنے باپ سے نفرت ہو گئی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اپنے ہاتھوں اپنی جنت کو آگ لگا گیا ہو، یہ زہریلا احساس اس کے رگ و پے سے نکل کر رات اسے سکون کی نیند سلا گیا تھا پھر سے رگوں میں سنسنانے لگا۔ اسی جان توڑ لمحے میں شجاع نے دیکھا، خوفزدہ بیرا دروازے پر منتظر کھڑا تھا۔

شجاع نے کہا۔

آ جاؤ۔

بیرا ناشتے کی ٹرے لے کر آیا تھا، بڑے ادب سے میز پر لگا دی اور واپس مڑا ہی تھا کہ شجاع نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

بیرا، سعدیہ کہاں ہے؟

جی بی بی جی، وہ تو پڑھنے کو گئی ہیں۔

بیرا چلا گیا تو وہ اٹھی، کپڑوں کی حالت خراب ہو رہی تھی، منہ دھو کر اس نے الجھے الجھے بالوں میں کنگھی کی اور آئینے میں غور سے صورت دیکھی، ہلکے ہلکے بخار کے اثر سے گال گلابی گلابی سے ہو رہے تھے۔ ذرا بشاش چہرہ بنا کر وہ ناشتہ کئے بغیر نیچے آ گئی۔ سامنے ہی ڈرائیور صفائی کر رہا تھا، شجاع نے کہا۔

ڈرائیور مجھے ذرا مسز قاضی کے گھر تک لے چلو۔

وہ مستعدی سے دوڑا۔

جی اچھا بی بی جی۔

اتنے میں سعدیہ کی ممی سامنے آ گئیں۔ روئی روئی آنکھیں صاف معلوم دے رہی تھیں۔ بجھے بجھے لہجے میں انہوں نے شجاع کی طبیعت پوچھی اور جب معلوم ہوا کہ وہ مسز قاضی کے ہاں جانے کو تیار ہے تو چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہیں پھر گویا کوئی فیصلہ کر کے بولیں۔

ٹھیک ہے بیٹی سعدیہ یونیورسٹی سے آ جائے تو تمہارے پاس بھیج دوں گی۔ تم خود بھی رات کا کھانا یہیں کھایا کرنا۔

شجاع سلام کر کے ان کے گھر سے رخصت ہوئی۔ آج اس نے محبت بھرا گھروندہ ٹوٹتے دیکھا تھا، اس لئے اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ دو دن پہلے اس نے خوشیاں ناچتے دیکھی تھیں، لبوں پر ہنسی دیکھی تھی آج وہاں سناٹا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے، وہ تھکے تھکے قدموں سے مسز قاضی کے بنگلے میں داخل ہوئی تو وہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ شجاع کو دیکھ کر دوڑتی ہوئی آئیں۔ بڑی محبت سے اسے کندھوں سے تھاما اور بولیں۔

کیسا طبیعت ہے ہم کو خبر ملا تھا کہ بخار آ گیا ہے۔

جی اب اچھی ہوں، معمولی بخار تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھا کمرے میں چلو، ناشتہ کیا؟

شجاع نے نفی میں سر ہلا دیا اور مسز قاضی کے پیچھے آہستگی سے چل دی اور دینو کو رخصت کر دیا۔

کمرہ خاصا اچھا تھا، صاف ستھرا بستر اور ہلکے نیلے سادہ سے پردے لگے تھے۔ پرانی طرز کی سنگھار میز تھی۔ شجاع تھکی تھکی سی بستر پر بیٹھ گئی۔ مسز قاضی ناشتہ لینے چلی گئیں۔ شجاع کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ لیٹ گئی۔

لبنیٰ نے برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھا سعدیہ گھاس پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور حسب عادت ٹکٹکی چبا رہی تھی۔ مگر شجاع اسے نظر نہ آئی۔ لبنیٰ کا جی چاہا وہ اُس سے پوچھے مگر ہمت نہ ہوئی۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا سعدیہ نے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا ممکن ہے وہ لبنیٰ کی طرف دیکھتی تو وہ پوچھ بھی لیتی۔ دو تین دن سے شجاع نظر نہ آئی تھی اور لبنیٰ کو اس بدمزاج سی لڑکی میں عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت تو وہ نکلنے کو آگے نکل آئی مگر چند قدم چل کر پلٹ آئی اور سعدیہ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ سعدیہ نے یونہی سی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تو لبنیٰ بولی۔

معاف کیجیے گا۔

معاف کر دیا۔

بے نیازی سے جواب ملا۔ لبنیٰ گڑبڑا گئی۔ سعدیہ پھر کتاب پڑھنے لگی۔ لبنیٰ کھسک جانے ہی لگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی کہ سعدیہ کو ترس آگیا۔ کہنے لگی۔

آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔

لبنیٰ کا جی چاہا کہ اس پر لعنت بھیجے مگر رک کر بولی۔

کوئی خاص کام تو نہیں بہت دنوں سے شعاع نظر نہیں آئی۔

وہ بیمار ہے۔

اوہ، آپ تو جاتی ہوں گی اس کے پاس۔

جی ہاں جاتی تو ہوں، فرمایئے۔

میں اس کے پاس جاؤں گی شام کو۔

لبنیٰ جانے کے ارادے سے مڑی ہی تھی کہ سعدیہ کی مسکراتی آواز آئی۔

کہاں جائیں گی شعاع کو دیکھنے۔

اس کے گھر۔

سعدیہ کو لبنیٰ پر رحم آگیا پیار سے بولی۔

وہ اپنے گھر میں نہیں رہتی، یہ اس کا پتہ ہے وہاں جانا، میں شام کو اس کے پاس ہی ہوتی ہوں۔

لبنیٰ نے پتہ لیا اور سعدیہ کا شکریہ ادا کرکے چلی گئی۔ سعدیہ اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ شام کو لبنیٰ آئی تو واقعی سعدیہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ شعاع کی طبیعت اب پہلے سے بہتر تھی۔ لبنیٰ سے بہت اچھی طرح ملی۔ چائے وائے بھی پلائی اور جب وہ رخصت ہوئی تو شعاع ذرا چپ چپ سی ہوگئی۔

سعدیہ نے کہا۔

اچھی لڑکی ہے۔

ہاں اچھی ہے۔

کیوں کیا بات ہے؟

کچھ نہیں یونہی مجھے اس سرمایہ دار لڑکی کا خیال آگیا۔

ہوگی سرمایہ دار، مگر طبیعت کی سادہ ہے۔

ان لوگوں میں بناوٹ بہت ہوتی ہے۔

شعاع گھر چلوگی، ممی یاد کرتی ہیں۔

آج نہیں پھر کبھی آجاؤں گی۔ آنٹی سے سلام کہنا۔

اچھا۔

سعدیہ کو اس دن کے واقعے کا اچھی طرح علم تھا۔ اسے دکھ تھا کہ اس کے گھر کا بھرم کھل گیا۔ اس لیے وہ اسے ساتھ لے جانے پر مصر بھی نہ ہوئی۔ شعاع نے دوسری طرف کروٹ لے لی تو سعدیہ بھی خدا حافظ کہہ کر آگئی اور شعاع تنہا پڑی حالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی، وہ کس کے خلوص پر اعتبار کرے اور کس پر شک کرے۔ ان دنوں مسز فاروقی بھی چند منٹوں کے لئے آئی تھیں۔ شعاع کو محسوس ہوتا ہر شخص نے مصنوعی خوش اخلاقی کا نقاب چڑھا رکھا ہے۔ اس نقاب کے پیچھے اصلیت کیا ہے، یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

شعاع نے مسز فاروقی کے ہاں آبگینہ کی ٹیوٹر کی حیثیت سے جانا شروع کر دیا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتی اور شام کو مسز فاروقی کے ہاں۔ وہ اسے بہت پیار کرتی تھیں، فاروقی صاحب یورپ میں تھے، اس لیے وہ تو اسے کبھی نظر نہ آئے۔ نہ انہیں دیکھنے کی اسے آرزو تھی، ابھی مرد ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ہوتے ہیں۔ اس کا دل اسے بتا چکا تھا وہ سوچتی۔

ہو سکتا ہے مسز فاروقی کے گھر میں اسی لئے اتنا سکون ہو کہ اس سکون کو تباہ کرنے والا ہے۔ بہرحال وہ غیر مطمئن سی لڑکی بن کر رہ گئی تھی۔ جب مسز فاروقی اسے پیار سے زبردستی یا ادھر ادھر کی باتیں کرتیں تو وہ اس مسکراتے چہرے کے پیچھے جھانکنے کی بے سود سی کوشش کرتی رہتی۔

آبگینہ کی بے ساختہ حرکتوں اور جھرنے کی طرح بہنے والی ہنسی کو اکثر شک کی نظر سے رہتی۔ کئی بار آبگینہ اس کی نگاہوں سے ڈر سی جاتی، مگر وہ شرارتی سی لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹی بہت سنجیدہ سی لڑکی تھی۔ وہ شعاع کے پاس بیٹھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔ شعاع کو بھی وہ پیاری لگتی تھی۔ بھولی بھالی خاموش سی لڑکی۔

مسز فاروقی واقعی اسے بیٹی کی طرح پیار کرتیں۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتیں، چھوٹی موٹی ضرورتوں کا بار بار پوچھتیں جن کا جواب شعاع بڑے سلیقے اور محبت سے دیتی مگر دل ہی دل میں شرمندہ سی ہوتی رہتی۔

یونیورسٹی کے ہوسٹل میں اس نے درخواست دے رکھی تھی، وہ جلد سے جلد ہوسٹل جانا چاہتی تھی، اس لئے کہ سعدیہ بہت تکلف کرتی تھی، کچھ نہ کچھ کھانے کے وقت اسے بھیجتی رہتی تھی۔ اور یوں بھی مسز فاروقی سے طے تھا کہ ہوسٹل میں جگہ ملتے ہی وہ ان کا کمرہ خالی کر دے گی۔

شعاع کو دقت یہ تھی کہ یونیورسٹی بھی ذرا دور پڑتی تھی اور مسز فاروقی کا گھر بھی اسے دوہرا کرایہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ ہوسٹل میں جگہ مل جاتی تو وہ آبگینہ کو پڑھانے پیدل سکتی تھی۔ آخر ایک دن اسے اطلاع ملی کہ ہوسٹل میں جگہ ہے وہ آ سکتی ہے۔ شعاع نے سب

چھوڑ چھاڑ کر پہلے یہ معاملہ طے کیا اور شام ہی کو سامان لے کر آ گئی۔

سعدیہ بہت افسردہ تھی۔ اس کی شام اچھی گزر جاتی تھی۔ یوں بھی وہ اب شعاع سے شرمندہ شرمندہ سی رہتی تھی۔ شعاع کے جانے پر وہ غریب تو رو ہی دی۔

ہوسٹل میں سامان رکھنے کے بعد اس نے وقت دیکھا۔ ابھی وہ آبگینہ کو پڑھانے جا سکتی تھی۔ ہوسٹل میں ساڑھے آٹھ بجے تک باہر رہنے کی اجازت تھی اور ابھی تو ساڑھے پانچ ہی بجے تھے۔ پہلے سوچا کپڑے بدل لے پھر ارادہ بدل دیا اور اپنے کام پر چل دی۔ روکھے سنہری بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتی ہوئی گیٹ کے اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ پاؤں ساڑھی کی فال میں الجھا اور اگر بروقت سنبھل نہ جاتی تو آنے والے سے زوردار ٹکر ہو جاتی۔

معاف کیجئے گا۔

وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

نوجوان نے جو مسز فاروقی کا بھانجا سہیل تھا بڑے مہذب انداز میں کہا۔

کوئی بات نہیں، آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔

شعاع نے نگاہ اٹھا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ سنہری لٹ رخسار پر جھول سی گئی بھوری بھوری آنکھوں میں عجیب سی اجنبیت تھی۔

سہیل بھونچکا سا رہ گیا۔

وہ نفی میں سر ہلا کر چلی گئی۔

مگر سہیل حیرت زدہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ سفید ساڑھی میں لہراتا اس کا نازک سراپا سہیل کی آنکھوں میں رہ گیا اور وہ اندر کہیں گم ہو گیا۔ سہیل کے سامنے وہ چمپئی رنگ وہ بھوری بھوری آنکھیں اور گال پر لہراتی سنہری لٹ کا خیال رہ گیا۔ اس کا دل پکارا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کون تھی کہاں سے آئی تھی، اگر اسی دنیا میں رہتی ہے تو مجھے پہلے کیوں نہیں ملی۔

وہ سوچتا رہ گیا کہ اس ایک لمحے میں اس پر کیا سحر ہو گیا ہے، وہ سادہ سی لڑکی جس میں بظاہر کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے اسے کیسے چونکا گئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر سوچا کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے۔ اس کے اندر جانے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ پہلی دفعہ نہیں آئی ہے۔

سہیل نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی معلوم کرے گا کہ وہ کون ہے۔

سہیل مسز فاروقی کا بھانجا جب اپنی خالہ کے ہاں سے لوٹ رہا تھا تو اس نے راستے میں شعاع کو دیکھا جس کا پاؤں ساڑھی میں الجھا اور گرتے گرتے بچی۔

سہیل مسز فاروقی کا چہیتا بھانجا تھا جس کا اکثر و بیشتر مسز فاروقی کے ہاں جانا ہوتا تھا مگر شعاع اس کے لئے نیا چہرہ تھا، اس نے اس سے پہلے یہ لڑکی وہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔

یہ لڑکی کون ہے؟

یہ لڑکی کون ہے؟

کون ہے؟

یہاں کیوں آئی ہے؟

سہیل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سادہ سی، بھرے بھرے سنہری بالوں والی لڑکی، جو بھٹکی ہوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی، کے بارے میں معلوم کر کے رہے گا۔

وہ لڑکی۔

جس کی بھوری شبنمی آنکھوں میں ایسی انوکھی اجنبیت تھی گویا اس نے اس دنیا میں پہلی بار کسی مرد کی صورت دیکھی ہو یا پھر ——

یا پھر

اور سہیل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سادہ سی لڑکی کا کھوج لگا کر رہے گا۔ وہ واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔

خالہ کیا سوچیں گی —— ابھی تو میں ان سے رخصت ہو کر آیا ہوں۔

پھر اس نے کچھ سوچ کر آبگینہ کو آواز دی۔

آبگینہ

بالکونی کے سفید کنارے پر سے چھوٹا سا سیاہ سر ابھرا، پھر چمکتی ہوئی کالی کالی آنکھوں نے تاکا اور نگینہ نے کہا۔

سہیل بھائی وہ پڑھ رہی ہیں۔

اسے کہو فوراً میری بات سنے، ورنہ کٹی ہو جائے گی۔

نگینہ چلی گئی ذرا دیر بعد ہی آبگینہ کا جھلایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ بولی۔

کیا بات ہے سہیل بھائی۔

نیچے آؤ تو بتائیں گے۔

ابھی نہیں۔

پھر کب؟

ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔

سبحان اللہ، یہ کونسا وقت ہے پڑھنے کا۔

آبگینہ نے آواز دبا کر کہا۔

میری ٹیوٹر آئی ہوئی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا ——— ؟ سہیل نے حیرت کا مجسمہ بن کر پوچھا۔ ٹیوٹر، یہ ٹیوٹر کب رکھ لی بھئی۔ اللہ کون محترمہ ہیں؟"

آبگینہ نے کہا۔

اللہ سہیل بھائی، شعاع باجی آئی ہوئی ہیں۔

سہیل نے کہا: شعاع ——— ؟ یہ کون ہیں۔

آبگینہ نے کہا: شعاع باجی کہئے ——— ادب سے نام لیجئے، میری اچھی والی باجی ہیں۔

سہیل نے کہا: ہمیں بھی ان سے ملاؤ۔

آبگینہ نے آنکھیں دکھائیں۔

کیا ——— ؟ وہ کوئی سب کے سامنے تھوڑی آتی ہیں۔

پردہ کرتی ہیں ——— ؟

پردہ تو نہیں کرتیں۔

پھر ملنے میں کیا حرج ہے۔

آبگینہ نے کہا

سہیل بھائی، اب آپ جائیں، نہیں تو ——— ؟

نہیں تو ؟

شعاع جو یہ باتیں سن رہی تھی، اس نے آبگینہ کو آواز دے کر کہا۔

انہیں اندر بلالو۔

تب آبگینہ نے سہیل سے کہا۔

آئیے بھائی جان اوپر آئیے ——— اب ہوگی آپ کی گوشمالی۔

سہیل یا تو اندر جانے کے لئے بیتاب تھا، شعاع کی جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھا اور یا اب اس کی جان پہ بن آئی تھی۔ آبگینہ اسے بلا رہی تھی اور وہ واپس پلٹ جانا چاہتا تھا۔ اتنے میں شعاع نے پھر کہا۔

آؤ ——— یہاں آجاؤ۔

اور سہیل کسی فرمانبردار بچے کی طرح شعاع کے پاس پہنچا اور سر جھکا کر اسی طرح کھڑا ہوگیا جیسے کوئی بچہ شرارت کرتے پکڑا گیا ہو۔

شعاع نے کہا۔

مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔

سہیل کے تو جیسے حلق میں آواز اٹک گئی۔ بولنا چاہا مگر بول نہ پایا۔

شعاع نے پھر پوچھا۔

مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟

جی ——— جی نہیں۔

اچھا تو جاؤ۔

اور سہیل جانے کے لئے یک دم اس طرح پلٹا جیسے جیل سے چھٹا ہو۔ سہیل تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر آگیا۔

باپ رے باپ، کتنی پیاری مگر کتنی خوفناک لڑکی ہے۔

سہیل وہاں سے چلا تو آیا مگر عجیب پریشانی کے عالم میں تھا۔ اس کے دل کی عجیب حالت تھی، وہ سخت بیتاب تھا۔ بے چین تھا کہ اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرسکے۔ اس چاند کی سی کرن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ے بارے میں معلومات حاصل کرسکے۔اور یہی تجسس یہی خواہش پھر رات میں خالہ جان کے ہاں لے گئی۔

وہ ابھی گھر کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ آبگینہ مل گئی۔

سہیل نے کہا۔

اچھی ہو آبگینہ۔

جی۔

ایک بات بتاؤ۔

دو پوچھو۔

نہیں، صرف ایک ہی بتادو۔

یہی نا کہ وہ صاحبہ کون تھیں۔

ارے، تم تو پامسٹری بھی جانتی ہو۔

اور ہاں، یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کی ڈانٹ پر آپ کا چہرہ کیوں اتر گیا تھا۔

کیوں اُتر گیا تھا؟

آبگینہ نے کہا۔

اس لئے کہ آپ اسے ٹیوٹر رکھنا چاہتے تھے مگر ڈر گئے۔

کیوں ڈر گئے؟

ڈانٹ سے ——— آبگینہ نے کہا۔ باجی بہت اچھی ہیں مگر سبق یاد نہ کرو تو ڈانٹتی ہیں۔

مگر مجھے تو سبق بھی یاد تھا مگر پھر بھی مجھے ڈانٹا۔

آبگینہ نے کہا۔

یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

سہیل نے کہا۔

تو چل کر ان سے پوچھنا چاہیئے۔

آبگینہ نے کہا۔

نہیں، جب وہ کل آئیں گی تو میں پوچھ لوں گی۔

سہیل نے کہا۔ واہ ڈانٹا مجھے اور پوچھیں گی آپ۔

آبگینہ نے کہا جس کو ڈانٹا جاتا ہے وہ تھوڑی پوچھ سکتا ہے۔

سہیل نے کہا۔ ہاں، اب زمانہ الٹا ہے۔ اب جس کو ڈانٹ پڑتی ہے، پوچھتا بھی وہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل انسان تھا فرشتہ نہیں۔ وہ زندگی میں پہلی بار جس لڑکی سے متاثر ہوا، وہ لبنیٰ تھی جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلتا کودتا رہا تھا شائد اس پسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ بچپن کے ساتھ کا ذہن پر بہت اثر ہوتا ہے۔ دوسرے اسے لبنیٰ کی سادگی اور وقار پسند تھا۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی اس میں انکساری اور عجز تھا۔ وہ سہیل سے عام لڑکیوں کی طرح شرماتی نہیں تھی۔ اکثر وہ کتنی کتنی دیر باتیں کرتے مگر لبنیٰ کبھی ضروری کام چھوڑ کر بھاگی بھاگی نہیں آتی تھی۔ اس کی ہر عادت، ہر بات میں ٹھہراؤ تھا۔ نرم رَو ندی کی طرح اور یہی بات اسے پسند تھی۔ آج سے پہلے وہ لبنیٰ کے ساتھ مستقبل کے رشتے پر خاموش تھا، یہ دونوں کے والدین کی پسند تھی، خواہش تھی، اور سہیل نے اس خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ ویسے بھی شادی ہر لڑکے کی ہونی ہی ہوتی ہے اکثر والدین کی پسند کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ وہ آئیڈیل کو یوں بھی فضول ہی سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لبنیٰ ایک دیکھی بھالی لڑکی ہے اور اس کے والدین کی پسند بھی۔ اسے یقین تھا کہ لبنیٰ ایک اچھی

بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے لبنیٰ کے کردار میں کبھی جھول نہ دیکھا تھا۔ وہ شروع سے جس طرح ملتی تھی، رشتے کی بات چلنے کے بعد بھی اسی طرح ملتی رہی۔ کل تک وہ اس رشتے سے مطمئن تھا بڑی حد تک خوش تھا مگر آج۔

آج

اس کے خیالات میں تغیر آ چلا تھا۔ اس کے خیالات بدل چلے تھے اور آج وہ اس لڑکی کو من میں بسا آیا تھا، جس نے اسے بچوں کی طرح ڈانٹ دیا تھا جس کے سامنے وہ مجرم بنا کھڑا تھا جس کے سامنے اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

وہ بڑبڑایا۔

خدایا، یہ کیسی کیفیت ہے، یہ کیسا جذبہ ہے کہ جس کے سامنے زبان نہیں کھلتی، جس کے سامنے اس کی حیثیت ایک کیڑے کے برابر رہ گئی ہے، دل اسے ہی چاہتا ہے۔

پھر اس نے دل کو سمجھایا۔

ارے احمق! تم خود کو دیکھو اور اس کو دیکھو، تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔

سہیل نے ذہن کو جھٹکا دے کر سوچوں کا رُخ بدلنے کی سعی کی۔ میں مقابلہ تھوڑی کر رہا ہوں میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ کون ہے جو میرے کے خیالوں میں چھائی جا رہی ہے یہ کون ہے جو میری پرسکون اور ٹھہری ہوئی زندگی میں تلاطم پیدا کر رہی ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا ایک بہت بڑا فیصلہ۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی زندگی بنائے گا جو اس سے حاکموں کی طرح پیش آئی تھی ——— انسان بھی عجیب چیز ہے کہ کبھی کبھی حاکم کی بجائے محکوم بن کر خوش رہتا ہے یہی کیفیت اس وقت سہیل کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے محکوم بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے دل سے شعاع کو اپنا حاکم مان لیا تھا۔

ادھر شعاع کے ذہن میں دور دور تک اس حادثے کا اثر نہ تھا۔ اس کا ذہن اتنا مصروف رہتا تھا کہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور یوں بھی اسے مرد کی ذات سے نفرت تھی۔ اب تک اسے اپنی پوری عمر میں صرف دو آدمیوں سے واسطہ پڑا تھا۔

نعمان

جو اس کا باپ تھا۔ جس کی اسے شبیہ تک یاد نہ تھی۔ جو پتہ نہیں ظالم تھا یا مظلوم۔

اور افتخار —— اس کی ماں کا دوسرا شوہر ایک گھٹیا اور پست انسان۔ ایک بے غیرت اور انسانیت سے گرا ہوا آدمی —— جس میں بے غیرتی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان کے علاوہ تیسرا مرد شعاع نے نہ دیکھا تھا۔

اور نہ ہی اسے دیکھنے کی تمنا تھی۔

مرد کے دو روپ ہی اتنے گھناؤنے تھے کہ وہ کسی تیسرے مرد کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مرد کا سایہ تک نہ پڑنے دے گی۔ پھر اس کا کیا سوال تھا کہ بیسل کو غور سے دیکھتی یا اس میں کوئی دلچسپی لیتی۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ کسی نوجوان نے اسے دیکھ کر اپنی زندگی کا رخ بدل لیا ہے۔

وہ بہت تھک گئی تھی۔ اپنے کمرے میں گھسی تو اس کی روم میٹ ناجیہ رحمان نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ شعاع بھی مسکرا دی۔ اس کے بعد کپڑے اٹھا کر غسل خانے میں بدلنے چلی گئی۔ واپس آ کر اس نے اپنے بال کھول دیئے اور کنگھی کرنے لگی۔ ناجیہ رحمان نے اس کے لمبے لمبے سنہری بالوں کی طرف رشک کی نظر سے دیکھا۔ جن کا گھنا سنہری جال شعاع کی پشت کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ گویا سونے کے باریک باریک تار پھیل گئے ہوں۔ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی۔ ناجیہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی

اور چپل میں پاؤں ڈالتی ہوئی بولی۔

چلو شعاع کھانا کھا لیں۔

تم چلو۔ میں منہ دھو کر آتی ہوں۔

تم منہ دھو لو میں انتظار کر لیتی ہوں۔

شعاع دوبارہ غسل خانے میں چلی گئی۔ ناجیہ اور وہ آپس میں اجنبی نہ تھیں۔ گو زیادہ میل ملاقات بھی نہ تھی مگر علیک سلیک تو تھی ہی۔ ناجیہ کو شعاع بے حد پسند تھی۔ خصوصاً اس کے خاموش لب اور بولتی ہوئی آنکھیں جو لوگوں کے دل پر عجیب اثر کرتی تھیں۔ شعاع منہ دھو کر آئی تو اس کے سرخ سرخ گالوں پر عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ ناجیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دل ہی دل میں بولی کتنا سادہ حسن ہے۔

دونوں خاموشی سے ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئیں۔ برابر برابر کی نشستوں پر بیٹھ کر دونوں نے کھانا کھایا۔ بہت سی نظروں نے اسے چونک کر دیکھا۔ بہتوں کے لئے وہ چہرہ اجنبی تھا۔ مگر شعاع سب کی نظروں سے بے پرواہ کھانا کھا رہی تھی۔ مگر ناجیہ نے دیکھا وہ ہر لقمہ بڑی بے دلی سے اٹھاتی تھی گویا جی نہ چاہتا ہو۔ وہ بولی۔

کیا کھانا پسند نہیں آیا۔

شعاع چونک کر بولی۔

نہیں ٹھیک ہے۔

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا چیز تھی کہ ناجیہ دوبارہ بات نہ کر سکی۔ شعاع نے برائے نام ہی کھانا کھایا تھا۔ وہ تھک بہت گئی تھی۔ اب سونا چاہتی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ فوراً بستر پر جا لیٹی۔

چند لمحوں بعد ہی ناجیہ نے دیکھا شعاع گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر تھکن ہی تھکن تھی۔ گلاب کی پتی کے سے ہونٹ خفیف سے کھلے تھے۔ پلکوں کے کناروں پر سنہری افشاں سی چمکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سیدھی لیٹی ہوئی بے سدھ سو رہی تھی۔

ناجیہ چند لمحے اسے محبت اور ترس کے ملے جلے جذبات سے دیکھتی رہی، پھر وہ اٹھی اور اس نے آہستہ آہستہ شجاع کا ہاتھ سینے سے ہٹا کر تکئے پر رکھ دیا، روشنی سیدھی شجاع کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ناجیہ نے کمرے کا بلب گل کر دیا اور ٹیبل لیمپ کا شیڈ اپنے بستر کی طرف جھکا لیا۔ اور وضو کرنے چلی گئی۔ جا نماز بچھاتے ہوئے اس نے شجاع کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت کھیل رہی تھی۔ ناجیہ نے مسکرا کر نیت باندھ لی۔

شجاع، اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

شجاع نے سر اٹھا کر دیکھا، لبنیٰ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب تذبذب تھا۔ اس لئے جب تک شجاع خاموش ہوتی، معلوم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اب کیا بولے گی۔ اس کے خشک لہجے سے لبنیٰ بہت گھبراتی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ شجاع سے بات کر لیا کرتی تھی۔ شجاع کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو لبنیٰ پلٹ کر اس کی شکل نہ دیکھتی، مگر شجاع تو واقعی شجاع تھی، جس کی طرف کوئی دیکھے نہ دیکھے وہ خود بخود مجبور کر دیتی تھی کہ مجھے دیکھو۔

خلافِ توقع شجاع نے جواب دیا۔

ٹھیک ہوں ـــــ شکریہ

میں یہاں بیٹھ جاؤں؟

بیٹھ جایئے۔

لبنیٰ بیٹھ گئی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اس کے بیٹھتے ہی شجاع اٹھ کر نہ چل دے۔ شجاع خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ لبنیٰ نے کہا۔

آج سعدیہ نہیں آئی؟

آئی ہے ذرا لائبریری کی طرف گئی ہے۔

شجاع خاصے سلیقے سے جواب دے رہی تھی۔ آخر ڈرتے ڈرتے لبنیٰ نے مطلب کی بات کی

شجاع، میرے گھر آئیں گی؟

شجاع نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کے دماغ میں کوئی خرابی ہو۔ پھر بولی۔

کیوں، کس لئے؟

میں اگر آپ کو بلاؤں تو۔

کس سلسلے میں؟

لبنیٰ نے ایک چھپا ہوا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ شجاع نے سوچا۔

اونہہ ہوگی کسی بہن بھائی کی شادی۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے یہ لوگ رعب دکھائیں گے کہ ہم امیر ہیں۔ اور امیروں کے ان چونچلوں سے ہی اس کی جان جاتی ہے۔ وہ کبھی کسی شادی میں شریک نہ ہوئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی کارڈ کو گھورتی رہی۔ آخر لبنیٰ نے کہا۔

آئیں گی نا آپ؟

نہیں، میں شادیوں میں شریک نہیں ہوا کرتی۔

لبنیٰ ہنس دی، شجاع کے بھولپن پر، اور بولی۔

یہ شادی کا کارڈ نہیں ہے، میرے بھائی سلمان کی سالگرہ ہے۔

اتنے میں سعدیہ آگئی، دھپ سے کتابیں گھاس پر پھینک کر خود بھی لیٹ گئی۔ لبنیٰ کو دیکھ کر بولی۔

کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لبنیٰ نے ایک کارڈ اور نکالا اور سعدیہ کے ہاتھ میں دے کر بولی۔

سعدیہ، میرے بھائی کی سالگرہ ہے، آپ ضرور آیئے گا اور شعاع کو لانا بھی آپ کا رہا۔ اگر آپ شعاع کو نہ لا سکیں تو میں آپ سے خفا ہو جاؤں گی۔

سعدیہ نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا۔

او کے میڈم، میں پوری کوشش کروں گی، مگر سوچ لیں تقریب شام کی ہے شعاع ہوسٹل میں رہ رہی ہے۔

لبنیٰ جاتے جاتے رک گئی اور حیرت سے بولی۔

ارے، یہ ہوسٹل میں آگئیں، اللہ شعاع بھی کتنی جگہیں بدلتی ہے —— اچھا چلتی ہوں۔

سعدیہ نے ہنس کر کہا۔

جایئے، خدا حافظ۔

لبنیٰ خوش دلی سے مسکرا کر چلی گئی۔ سعدیہ اسے دور تک جاتا دیکھتی رہی پھر کتاب اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔

اچھی لڑکی ہے۔

شعاع گم سم بیٹھی تھی۔ اس نے کارڈ کو چھوا تک نہ تھا۔ سعدیہ نے اس کے منہ کے آگے اپنا ہاتھ نچایا۔ مگر شعاع ویسے ہی بیٹھی رہی۔ آخر سعدیہ نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا تو چونک اٹھی۔ سعدیہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں کچی نیند کا سا خمار تھا۔ سعدیہ کو ترس آ گیا پیار سے بولی۔

کیا رات کو نیند نہیں آئی تھی؟

آئی تھی۔

پھر کہاں گم ہو؟

شعاع نے کہا۔

سعدیہ میں تھک گئی ہوں اس زندگی سے۔

سعدیہ نے کہا۔

اے ارے، ابھی سے، تمہارے حوصلے تو بہت بلند تھے۔

شعاع نے کہا۔

تم بھی ٹھیک کہتی ہو اگر تھک گئی تو پیچھے رہ جاؤں گی اور پیچھے رہنے کا طعنہ کون سُنے۔

سعدیہ نے اسے حیرت سے دیکھا، پھر بولی۔

اچھا، چھوڑو یہ فلسفہ بولو چلو گی۔

کہاں؟

لبنیٰ کے بھائی کی سالگرہ پر۔

نہیں۔

کیوں بھلا؟

تم جانتی ہو سعدیہ، مجھے سرمایہ داروں سے نفرت ہے، ان کے ہاں کی ہر تقریب دراصل اپنی دولت کا دکھلاوا ہوتی ہے۔ جتنا پیسہ یہ لوگ ان فضول تقریبات پر لگاتے ہیں اس سے کسی غریب کی مدد کیوں نہیں کر سکتے، کسی یتیم لڑکی کی شادی کیوں نہیں کر دیتے، کسی نادار طالب علم کی فیس کیوں نہیں دے دیتے۔

سعدیہ نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، مگر بنی تمہیں بہت چاہتی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا
تمہیں لے کر ہی جاؤں گی۔

میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، تم نے یہ وعدہ کیوں کیا۔

سعدیہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

شعاع! میں آئندہ تم سے کچھ نہیں کہوں گی، ایک بار میری یہ بات مان لو، تمہیں
دوستی کا واسطہ۔

شعاع کو بہت افسوس ہوا۔ سعدیہ اس کی عزیز ترین سہیلی تھی جو اس سے بہن
سلوک کرتی تھی۔ اس کے محبت کے بھی حقوق تھے جو آج تک شعاع نے پورے نہیں کئے
سعدیہ کی التجا پر اس کا دل پگھل گیا، بے اختیار اس نے سعدیہ کا ہاتھ چوم لیا اور
لہجے میں بولی۔

سعدی! مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے، میں تمہاری کہی ہوئی ہر بات مانوں گی
خفا نہ ہونا۔

سعدیہ کے آنسو گال پر ڈھلک آئے اس نے حسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

سچ کہہ رہی ہو شعاع؟

بالکل سچ۔

میری اچھی بہن۔

سعدیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شعاع کو اسی وقت گلے لگا لے۔ اسے واقعی شعاع سے
بہت محبت تھی۔ شعاع نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

کیا وقت لکھا ہے کارڈ میں؟

خود پڑھ لو نا۔

شعاع نے بڑے تکلف سے کارڈ اٹھایا سنہری چھپائی میں شام چار بجے کا وقت دیا گیا تھا کہنے لگی۔

اُف سعدیہ، اس وقت تو بہت دھوپ ہوتی ہے۔

تو کیا ہوا تم پانچ بجے تیار ہو جانا میں تمہیں ہوسٹل سے لے لوں گی۔

ٹھیک ہے۔

شعاع رضامند ہو گئی مگر یک دم پریشان سی ہو کر بولی۔

ارے سعدیہ، مجھے تو اس وقت مسز فاروقی کے ہاں جانا ہوتا ہے میری اچھی سعدی اب
کیا کروں؟

سعدیہ نے دانت کچکچا کر کہا۔

جی چاہتا ہے ایک جھانپڑ دوں، ذرا سی بات کا ہوّا بنا لیتی ہے، مرنی کیوں ہے آج ہی
جا کر فون کر دوں گی، اب تو ٹھیک ہے نا؟

شعاع نے لمبی سانس لی اور بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حنا نے نعمان کے سر کے نیچے تکیہ ٹھیک سے رکھا۔ نعمان نے مسکرا کر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ حنا شرما گئی۔ نعمان نے ہنس کر کہا۔

اس عمر میں شرماتی ہو؟

کیا عمر کے ساتھ ساتھ شرم ختم ہو جاتی ہے۔

میں نے کب کہا۔

اچھا چھوڑیئے، یہ بتایئے کل شام کے لئے سب لوگوں کو کہہ دیا۔

کہنا کیا معنی، کارڈ تھے بھجوا دیئے صمد کے ہاتھ۔

ٹھیک ہے۔

حنا اٹھ کر گئی اور کولڈ کریم ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولی۔

موسم اتنا بدل گیا ہے مگر ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔

نعمان خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ حنا کو پوجنے لگے جس نے اسے زندگی میں ایسے وقت سہارا دیا تھا جب اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اپنے بچے تو اپنے ہوتے ہیں مگر اس نے لبنیٰ کی تربیت ایسے ڈھنگ سے کی تھی کہ وہ حنا سے بے حد محبت کرتی تھی۔ لبنیٰ کا خیال آتے ہی نعمان نے کہا۔

حنا تم نے لبنیٰ سے پوچھا۔

کیا ——— ؟

سہیل کے بارے میں۔

حنا آکر پلنگ پر اس کے برابر بیٹھ گئی اور نعمان کے ماتھے سے بال ہٹاتی ہوئی بولی۔

ابھی تو نہیں پوچھا، میں تو کہتی ہوں ضرورت ہی کیا ہے پوچھنے کی۔

نہیں حنا۔ لبنیٰ پڑھی لکھی لڑکی ہے، آج کل تو جاہل ماں باپ بھی اولاد کی رائے لیتے ہیں تم تو سمجھدار اور تعلیم یافتہ ہو۔

بہتر جناب، پوچھ لوں گی، ذرا سالگرہ کا ہنگامہ نکلے تو بات کروں گی۔

نعمان نے دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

بس اب دیر نہ کرنا، اس لئے کہ سہیل کے باپ نے پھر مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا بیگم سے مشورہ کروں گا۔

حنا ہنس کر بولی۔

مشورہ تو ٹھیک ہے بیگم سے کریں گے مگر بیگم کی طرف سے رُخ کیوں موڑ لیا۔

نعمان بھی ہنس دیا اور بولا۔

تم خود بوجھ لو، ہم نہیں بتائیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنا کے دل کی کلی کھل سی گئی۔ اس نے روشنی بند کر کے ہلکا بلب جلا دیا اور جب وہ بستر پر لیٹی تو اس نے دیکھا نعمان کی خوبصورت آنکھوں میں نیند گھل سی گئی تھی۔ جنا نے بڑے پیار سے اپنا ہاتھ نعمان کے ماتھے پر رکھا اور بڑی محبت سے بولی۔

سو جایئے۔

اور نعمان نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پانچ بجنے والے تھے اور شجاع بھی تیار تھی۔ خوبانی رنگ کے کاٹن کے سادہ سوٹ نے اس کی سنہری رنگت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ سیاہ اونچی ایڑی کے جوتے میں اس کے سفید برف سے پیر کنول کے پھول معلوم ہوتے تھے۔ سنہری بالوں کی لمبی سی چوٹی اس نے ڈھیلی سی باندھی تھی اس لئے ایک شریر لٹ نکل کر اس کی کنپٹی پر جھول رہی تھی۔ شجاع نے آئینے میں خود کو دیکھا اور پرس میں دھلا ہوا رومال رکھ رہی تھی کہ سعدیہ آ گئی۔ شجاع نے حیرت سے اسے دیکھا نیلی سفید ستاروں والی ساڑھی اور چاندی کے زیور نے سعدیہ کی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، میک اپ بھی خاصا کیا ہوا تھا۔ شجاع کو دیکھ کر بولی۔

ارے پانچ بج گئے اور تم تیار نہیں ہو؟

شجاع نے ایک نظر خود پر ڈالی اور بولی۔

تیار تو ہوں۔

سعدیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور بولی۔

اس طرح جاؤ گی، ارے سالگرہ میں اس طرح جاؤ گی۔

اور کس طرح جاؤں۔

کوئی اچھے سے کپڑے پہنو۔

کیوں ان کپڑوں میں میں شجاع نہیں لگتی۔

لگتی ہو مگر۔ . . .

شجاع کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"دیکھو سعدیہ تم میری عادت سے واقف ہو، ایسے جانا ہو تو اسی طرح جاؤں گی، ورنہ نہ جاؤں"

سعدیہ نے بے بسی سے ناجیہ کی طرف دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔ بولی۔

ٹھیک تو کہتی ہے شجاع، دیکھو تو اور بھی پیاری لگ رہی ہے۔

شکریہ —— کہو کیا کہتی ہو۔

سعدیہ نے طویل سانس لی اور بولی۔

چلو بابا تمہارے ساتھ کوئی جیتا ہے۔

مگر سچی بات تھی کہ سعدیہ کو اپنے بھاری کپڑوں اور زیور سے الجھن ہونے لگی تھی اس نے چپکے سے لپ اسٹک صاف کر دی۔ جب وہ دونوں لبنیٰ کی ہلکے گلابی رنگ کی کوٹھی کے گیٹ پر اتریں تو شجاع کو ایک خوشگوار سا احساس ہوا، حالانکہ وہ اس کوٹھی میں پہلی بار آئی تھی مگر یہاں آ کر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ جگہ اس کے لئے اجنبی نہ ہو۔ جیسے یہ اس کا اپنا ہی گھر ہو، جیسے وہ اسی گھر کی مکین ہو۔

اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا۔

ایسا کیوں لگ رہا ہے۔ میں ایسا کیوں محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے تو سرمایہ داروں سے، دولت مندوں سے، دولت کی نمائش کرنے والوں سے سخت نفرت ہے . . . . پھر میں ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیوں محسوس کر رہی ہوں۔

یہ کون لوگ ہیں؟

یہ گھر کس کا ہے

اس کے ذہن میں دھواں سا بھرنا شروع ہوگیا۔

برآمدے میں نعمان صاحب سہیل کے ساتھ بیٹھے تھے۔

نعمان صاحب کی نظر پہلے تو سعدیہ پر پڑی اور پھر شعاع پر۔ . . . وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

یہ کون ہے؟

یہ لڑکی کون ہے؟

اس کی چال، اس کا انداز کس کا انداز ہے؟

اس کا ذہن ماضی میں کھو گیا۔

یہ تو غزالہ ہے۔

ہو بہو غزالہ۔

غزالہ . . . نہیں نہیں، اس کے دل سے ایک آواز اٹھی۔

اتنے سال بیت گئے، اتنا زمانہ گزر گیا۔ وہ بوڑھی ہوگئی ہوگی۔

تو پھر یہ لڑکی کون ہے؟

اور نعمان کے ذہن میں ایک دھواں ابھرنا شروع ہوگیا۔

سہیل جو سلمان کی سالگرہ میں آیا ہوا تھا، جس کا ذہن شعاع کی وہ جھلک اب تک نہ بھولا تھا۔ وہ شعاع کو نعمان صاحب کے گھر میں دیکھ کر بوکھلا گیا۔

یہ یہاں کیوں چلی آئی؟

یہ یہاں کیوں چلی آئی؟

میں تو اسے یہاں سے دور رکھنا چاہتا تھا، میں . . . تو اسے کسی اور انداز میں اپنے والدین کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ خدایا یہ سب کیا ہے۔؟

اور سہیل کے ذہن پر دھوئیں کا غبار چھا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع کے دماغ پر دھوئیں کا ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ… گھر جہاں وہ پہلی بار آئی ہے۔ اسے اجنبی کیوں نہیں لگ رہا۔ نعمان شجاع کو دیکھ کر پریشان تھا کہ… دوسری غزالہ کہاں سے چلی آئی۔ اور سہیل اس لئے پریشان تھا کہ وہ کسی اور رنگ میں اسے اپنے… کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شجاع کی یہاں آمد اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور… کرنے کے لئے سخت پریشان تھا۔

اور پھر نعمان اور سہیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

دونوں کی چوری پکڑی گئی۔

دونوں نے محسوس کیا کہ دونوں ہی اس لڑکی کو دیکھنے میں محو تھے۔

لیکن

دونوں کے دیکھنے میں فرق تھا، دونوں کے انداز جداگانہ تھے۔

شجاع نے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کے باوجود کچھ محسوس نہ کیا۔ ایک ناگوار سے احساس سے نعمان کو وہ پہچان گئی تھی۔ جب شجاع نے اسے پہلی بار دیکھا تو اسے اس باوقار انسان سے ایسی انسیت محسوس ہوئی تھی جیسے وہ مردوں سے الگ فطرت کا ہو۔ اسے وہ اجنبی نہ لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے مدتوں سے جانتی ہو۔

مگر

اس کے بعد کی دونوں ملاقاتوں میں اس نے نعمان کو ایک بار پھر ان ہی لوگوں میں شامل کر دیا تھا جن سے اسے نفرت تھی اسے یاد آیا کہ جب وہ نوکری کی تلاش میں گئی تھی تو ہل مالک کے روپ میں نعمان نے اسے گھور گھور کر دیکھا تھا اور آج پھر شجاع کو محسوس ہوا کہ شجاع کو دیکھ کر وہ کسی اور طرف دیکھنا بھول گیا تھا۔

شجاع نے سہیل کے دیکھنے کا انداز بھی نوٹ کیا اور اسے بُرا بھی لگا لیکن وہ یہ نہ جان کر کہ یہ وہی شریر لڑکا ہے جسے اس نے ڈانٹ دیا تھا شجاع نے اسے امیرزادوں کی صف میں شامل کر دیا جو مشغلے کے طور پر لڑکیوں کو دیکھتے ہیں۔

یہ احساسات چند لمحوں میں ہی اس پر طاری ہو گئے۔ سعدیہ نے لنعمان کو ادب سے سلام کیا مگر… شجاع کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی اور وہ سر جھکائے سعدیہ کے ساتھ گول کمرے میں داخل ہو گئی وہ دونوں… چونکہ پہلی دفعہ آئی تھیں اس لئے دروازے کے پاس ہی رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں تاکہ لبنیٰ مل جائے اور شجاع کو یہ دیکھ کر ذرا تعجب سا ہوا کہ گول کمرے میں محفلِ میلاد کا انتظام تھا اور مہمان بیبیاں گردنیں گھما گھما کر انہیں دیکھ رہی تھیں اور سامنے والے کمرے میں بہت سے غبارے اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں یعنی دونوں طرز کا انتظام تھا اور پھر اسی کمرے سے نکل کر لبنیٰ ان کی طرف آئی۔ وہ… گہرے نیلے سادہ سوٹ میں تھی اور کانوں میں بہت خوب صورت ٹاپس پہنے ہوئے تھے۔ وہ…

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر جھکتی ہوئی ان دونوں کی طرف لپکی اور ایک خاموش تعریفی نگاہ سعدیہ پر ڈال کر سر ہلانے لگی اور پھر شجاع کا سفید نرم ہتھیلی والا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی اور عورتوں میں سے بیٹھی ہوئی ایک سفید ساڑھی والی عورت اٹھی اور وہ چاروں دوسرے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

کمرہ خوب صورتی سے سجا ہوا تھا بقول شجاع کے امیروں نے اپنا رعب دکھایا تھا۔ لبنیٰ نے انہیں صوفوں پر لا بٹھایا اور بولی۔

"دیکھئے امی یہ شجاع ہے اور یہ سعدیہ اور بھئی یہ میری پیاری امی۔"

دونوں لڑکیوں نے آداب کیا وہ دعائیں دے کر بولی:

"کچھ دیر یہاں بیٹھو اور بعد میں جی چاہے تو میلاد سننے آجانا۔"

"اور امی میں کیا کروں" لبنیٰ نے بڑے لاڈ سے پوچھا اور رجنا نے اس کے سنورے بالوں کو خواہ مخواہ سنوارا اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم بھی ان کے پاس بیٹھو، میں اب جاتی ہوں"

وہ چلی گئیں تو سعدیہ نے کہا:

"اللہ لبنیٰ تمہاری امی تو تمہاری بہن لگتی ہیں۔"

لبنیٰ فخر سے مسکرائی اور اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں بولی:

"سب بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔"

کتنے بھائی بہن ہو تم لوگ؟

"بہن تو میں اکیلی ہوں، بھائی ماشاء اللہ تین ہیں۔ سلمان، عرفان اور ذیشان۔ مجھ سے کافی چھوٹے ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔"

سعدیہ نے خاص عورتوں کے انداز میں کہا۔

لبنیٰ ہنس پڑی، اس نے ایک نظر شجاع کو دیکھا وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

لبنیٰ نے کہا:

"شجاع تمہارا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کہ تم نے غریب خانے کو رونق بخشی۔ امی کو تمہیں دیکھنے کا بہت شوق تھا اور سعدیہ میں تمہاری آمد کی بھی شکر گزار ہوں اور اس سے بڑھ کر کہ تم شجاع کو لے آئی ہو۔"

سعدیہ نے مسکرا کر کہا:

"کیوں شرمندہ کرتی ہو۔۔۔ بلکہ ہوتی ہو۔"

وہ دونوں باتیں کرنے لگیں اور شجاع سوچنے لگی کہ لبنیٰ نے شاید طنزیہ بات کی ہے یا زیادہ ہی بھاری الفاظ استعمال کر گئی ہے۔ اف یہ ظاہرداری۔۔۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ لبنیٰ اسے ہی دیکھ رہی تھی اور اس کی سیاہ آنکھیں گہرے خلوص اور محبت سے چمک رہی تھیں، بہت ڈھونڈنے پر بھی شجاع ظاہرداری یا بناوٹ کا ہلکا سا سایہ بھی نہ ڈھونڈ سکی۔ لبنیٰ نے اسے یوں مصروف دیکھ کر کہا:

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

شجاع نے مخصوص روکھے لہجے میں جواب دیا۔

لبنیٰ خاموش سی ہو گئی اور شجاع نے دیکھا کہ لبنیٰ کی امی نے اس کے بالوں کو چھوا تھا تو چند بال باہر نکل کر کنپٹی پر جھول گئے تھے جنہیں لبنیٰ نے سمیٹا نہیں تھا۔ شجاع کے دل میں ہوک سی اٹھی کہ کاش اس کی ماں نے بھی کبھی اس کے سنورے ہوئے بالوں کو اس طرح بکھیرا ہوتا۔ اسے تو بالکل یاد نہیں تھا کہ کبھی غزالہ نے اسے اس طرح محبت بھری نظروں سے دیکھا ہو جیسے لبنیٰ کی امی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا تھا۔

اور پھر اسے یاد آیا کہ لبنیٰ کا باپ بھی اسے کس قدر چاہتا ہے۔

اس پر اس کا ذہن نعمان کی طرف پلٹ گیا اور وہ غور کرنے لگی کہ باوجود اس کے
نعمان کا اس طرح دیکھنا برا لگتا تھا لیکن اس کی نظروں میں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ ایسا
شریف آدمی لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر کس قدر وقار اور شرافت ہے مگر مجھے کسی کی شرافت
کیا لینا۔

سعدیہ کا باپ بھی تو کتنا باوقار اور شریف لگتا تھا۔

مرد جو کچھ ظاہری طور پر نظر آتا ہے باطنی طور پر مختلف ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا باپ
ماں کو چھوڑ کر نہ جاتا۔

وہ سوچ رہی تھی نہ جانے وہ کہاں ہوگا اور کس عورت کو نیا دھوکا، نیا فریب دے رہا
اسے اس بات کا خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنی بچی کو بھی چھوڑ آیا تھا۔

ظالم مرد

شعاع نہ جانے کب تک ان خیالوں میں کھوئی رہتی کہ لبنیٰ کی آواز سے چونک پڑی۔

لبنیٰ کے پاس ایک بہت ہی پیارا لڑکا کھڑا تھا۔

لبنیٰ کی طرح کالی آنکھیں اور کالے بال۔ گلابی گلابی گالوں والا یہی کوئی دس برس کا ہوگا
اسے دیکھتی رہی وہ بہت پیارا سا تھا۔ لبنیٰ نے اس کا تعارف کرایا:

"شعاع! یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے سلمان۔ یہ ہر سال ضد کر کے اپنی سالگرہ مناتا ہے۔"

سلمان شرمندہ ہو گیا۔ اس نے شعاع کو سلام کیا اور جلدی سے چلا گیا۔

شعاع نے دیکھا وہ اطلسی شیروانی کے بجائے بادامی کرتے شلوار میں ملبوس تھا پشاوری

پہلے وہ عام سے گھرانے کا لڑکا لگ رہا تھا۔۔۔

سادگی ہر بات میں سادگی۔

شعاع نے پہلی دفعہ دل ہی دل میں اعتراف کیا اس نے نگاہ بھر کر لبنیٰ کی طرف دیکھا۔

بیرا شربت لے آیا تھا اور وہ گلاس اٹھا رہی تھی۔

سیدھی سادی سی سادہ کپڑوں میں ملبوس شعاع کو وہ بہت اچھی لگی اور ان دونوں سادہ سی
لڑکیوں میں سعدیہ خود کو بہت عجیب محسوس کر رہی تھی۔ اس کی بھاری کام کی ساڑھی اس کے ذہن پر
ایک بوجھ سا بن گئی تھی۔

وہ تینوں وہیں بیٹھی رہیں۔ میلاد کی محفل ختم ہوئی اور عورتیں اسی کمرے میں آگئیں جہاں یہ تینوں
بیٹھی تھیں۔

سالگرہ کی تقریب شروع ہوئی۔ سلمان نے شیشے کے کام کی ٹوپی اوڑھ لی اور موم بتیاں بجھا کر
کیک کاٹ دیا۔ تالیوں کے بعد سب نے سلمان کو تحفے دینے شروع کیے۔ شعاع نے پرس میں سے
گلابی لفافہ نکال کر سلمان کو دے دیا۔ حنا پاس ہی کھڑی تھی اس نے بالکل اسی طرح شعاع کے سر پہ
ہاتھ پھیرا جس طرح لبنیٰ کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

شعاع کا جی چاہا وہ اس کے سینے سے لگ جائے۔ اتنی محبت دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اس
نے منہ پھیر کر آنسو صاف کر لیے۔

وہ پگلی کسی نے نہیں دیکھا مگر نعمان وہ آنسو دیکھ چکا تھا۔ اس کے دل پر چوٹ پڑی۔ یہ
کشش یہ انجانی کشش بے سبب نہیں ہو سکتی۔

نعمان نے دیکھا لبنیٰ کیک کاٹ کر سب کی پلیٹوں میں رکھ رہی تھی اور حنا عورتوں میں
مصروف تھی وہ چاہتا تھا کسی طرح اس لڑکی کا نام معلوم کر سکے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل نے بھی خود کو عجیب سا محسوس کیا اور وہ برآمدے میں جا بیٹھا۔

تقریب ختم ہو چکی تھی۔ مہمان جا چکے تھے۔ سعدیہ اور شعاع نے جانا چاہا مگر لبنیٰ نے اصرار کر کے روک لیا۔ اس نے کہا کہ میں کھانا کھائے بغیر نہ جانے دوں گی۔ شعاع جو کہیں تھوڑی دیر رکنے کو تیار نہ ہوتی تھی، صوفے پر ایسے بیٹھ گئی جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ سعدیہ نے سوالیہ نظروں سے شعاع کی طرف دیکھا۔

شعاع نے کہا۔

"سعدیہ! دراصل کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں چند منٹ اور سستا لوں۔"

لبنیٰ نے کہا۔

"تو چلو چل کر لان میں بیٹھتے ہیں۔"

سعدیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

اور تینوں آ کر لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئیں

سعدیہ نے کہا:

"رات ہو جائے گی۔"

لبنیٰ نے کہا:

"فکر مت کرو، ابو چھوڑ آئیں گے۔"

لان میں یہ تینوں گپ ہانک رہی تھیں کہ نعمان صاحب آ نکلے۔

دراصل وہ جان کر، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کمرے میں سے نکل کر لان میں آئے تھے۔ انہیں تجسس تھا وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ لڑکی کون ہے؟

جب وہ لان میں آئے تو انہیں دیکھ کر تینوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔

لبنیٰ نے کہا:

"ابو! یہ میری سہیلی ہے سعدیہ اور یہ شعاع۔"

شعاع

شعاع

شعاع

نعمان کو ہر طرف سے گھنٹیاں سی بجتی محسوس ہونے لگیں۔ ہر طرف یہ شور بپا تھا۔

یہ شعاع ہے

یہ شعاع ہے

وہ بت بنا دیکھ رہا تھا کہ لبنیٰ نے کہا:

"ابو جی کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اور نعمان کرسی پر بیٹھ گیا اور سنبھل گیا۔ اس نے خود پر قابو پا کر کہا:

"بیٹی! دراصل آج کل کچھ کمزوری محسوس کرتا ہوں، اکثر چکر سے آ جاتے ہیں۔"

"ابو جی! آپ آرام بھی تو نہیں کرتے۔" لبنیٰ نے کہا۔

نعمان نے کہا:

"نہیں بیٹے عمر کا تقاضا ہے۔ اب میں بڈھا بھی تو ہو گیا ہوں۔"

لبنیٰ نے کہا:

"ابو جی! آپ اور بڈھے ابھی تو لڑکیاں آپ کو میرا بڑا بھائی سمجھتی ہیں۔"

نعمان نے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے ——— مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ میں جوان بیٹیوں کا باپ ہوں۔"

بیٹیاں ——— تینوں نے چونک کر دیکھا۔

نعمان نے ان کے چونکنے کو محسوس کر لیا تھا مگر اس نے اسے نظر انداز کر کے شجاع سے کہا۔

"بیٹی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی شجاع۔"

"بیٹی کسی دن اپنے ابو کو ساتھ لاؤ۔ ہم تمہارے ابو سے دوستی کریں گے۔"

شجاع چپ ہو گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاں ہاں کہو بیٹی! کیا بات ہے۔ کیا وہ بڑے آدمی ہیں اور یہاں آنا پسند نہ کریں گے تو میں کسی دن لبنیٰ کو ساتھ لے کر ان سے ملنے چلا آؤں گا۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

"تو . . . ."

"دراصل وہ مصروف رہتے ہیں۔"

نعمان نے کہا:

"کاروبار کرتے ہیں کیا؟"

"کاروبار . . " شجاع پریشان ہو گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسے کبھی اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس قسم کے سوالات کے جواب دینے ہوں گے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

"دراصل وہ یہاں نہیں ہیں۔"

نعمان نے کہا:

"کہاں ہیں؟"

شجاع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے، اسے تو خود پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ اگر شروع میں صاف صاف جواب دے دیتی تو سوالوں کی نوبت ہی نہ آئی ہوتی۔

نعمان نے پھر پوچھا۔

"بیٹی! آپ نے بتایا نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟"

شجاع نے کہا:

"جی وہ یورپ میں ہیں۔ وہیں کاروبار کرتے ہیں۔"

تب نعمان نے ایک اور سوال کیا:

"کیا نام ہے ان کا۔ اور پتہ بھی بتا دو، اگلے ماہ میں یورپ جاؤں گا تو ان سے مل کر آؤں گا۔"

شجاع نے کہا:

"جی وہ آپ کے ہم نام ہیں۔ پتہ میرے پاس نہیں ہے، امی کے پاس ہے۔"

"امی کہاں ہیں؟"

شجاع سوالوں سے تنگ آ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ جہنم میں۔ مگر اس نے زبردستی مسکراہٹ پیدا کی:

"جی وہ گھر پر ہی ہو سکتی ہیں۔"

نعمان نے اتنے سوال کئے تھے کہ تینوں پریشان ہو گئیں۔ نعمان نے کہا:

"اچھا میں اب اندر چلتا ہوں۔ دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور

وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا۔

نعمان کمرے میں پہنچا پورا کمرہ درو دیوار چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

نعمان وہ تمہاری بیٹی ہے۔

وہ تمہاری بیٹی ہے۔

وہ شجاع ہے۔

تمہاری سب سے چہیتی بیٹی۔

مگر

مگر وہ خود کو کیوں چھپا رہی ہے۔ کہیں اسے یہ معلوم تو نہیں کہ میں بدنصیب ہی اس کا باپ ہوں۔ کچھ بھی ہو، میں اسے بتا کر ہی رہوں گا کہ وہ میری ہی بیٹی ہے۔

جنا نے چائے اور کھانے کی چیزیں ٹرالی میں لگا کر برآمدے میں بھجوا دیں۔ دراصل موڈ کا بلاوا نہ تھا۔ نعمان گھر کا آدمی تھا اور سہیل کو بھی تقریباً یہی حیثیت حاصل تھی۔ جنا کا خیال تھا وہ برآمدے میں بیٹھے ہوں گے وہ بھی برآمدے میں چلی گئی۔ سہیل گیٹ کی طرف پشت کئے ذیشان سے باتوں میں مشغول تھا۔ جنا نے پوچھا:

شان تمہارے ابو کہاں ہیں؟

معلوم نہیں۔

ذیشان نے سادہ سا جواب دیا۔

پھر جنا نے سہیل سے پوچھا۔

انکل! کیک کاٹنے کے بعد سے انہیں نہیں دیکھا۔ میں تو بہت دیر سے ذیشان سے باتیں کر رہا ہوں۔

تو کیا انہوں نے چائے نہیں پی؟

میرے ساتھ تو نہیں پی

ذیشان نے کہا

امی اپنے کمرے میں ہوں گے کیونکہ گاڑی کھڑی ہے

جنا بے چین سی ہو کر اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ رات گہری ہو کر اتر آئی تھی۔ مگر نعمان اندھیرے ہی میں پڑا تھا۔ جنا نے روشنی کی تو نعمان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ جلدی سے قریب آ کر بولی:

آپ یہاں آ گئے ہیں۔ میں سمجھی باہر بیٹھے ہیں۔ چائے بھی نہیں پی منگواؤں؟

نعمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جنا اٹھ کر گئی اور فوراً ہی واپس آ کر نعمان کے پاس جا بیٹھی۔ نعمان نے گہری گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ سوچ اس کی پتلیوں میں ٹھہر سی گئی تھی جنا جانتی تھی کہ وہ جب پریشان ہوتا ہے تو اسی طرح الگ تھلگ آ کر لیٹ جاتا ہے جب تک جنا اس کے پاس آ کر وجہ نہ پوچھے اور وہ بھی کبھی بات چھپانے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ بیرا چائے لے آیا تو جنا نعمان کے متغیر چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے جنا نے اسے گرم چائے کی پیالی دی اور ساتھ ہی سالگرہ کا کیک بھی کھلایا۔ نعمان نے غور سے جنا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ نعمان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کی چمک ایک پل کو آئی اور چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ پھر لیٹ گیا۔ جنا نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے:

اب بتایئے کیا بات ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنا! میں نے آج پھر اسی لڑکی کو دیکھا۔

کس لڑکی کو؟

جسے دیکھ کر مجھے غزالہ کی یاد آ جاتی ہے۔ اس کا ایک ایک انداز اس جیسا ہے نہ جانے کیوں کچھ عرصہ سے بار بار میرے سامنے آتی ہے۔

جنا چند لمحے خاموش رہی کتنے دکھ کی بات ہے کہ اتنی مدت کی رفاقت پر وہ چند سال عادی ہو جاتے ہیں۔ اتنی چاہنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے وہ ایک بے وفا عورت کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتا تھا۔ یہ کتنے دکھ کی بات تھی مگر جنا اس دکھ کو اپنے دل میں چھپا لیتی تھی۔ وہ نعمان کے دکھ سکھ کی ساتھی بنی تھی۔ اسے نعمان سے محبت تھی اس لئے وہ ان خیالوں کو جھٹک دیتی تھی اس لئے اس نے پوچھا:

کہاں دیکھا اس لڑکی کو آپ نے؟

آج اس گھر میں وہ عنابی رنگ کا سوٹ پہنے تھی۔ اور اس کے ساتھ سادھی والی لڑکی تھی۔ جب تم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ جنا! خدا کے لئے معلوم کرو وہ لڑکی کون ہے؟

نعمان نے جنا کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے وہ چند لمحے نعمان کی طرف دیکھتی رہی اور پھر مدہم آواز میں بولی:

لبنیٰ نے مجھے بتایا تو تھا مگر میرے ذہن سے اس کا نام اتر گیا ہے۔ اتنا جانتی ہوں وہ لبنیٰ کی دوست ہے میں ابھی لبنیٰ سے معلوم کرواتی ہوں۔

جاؤ جنا تم جلدی سے لبنیٰ کو بلاؤ۔

جنا نے نعمان کے ہاتھ تھپتھپائے اور محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے لبنیٰ کو بلانے چلی گئی

یہ انتظار کے چند لمحے نعمان پر بہت بھاری تھے۔ وہ سر تھامے بیٹھا رہا۔ لبنیٰ جنا کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو باپ کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر گھبرا گئی۔ تڑپ کر بولی:

کیا بات ہے ابو جی؟

کچھ نہیں بیٹے، ادھر آؤ بیٹھو۔

جنا نے کہا:

لبنیٰ وہ عنابی سوٹ والی لڑکی کا کیا نام تھا بھلا؟

جی شعاع

نعمان نے ایک جھٹکے سے اس طرح سر اٹھایا جیسے بجلی گری ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جنا اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولی:

اس کے باپ کا کیا نام ہے؟

لبنیٰ گڑبڑا سی گئی۔ بہت سوچ کر بولی:

امی میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ ویسے ہے وہ پریشان سی لڑکی۔ ایک بار اسے ٹیکسی میں میں نے اس کے گھر چھوڑا تھا۔ پھر وہ ایک بابا نی عورت کی پے انگ گیسٹ بن گئی اور آج کل ہوسٹل میں رہتی ہے اور ایک جگہ ٹیوشن کرتی ہے۔

نعمان جواب تک ساکت بیٹھا تھا بولا:

کیا تم نے اس کا گھر دیکھا ہے؟

جی ابو باہر سے ہی دیکھا ہے اور یاد آیا باہر کسی کرنل کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی نام میں بھول گئی۔

نعمان نے پھر پوچھا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے والد کاروباری ہیں۔خیر کس طرف ہے اس کا گھر؟

غازی روڈ پر

نعمان اس سے زیادہ سن نہ سکا اور لیٹ گیا لبنیٰ نے حیرت سے حنا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی:

امی کیا بات ہے ابو بہت پریشان ہیں؟

حنا کی بجائے نعمان نے جواب دیا:

نہیں بیٹی! میں ٹھیک ہوں ذرا سر میں درد ہے

ابو کیا آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں؟

نعمان نے حنا کی طرف دیکھا اور بولا:

یہ لڑکی ایک دن ملازمت کی تلاش میں ہمارے مِل میں آئی مگر ٹھیک سے انٹرویو دیئے بغیر ہی درخواست اٹھا کر چلی گئی اس کی صورت میرے دوست کی بیٹی سے ملتی ہے میں نے سوچا وہی نہ ہو۔

ابو آپ کا دوست کرنل تھا کیا؟

نہیں بیٹے! وہ ایک معمولی آدمی تھا۔تمہارے باپ کی طرح بہت ہی معمولی آدمی....

اچھا اب تم جاؤ کھانا وغیرہ کھا کر سو جاؤ۔

لبنیٰ نے اٹھتے اٹھتے حنا کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بے اعتباری تھی جیسے وہ کہہ رہی تھیں کہ بات کوئی اور ہے مگر کیا بات ہے؟

حنا نے نگاہیں جھکا لیں۔

لبنیٰ، سعدیہ اور شجاع نے وہیں کھانا منگوایا۔کھانے کے بعد رات کافی ہو گئی تھی۔لبنیٰ کا

خیال تھا کہ اس کے ابو گاڑی میں ان لوگوں کو چھوڑ کر آئیں گے مگر ابو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔لبنیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابو شجاع کے لئے اس قدر کیوں پریشان ہیں۔انہیں اس قدر تجسس کیوں ہے مگر پھر یہ سوچ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ ابو تو نرم دل آدمی ہیں۔ہر کسی کے لئے یونہی پریشان ہو جاتے ہیں اور پھر شجاع کے لئے تو انہوں نے کہا بھی ہے کہ اس کی شکل ان کے دوست کی بیٹی سے ملتی ہے۔

پھر وہ دعائیں مانگنے لگی:

خدا کرے وہ ابو کے دوست کی بیٹی ہی نکلے اور ابو اسے گھر میں لے آئیں لبنیٰ کا جی چاہتا تھا کہ وہ شجاع سے معلومات حاصل کرے۔مگر وہ شجاع کی طبیعت اور موڈ سے اچھی طرح واقف تھی۔باوجود کوشش کے وہ اس سے معلوم کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔

لبنیٰ کو ایک پریشانی نے آن گھیرا۔اس نے اصرار کر کے ان لوگوں کو روک لیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ابو جی گاڑی میں چھوڑ آئیں گے۔مگر ان کی طبیعت خراب تھی اور ڈرائیور چھٹی پر تھا۔پھر اس کا دھیان سہیل کی طرف گیا اور اس نے سہیل سے کہا تو وہ گاڑی نکال لایا۔

لبنیٰ نے سعدیہ اور شجاع سے کہا:

ابو جی کی طبیعت خراب ہے اور ڈرائیور موجود نہیں ہے۔سہیل صاحب آپ کو ڈراپ کر آتے ہیں۔پھر اس نے رک کر کہا:

سہیل صاحب پاپا کے بہت اچھے رشتے دار ہیں۔

سہیل ڈرائیور تو نہیں تھا کہ دونوں لڑکیاں پیچھے بیٹھ جاتیں۔لہٰذا شجاع کو مجبوراً سامنے والی سیٹ پر بیٹھنا پڑا اور سعدیہ پیچھے بیٹھ گئی۔پہلے ان لوگوں نے سعدیہ کو اتارا۔اس کے بعد شجاع کو ہوسٹل چھوڑنا تھا.... اب یہ دونوں اکیلے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ سہیل کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہا تھا وہ بڑی مشکل سے کچھ الفاظ اکٹھے کر کے ان کا جملہ بناتا اور وہ ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی بکھر جاتے، پتیوں کی طرح منتشر ہو جاتے۔ پھر اس نے ہمت کی:

آپ کا نام شعاع ہے نا!

آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

نہیں اعتراض تو نہیں۔

جب اعتراض نہیں تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

سہیل نے بڑی ہمت کر کے تو ایک جملہ کہا تھا مگر شعاع نے جس طرح جواب دیا تھا اس کی اب پھر ہمت جواب دے گئی۔

تھوڑی دیر بعد پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

ایک بات اور پوچھنی ہے۔

پوچھیں۔

اپنے بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

شعاع نے کہا:

آپ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں۔ اس قدر بوکھلاہٹ کی ضرورت نہیں اس کے بعد آپ یہ پوچھیں گے کہ میں کیسا لگتا ہوں، تو جناب! میں صاف صاف بتا دوں کہ فضول باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میری عادت۔ اب آپ چپ چاپ گاڑی چلاتے رہیں اور ایک اچھے ڈرائیور کی طرح مجھے میری رہائش پر پہنچا آئیں۔

اس کے جواب میں سہیل خاموش ہو گیا اور راستے بھر اس نے کوئی بات نہ کی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر شعاع کو اس پر رحم آنے لگا۔

مگر

مگر

مگر وہ کیا کرے۔ خود کو سہیل سے بات کرنے کے لئے کیسے تیار کرے —— اسے تو مرد کے نام سے، اس کے سائے سے نفرت تھی۔ اس نے اب تک مرد کے جو روپ دیکھے تھے ان میں وہ ظالم نظر آیا تھا۔ یا پھر اوپر سے ملمع چڑھا ہوا اور اندر سے پیتل۔

کار چلتی رہی اور پورے راستے خاموشی کا راج رہا۔ ہوسٹل کے سامنے پہنچ کر کار رک گئی۔

شعاع نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر کر کہا۔

زحمت کا شکریہ، میرا لہجہ ناگوار گزرا ہو تو معذرت۔ حالانکہ بات میں نے کوئی غلط نہیں کہی۔

سہیل نے کہا:

شعاع، مجھے تو بس ایک ہی بات کہنی ہے کہ جتنا برا تم مجھے سمجھتی ہو، میں اتنا برا نہیں۔

میں تو چاہتا تھا —— میں تو چاہتا تھا —— اور وہ کہتے کہتے رک گیا۔

شعاع نے کہا:

آخر بات کیا ہے؟

میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی والدہ کو آپ کی والدہ کے پاس بھیج دوں؟

شعاع نے زور سے زمین پر پیر پٹخا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں! — نہیں! — نہیں۔

سہیل نے خدا حافظ کہا اور کار اسٹارٹ ہو گئی۔

اور

دور تک جاتی ہوئی کار کو دیکھتے ہوئے شعاع نے کہا:

میری تو ماں ہی نہیں سہیل، تم کس کے پاس اپنی والدہ کو بھیجو گے۔

اس دن شعاع صبح جلدی اٹھ گئی۔ ہوسٹل کی لڑکیاں گھاس پر ٹہل رہی تھیں۔ اسی لئے وہ بھی اسی طرح باہر نکل آئی۔ ابھرتی صبح نے سیاہی کو ملگجا سا کر دیا تھا۔ ہوا کے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو وہ خود بخود مسکرا دی۔ اس نے سوچا۔

صبح کتنی سہانی ہے۔

یہ تغیر آپ ہی آپ پیدا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس بات نے اس کا ذہن ہلکا کر دیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش سی تھی۔ بہت مدت بعد اسے یہ معمولی سی خوشی بہت اہم لگ رہی تھی۔ وہ بیر بہوٹی پر بیٹھ گئی۔ اور دور درخت کی سبز چوٹی پر پھسلتی سنہری دھوپ کو تکنے لگی۔ ناجیہ اس کے پاس آ بیٹھی تو شعاع کو ایسا محسوس ہوا، گویا کسی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک دیا ہو۔

چند لمحوں بعد وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ ناشتے کے بعد وہ یونیورسٹی چلی گئی۔ پہلے پیریڈ کے بعد اس نے دیکھا سعدیہ اور لبنیٰ گھاس پر بیٹھی ہیں۔ آج پہلی بار وہ لبنیٰ سے ملنے کے لئے آگے بڑھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔کیونکہ وہ باتوں میں مصروف تھیں۔شعاع کا جی چاہا کہ وہ پا
سے ہاؤ کر کے انہیں ڈرائے۔اس ارادے سے اس نے رفتار ہلکی کر دی۔یک دم اسے کو
شعاع

شعاع نے پلٹ کر دیکھا۔ناجیہ نے اسے پکارا تھا۔چونکہ پلٹ کر دیکھ چکی تھی اس نے
طور پر اسے رکنا ہی تھا،مگر صبح سے یہ دوسری بار اسے ناجیہ کی طرف سے کوفت ہوئی تو
لئے وہ ماتھے پر دس بل ڈال کر کھڑی رہی۔ناجیہ کو خود ہی اس کے پاس آنا پڑا۔ناجیہ نے
کیفیت پر غور کئے بغیر ہی کہا۔

شعاع تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔

مجھے؟

ہاں تمہیں۔

یہاں؟

ہاں۔

کون ہے؟

تمہاری امی

شعاع جو پہلے ہی حیرت زدہ تھی بولی

ناممکن۔

ناجیہ نے کہا۔

ہو سکتا ہے تمہاری کوئی اور رشتہ دار ہوں، بہرحال تم سے صورت ملتی ہے شاید بڑی
بہن ہو۔

ان سے کہہ دو، یہ یونیورسٹی ہے، آنا ہو تو ہوسٹل میں آئیں۔

ناجیہ شرمندہ سی ہو کر بولی،

تمہارے یونیورسٹی آنے کے بعد ہوسٹل میں ہی آئی تھیں۔میں نے ہی انہیں یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔

شعاع کو سخت غصہ آیا، تنک کر بولی:

"تو تم ہی بھگتا دو انہیں مجھے کیا کہنے آئی ہو"

ناجیہ بے حد شرمسار تھی ایک طرف اشارہ کر کے بولی۔

وہ کھڑی ہیں ایک پل تم ہی بات کر لو۔

اور شعاع نے دیکھا غزالہ گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے کنیر کے اونچے پودے کے پاس کھڑی تھی۔ایک نظر میں وہ یونیورسٹی کی طالبہ ہی لگ رہی تھی۔لمبا سا سیاہ بیگ کندھے سے لٹکائے وہ آہستہ آہستہ ان دونوں کی طرف بڑھی۔شعاع اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔موقعہ غنیمت جان کر ناجیہ تو کھسک گئی۔غزالہ نے آ کر کہا:

شعاع

فرمایئے مسز افتخار

غزالہ نے کڑوے گھونٹ کی طرح یہ فقرہ نگلا اور بولی:

بیٹی، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔

میں آپ کی بیٹی نہیں۔

کچھ بھی سہی، مگر میں تمہیں لینے آئی ہوں۔

دیکھیے مسز افتخار، یہ آپ کا گھر نہیں یونیورسٹی ہے۔میں یہاں کوئی ڈرامہ نہیں دیکھ سکتی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ تشریف لے جائیے۔ میرا اور آپ کا رشتہ ختم ہو چکا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسی دن ختم ہو گیا جس دن آپ مسز افتخار بنی تھیں۔

میں نہیں جاؤں گی۔

تو میں چلی جاتی ہوں۔

شعاع نے جانے کے لئے قدم بڑھائے تو غزالہ بولی۔

"جہاں جاؤ گی، تمہارے پیچھے آؤں گی"

آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟

میرے ساتھ گھر چلو۔

میں وہاں نہیں جاؤں گی، وہ میرا نہیں آپ کا گھر ہے۔

سب لڑکیاں دیکھ رہی ہیں آپ چلی جائیے۔

میں نہیں جاؤں گی۔

آپ شام کو ہوسٹل میں آئیے میں پھر آپ سے بات کروں گی۔

بہتر ہے میں شام کو ہی آجاؤں گی۔

غزالہ بچے تلے قدم رکھتی چلی گئی۔ شعاع کو آج وہ پہلے سے بہت مختلف لگی۔ اس کی باتیں اور طرح کی تھیں، لیکن شعاع کا ذرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ لبنیٰ سعدیہ اسے غزالہ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ ان کے اشارے بھی نہ دیکھے اور تیز تیز قدموں سے مخالف سمت چل دی۔ سعدیہ اور لبنیٰ نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں خاموش رہیں۔ لبنیٰ کتاب کے کنارے پر اپنی مخروطی انگلی پھیرتی رہی اور سعدیہ گھاس کا تنکا چباتی رہی۔ آخر سعدیہ نے کہا:

"دراصل لبنیٰ شعاع کا کوئی نہیں ہے۔ رشتہ داروں کے ہاں رہتی تھی ان سے تنگ آکر ہوسٹل میں آگئی ہے۔

ارے

لبنیٰ مارے صدمے کے گنگ سی رہ گئی۔ سعدیہ نے کہا:

جب ہی تو اس کا مزاج تیکھا ہے، مگر وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے، اس لئے میں نے کبھی اس کی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ میں اسے اپنے پاس رکھ سکتی تھی مگر وہ بہت خود دار ہے۔ کسی کا احسان نہیں لیتی۔

تمہیں کیا معلوم سعدیہ وہ مجھے بھی کس قدر اچھی لگتی ہے۔ اس کے رویے پر تو میں بہت حیران ہوتی ہوں، مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنی سی عمر میں اس پر یہ کچھ بیت چکا ہے۔

سعدیہ نے کہا:

اب دیکھو لو مسز فاروقی کی بچی کو پڑھاتی ہے اور وہ اسے میرا خیال ہے عام ٹیوٹروں سے زیادہ پیسے دیتی ہیں۔ بہرحال شعاع محنت کرتی ہے اسی سے تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

لبنیٰ نے ایک دم پوچھا۔

سعدیہ، شعاع کے والد کا کیا نام تھا؟

نعمان

ہیں؟

ہاں صرف مجھے معلوم ہے، ورنہ وہ تو اپنے باپ سے بہت نفرت کرتی ہے۔

وہ کیوں؟

یہ مجھے معلوم نہیں۔ ایک بار کہا تھا کہ دنیا کے سارے مرد ظالم ہوتے ہیں، میرے باپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرح۔

کیا کرتے تھے اس کے والد۔

معلوم نہیں۔

نعمان نے بڑی مشکل سے رات کاٹی اور اگلے دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شعاع سے ملنے ہوسٹل جائے گا اور اسے تمام حقیقت سے آگاہ کر کے گھر لے آئے گا لیکن جب وہ ہوسٹل سے ذرا دور ہی تھا کہ اس نے غزالہ کو دیکھا جو ہوسٹل سے واپس آ رہی تھی۔ نعمان وہیں رک گیا۔

اچھا تو یہ غزالہ ہے۔

پھر وہ بس اسٹاپ پر جا کر کھڑی ہو گئی اور نعمان کی گاڑی اس کے پاس سے زناٹے سے گزر گئی تو نعمان سوچنے لگا۔

غزالہ یہ دن بھی آنے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اتنے اجنبی بن جائیں گے کہ چپ چاپ پاس سے گزر جائیں۔

تھوڑی دور آگے جا کر نعمان نے کار روک دی۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ غزالہ یہاں کیوں آئی ہے اور وہ کیا حالات تھے کہ شعاع کو ہوسٹل میں رہنا پڑا۔

اور پھر

جب وہ ماں بیٹی باتیں کر رہی تھیں تو انہیں کیا پتا تھا کہ اوٹ میں کھڑا نعمان یہ سب باتیں سن رہا تھا۔

نعمان کو اپنی یہ حرکت عجیب سی تو لگی کیونکہ کوئی بھی سنجیدہ اور باوقار آدمی ایسی حرکت نہیں کر سکتا مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی پر کیا بیتی اور

اور بیگم اب اسے ملنے یہاں کیوں آئی ہیں۔ بہرحال اب وہ تمام گفتگو سن چکا تھا۔

"اچھا تو غزالہ نے شادی کر لی۔ اور اب وہ مسز افتخار ہیں" اور نعمان کو اس نفرت کا احساس ہو گیا جو شعاع کو ماں سے تھی اور اب ان حالات کا بھی کم و بیش اندازہ ہو گیا جن کی وجہ سے شعاع کو گھر چھوڑنا پڑا تھا۔

غزالہ جا چکی تھی اور غزالہ کے جانے کے بعد شعاع کو بھی تیزی سے لائبریری کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کم عمری میں وہ سفید ساڑھی میں باوقار خاتون کی طرح چل رہی تھی۔ گو اس کی چال میں تیزی تھی مگر سر اٹھا ہوا اور کندھے ہموار تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ ہر قسم کے حالات سے ٹکرانے کی ہمت رکھتی ہے۔

پھر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ نعمان نے دیکھا کہ وہ تنہا کھڑا ہے اور درختوں کے سوکھے پتے اس کے قدموں پر لوٹ رہے ہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلی۔

"اب اسے کیا کرنا چاہیے؟" نعمان کی کشادہ پیشانی پر سوچ بچار کے بل پڑے اور پھر وہ لمبے تیز قدموں سے کار پارکنگ کی طرف بڑھا۔

لبنیٰ کے دل پر گزرے ہوئے دن کی بعض باتیں اثر کر گئی تھیں۔ اس وقت بھی وہ خاموش بیٹھی اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ جب وہ لوگ لان میں بیٹھی تھیں تو وہ کس طرح وہاں آ گئے تھے۔ اور سارا وقت شعاع سے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر اس کے بعد لبنیٰ نے جس طرح انہیں خواب گاہ میں پریشان دیکھا تھا وہ بھی عجیب سی صورت حال تھی وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کے بعد اس کی جناب سے ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابّا اس وقت بھی خاموش اور افسردہ سے بیٹھے تھے۔ نجانے کیوں لبنیٰ کو ساری باتیں یاد آ گئیں۔ سعدیہ بیزاری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اسے شجاع کا انتظار تھا مگر شجاع دوبارہ نہ آئی۔ سعدیہ نے گھڑی کی طرف دیکھا اور ہلکی سی جمائی لے کر بولی:

"اچھا بھئی لبنیٰ! میں تو چلوں کلاس شروع ہونے والی ہے۔"

"میں بھی تو چلتی ہوں۔"

"چلو!"

دونوں کلاس روم کی طرف چل دیں۔ دونوں خاموش تھیں۔

شجاع نے اس دن کوئی کلاس نہ لی۔ سعدیہ نے حتی الامکان اسے ڈھونڈا مگر وہ تو ہوسٹل واپس جا پہنچی تھی اور بے حد پریشان تھی۔

وہ اپنی بھوری بھوری آنکھیں نیم وا کئے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ کتابیں اور فائل میز کی بجائے بستر پر پڑی تھیں موٹی سنہری چوٹی پھسل کر گود میں کنڈلی مارے پڑی تھی۔ سفید ساڑھی جو ڈھلا کر کریلی سی پڑ گئی تھی۔ پاؤں سے اُونچی ہو گئی تھی اور سفید سفید پیروں پر گرد کی ہلکی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ اجڑی اجڑی سی بیٹھی تھی۔

اس کی زندگی میں سکون کے لمحے بے حد کم تھے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ غزالہ اس طرح اچانک اور خود اعتمادی سے اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ اب شجاع کو فکر یہ تھی کہ غزالہ شام کو ہوسٹل میں آئے گی۔ اگر آج نہ ملوں تو ممکن ہے پھر آئے، یونیورسٹی میں آئے۔ اس طرح لڑکیوں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ میری ماں ہے اور اس نے دوسری شادی کر رکھی ہے اور یہ کہ میرا باپ ظالم تھا۔ مجھے اور میری ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

شجاع نے سر تھام لیا۔ ایک بار ایک لڑکی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔

"شجاع! تمہاری قسمت کی لکیر ٹوٹی ہوئی ہے تمہیں زندگی میں بہت پریشانیاں دیکھنا پڑیں گی۔"

شجاع کو یہی بات یاد آ گئی اس نے بچگانہ معصومیت سے اپنی سفید ہتھیلی پھیلا کر دیکھا ہاتھ کی ساری لکیریں پھیکی پھیکی تھیں اور قسمت کی لکیر واقعی ٹوٹی ہوئی تھی۔

شجاع نے کہا:

"ڈھکوسلے ہیں یہ سب، میں ان لکیروں پر ایمان نہیں رکھتی۔ میں جدوجہد کروں گی اور ان لکیروں کو بدل کر رکھ دوں گی۔"

پھر وہ سوچنے لگی:

"اُف اللہ سعدیہ اور لبنیٰ مجھ سے ضرور پوچھیں گی اور میں انہیں کیا بتاؤں گی کہ وہ عورت کون تھی۔ وہ لوگ اپنی ماؤں کی گود میں سر چھپا چھپا کر اب تک ضدیں کرتی ہیں وہ کیا سوچیں گی کہ یہ اپنی ماں کے ہوتے ہوئے ہوسٹل میں رہتی ہے ٹیوشن کرتی ہے۔

شجاع مٹھیاں بھینچ کر ٹہلنے لگی۔

میں یہاں نہیں رہوں گی۔ اس نے سوچا اور اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

اٹیچی کیس میں ٹھونس ٹھونس کر کتابیں بھرنے کے بعد اس نے اپنا چھوٹی چھوٹی چیزیں سمیٹ لیں اور جب کوچ کی مکمل تیاری ہو گئی پھر ایک سوچ اُبھری۔

مگر میں جاؤں گی کہاں؟

انسان ساری زندگی ناامیدی کے صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے اور امید سراب کی صورت اس کے سامنے آ آ کر غائب ہوتی ہے۔ انسان اس کے پیچھے بھاگتا بھاگتا بے دم ہو جاتا ہے۔ دنیا اسے کوئی سکھ نہیں دیتی۔ پھر بھی وقت نزع وہ آنکھیں کھول کر بڑی حسرت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بے مہر دنیا کو دیکھتا ہے' اف یہ انسان اور اس کی حسرتیں۔

شجاع بھی کیا کروں اور کیا نہ کروں کی سوئی پر لٹک رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا گھر چھوٹا' اماں باپ سے جدا ہوئی مگر کچھ نہ ملا۔ اب وہ کہاں جائے؟

مگر وہ تنہا لڑکی جینے کی زبردست آرزو سے دل مضبوط کئے' سب کو پچھاڑنے کا عزم لئے شکستہ دل بیٹھی تھی۔

غم سے زیادہ غصہ تھا' ناامیدی سے زیادہ جھنجلاہٹ تھی۔ حالات کی تلخیوں نے اس کی رگوں میں زہر بھر دیا تھا جو ہر وقت اس کے اعصاب میں جھنجھناتا رہتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اپنی چھنگلی کی پور کو چباتی رہی اور بچوں کی طرح ہولے ہولے ایک ٹانگ جھلا رہی تھی کہ ڈرتے ڈرتے ناجیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

اپنے بہن بھائیوں سے ہر پل جھگڑنے والی ناجیہ جو روز روز اتنا لمبا سفر کرنے سے بچنے کے لئے ہوسٹل میں آ گئی تھی۔ نجانے کیوں شجاع سے اتنا دبنے لگی تھی۔ روم میٹ ہونے کے باوجود شجاع نے کبھی کبھار ہی اسے مخاطب کیا تھا۔ حالانکہ جب ناجیہ نے پہلے دن اس موہنی سی لڑکی کو دیکھا تھا تو بہت خوش ہوئی تھی۔ شروع میں شجاع کے غیر معمولی رویے سے وہ یہی سمجھی کہ ہر خوب صورت لڑکی کی طرح شجاع بھی مغرور ہے مگر جلد ہی اسے اپنی غلط فہمی پر ندامت ہوئی تھی۔ سیدھی سادی سی شجاع اور اس کے مخصوص فقرے۔

"نہیں"

"ہاں"

"کچھ نہیں"

اتنا اثر رکھتے تھے کہ ناجیہ کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے بعد کوئی بات کر سکے۔ صبح

سے ہی وہ شجاع سے کچھ خوفزدہ تھی۔ بہرحال کمرے میں آنا ضروری تھا۔ شجاع اسے کڑے تیوروں سے گھورنے لگی۔ ناجیہ نے نظر بچا کر کتابیں رکھیں۔ غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھونے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگائی مگر جونہی وہ باہر آئی شجاع نے اسے پھر سے گھورا۔ دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجی تو ناجیہ نے جاتے جاتے دیکھا۔ شجاع بدستور سوچوں میں غرق بیٹھی پاؤں ہلا رہی تھی۔ ناجیہ نے ہمت کر کے پوچھا:

"کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟"

"نہیں"

"یہاں لے آؤں تمہارے لئے؟"

"نہیں۔"

ناجیہ واپس آ کر آہستہ سے بولی:

"شجاع مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو' میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

شجاع نے غور سے ناجیہ کی طرف دیکھا اور بولی:

"تم سمجھتی ہو تمہارے اتنا کہنے سے میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ جانتی ہو اتنی مشکل سے ہوسٹل میں جگہ ملی تھی اور اب مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔"

ناجیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"کہاں؟"

"اس لئے کہ تم ان محترمہ کو وہاں بھی پہنچا دو؟"

ناجیہ نے کہا:

"شجاع میں شرمندہ ہوں مگر مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع نے کہا:

"تمہیں معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ انسان اپنے کام سے کام رکھے۔ تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ ہو گا، تمہیں کیا معلوم۔ تمہیں کیا ضرورت تھی ان محترمہ کو میرے پیچھے پیچھے لئے پھرنے کی۔"

ناجیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ بڑی مشکل سے بولی:

"شعاع میں معافی چاہتی ہوں۔"

شعاع نے سر تھام لیا:

شرمندہ، شرمندہ —— معافی معافی!!

"اف بھئی تم جاؤ بس"

ناجیہ ہکا بکا چند لمحے تکتی رہی پھر سر جھکا کر کمرے سے نکل گئی مگر شعاع کے دماغ میں تو بگولے چل رہے تھے۔

خدایا۔ میں کہاں جاؤں۔ کیا میرے نصیب میں ایک پل کا بھی آرام نہیں۔

گھر جا کر بھی لبنیٰ کو سخت بوریت ہوئی۔ سعدیہ نے شعاع کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا ان باتوں نے اس پر عجیب سا اثر کیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ حالات کی ستائی ہوئی شعاع کے لہجے میں اتنی کرختگی کیوں ہے۔ لبنیٰ کے دل میں تو شعاع کے لئے پہلے بھی جگہ تھی ایک عجیب سا جذبہ، ایک عجیب سی محبت۔ وہ اس کے لئے محسوس کرتی تھی۔ مگر اب کچھ اور بھی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا:

کاش! شعاع ہمارے ہاں آجائے رہنے کو۔

پھر وہ اپنی خام خیالی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

وہ غیور لڑکی انا کے بوجھ تلے دبی ہوئی بھلا کس طرح کسی کا احسان قبول کر سکتی ہے۔

اس دن وہ جلدی گھر آ گئی تھی۔ مگر گھر پہ اسے بہت کوفت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ تنہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچوں سمیت کہیں گئی ہوئی تھیں اور رات سے پہلے اس کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے کی چیزوں کو ٹھیک کرتی رہی پھر دوسرے کمرے سے کرشن چندر کا ناول "شکست" اٹھا لائی اور پڑھتی رہی۔ اور پھر برآمدے میں چلی گئی۔ بیرہ چائے وہیں لے آیا تھا۔ لبنیٰ نے چائے کی پیالی بہت دیر میں ختم کی اور آرام کرسی پر دراز ہو کر لان کی طرف دیکھتی رہی۔ لان کی طرف سے ہو کر آتی ہوئی نم ہوا نے اس کے سیاہ بالوں کو اس کے چمپئی رخساروں پر پھیلا دیا۔ اس کا منہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

رات کی پھیلی سیاہ زلفوں میں بجلی کے قمقموں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جتنی دیر میں لبنیٰ نے حواس درست کئے نعمان کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیدھا لبنیٰ کے پاس آ گیا۔

"السلام علیکم ابوجی!"

"جیتی رہو۔ کیا ہو رہا ہے؟"

لبنیٰ جواب دینے کی بجائے مسکرا دی اور بولی:

"امی گھر میں نہیں ہیں بہت بور ہو رہی ہوں۔"

نعمان دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھکا تھکا سا، اور عادت کے مطابق عینک اتار کر انگلیوں سے آنکھیں دبا رہا تھا۔ لبنیٰ چند لمحے غور سے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی:

"ابوجی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

نعمان نے عینک چڑھا لی اور ہلکے سے مسکرا کر بولے:

"بالکل ٹھیک ہے۔"

لبنیٰ بھی مسکرا دی چند لمحے خاموشی رہی۔ لبنیٰ سوچ رہی تھی کچھ پھر بولی:

"ابوجی ایک بات کہوں؟"

"کہو بیٹے۔"

"ابوجی وہ میری دوست ہے نا شعاع"

نعمان سنبھل کر بیٹھ گیا اور بولا:

"کون شعاع؟"

لبنیٰ نے ذرا سا منہ بنایا اور بولی:

"واہ ابوجی وہی شعاع جس سے کل آپ نجانے کیا پوچھ رہے تھے۔ ابوجی وہی جس کی صورت آپ کے دوست کی بیٹی سے ملتی ہے۔"

نعمان نے اتنی دیر میں دل سنبھال لیا تھا بولا:

"ہاں تو کیا ہوا اسے؟"

لبنیٰ نے چند لمحے سوچا کہ آخر وہ کس طرح بات کرے کہ باپ کے دل پر اثر ہو، بولی:

"سعدیہ نے بتایا کہ شعاع کا کوئی نہیں ہے۔ اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہتی تھی۔ وہ لوگ تنگ کرتے تھے اس لئے وہ ہوسٹل میں آ گئی۔"

نعمان نے پوچھا:

"اس کے اخراجات کون پورے کرتا ہے؟"

"وہ ٹیوشن کرتی ہے ابوجی! بڑے اچھے لوگ ہیں جن کی لڑکی کو پڑھاتی ہے لیکن میں نے ایک اور عجیب بات سنی ہے۔ شعاع کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور سعدیہ بتا رہی تھی کہ شعاع کو مردوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ کہتی ہے کہ دنیا کا ہر مرد میرے باپ کی طرح ظالم ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان کے ذہن میں بم سا پھٹ پڑا۔ خون کنپٹیوں میں سرسرا رہا تھا۔ مگر لبنیٰ کو اس کی خبر کیسے ہوتی اس نے تو شجاع میں نعمان کی غیر معمولی دلچسپی کو دیکھ کر ہی سارے حالات بتائے تھے ورنہ اسے اپنی سہیلیوں کے بارے میں بات کرنے کی عادت نہ تھی۔ لبنیٰ نے دیکھا۔ نعمان ماتھا تھامے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ لبنیٰ نے کہا:

"ابوجی! کیا آپ کا دوست اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا؟"

نعمان نے تڑپ کر کہا:

"نہیں بیٹے وہ تو اپنے بیوی بچوں سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ یہ اس کی بیٹی نہیں ہو سکتی وہ تو خود بہت دکھی آدمی تھا اور دکھی آدمی کسی کو دکھ نہیں دیتا۔"

لبنیٰ نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اک بات کہوں ابوجی! آپ شجاع کو یہاں لانے کی اجازت دے دیں تو میں اسے ہوسٹل میں نہ رہنے دوں ابوجی وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

نعمان نے پوچھا:

"کیا وہ آجائے گی؟"

لبنیٰ نے کہا:

"وہ بہت غیور ہے ابوجی! مگر آج ایک عورت اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کے بعد سے شجاع بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اس کے بعد اس نے کوئی کلاس بھی نہیں لی۔ ہو سکتا ہے ان حالات میں وہ آجائے۔"

نعمان نے اٹھتے ہوئے کہا:

"میری طرف سے اجازت ہے لیکن تم ابھی اس سے کچھ نہ کہنا۔ میں خود وہاں جا کر اس سے

بات کروں گا مگر پہلے تمہاری امی سے کہہ دینا ضروری ہے۔"

لبنیٰ خوش ہو گئی لیکن نعمان دل میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو دبائے اندر چلا گیا۔ اپنے بیڈروم میں پہنچ کر وہ گویا نڈھال سا ہو کر کرسی میں گر گیا۔ اس نے شام کو شجاع کے ہوسٹل کے کئی چکر لگائے مگر اسے ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ کہاں گئی ہے اس سوال کے جواب میں وارڈن نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ آتی جاتی لڑکیوں سے وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اپنی بیٹی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

مگر

یہ اس نے کیا سن لیا تھا؟

جان سے بھی چہیتی بیٹی جس کو دیکھ کر وہ سدھ بدھ بھول جاتا تھا وہ اس سے نفرت کرتی ہے

اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے۔

وہ اسے ظالم سمجھتی ہے۔

نعمان نے کراہ کر سر تھام لیا۔ اسے معلوم تھا کہ غزالہ نے اس کی بے گناہی پر اتنا بڑا الزام رکھا تھا اور اس نے اپنی معصوم بیٹی کے دل میں نفرتوں کے زہریلے کانٹے بھر دیئے تھے۔

اس نے ایک چاہنے والے شوہر کو ظالم بنا کر پیش کیا تھا۔

اس نے ایک شفیق باپ کی محبت کو بیٹی کے دل میں نفرت کی شکل دی تھی۔

آہ غزالہ تم نے یہ کیا کیا؟

تم نے اپنی کوتاہیوں کو چھپا کر، اپنے ظلم چھپا کر خود کو معصوم اور مظلوم بنا کر پیش کر دیا اور اپنی بیٹی کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا ناشاد باپ اپنی بیٹی کی صورت دیکھنے کو ترستا رہا اور اسے ذلیل و خوار کیا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ بیگم تم نے بھی اس میں ضرور حصہ لیا ہو گا۔ تم نے بھی میرے ناکردہ گناہوں کی فہرست
شعاع کے سامنے پیش کی ہو گی۔

مگر نہیں۔ نعمان کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔ شعاع نے غزالہ کو مسز آفندی
کہا تھا۔ اس کا مطلب ہے غزالہ نے شادی کر لی ہے۔

شعاع نے اس سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی اور . . . . اور

آخر ایسی کون سی بات تھی کہ شعاع نے گھر چھوڑا اور ہوسٹل میں رہنے لگی اور ٹیوشن پڑھا کر اخراجات پورے کرتی ہے۔ نعمان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"میری غیور بچی"

اسے یکدم شعاع پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے سوچا:

کاش میں نے پہلے ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شعاع کو ان مصیبتوں سے نہ گزرنا پڑتا۔

اسے غزالہ کے ساتھ شعاع کا سخت رویہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایک بات یاد کرنے لگا اور ساتھ اسے خیال آیا:

ان حالات میں مجھے یقین ہے کہ میں شعاع کے دل سے وہ نفرت دور کر سکوں گا۔

ایک منٹ کو بھی اس کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ اس کی ساری باتوں کے بعد اگر شعاع نے پوچھ لیا کہ اگر اتنی ہی محبت تھی تو تم اب تک کہاں تھے؟

نعمان نے فیصلہ کیا کہ وہ دوسرے دن پھر شعاع کے ہوسٹل جائے گا اور اپنی بیٹی کو منا کر لے آئے گا۔

حنا آ گئی تھی اور بچے اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ نعمان نے حنا سے آج کی باتیں

بالکل نہ بتائیں۔ شاید یہ پہلا موقع تھا اور اس کا انداز بھی غیر معمولی نہ تھا۔ اس لئے حنا کو کسی قسم کا شک بھی نہ ہوا اور وہ مزے سے مسز آفندی کے ہاں کی باتیں اور واقعات سناتی رہی۔

شعاع عادت کے خلاف کوئی تین بجے ہی آبگینہ کو پڑھانے چلی گئی۔ دراصل وہ نہیں چاہتی تھی کہ غزالہ سے سامنا کرے اور یوں بھی وہ آئندہ کے لئے بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اب اس کا ہوسٹل میں رہنا تقریباً ناممکن سا تھا۔ غزالہ کے وہاں آنے کا مطلب تھا کہ وہ جب جی چاہے آ سکتی ہے اور اس کے ایک بار آنے سے بھی شعاع کا سکون تباہ ہو گیا تھا اس لئے وہ وقت سے پہلے ہی مسز فاروقی کے ہاں جا پہنچی۔ آبگینہ کوئی ناول پڑھ رہی تھی جو اس نے جلدی سے کشن کے نیچے چھپا دیا اور شرارتی نظروں سے شعاع کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر شعاع نے دھیان نہ دیا۔ پڑھائی کے وقت آبگینہ ہمیشہ سے زیادہ شوخ رہی تھی مگر اُسے ڈانٹ نہ پڑی ورنہ شعاع ڈانٹنے میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔

آبگینہ چائے لے آئی۔ اسی دوران مسز فاروقی آگئیں۔ شعاع سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں مگر ان کی نظر سے شعاع کی پریشانی چھپی نہ رہی آخر بولیں:

"بیٹی کچھ پریشان ہو"

"نہیں یونہی ذرا سا سر میں درد ہے"

"کیوں؟"

"دراصل میری روم میٹ بہت تنگ کرتی ہے"

لیجئے ناجیہ پر ایک اور الزام لگا۔

مسز فاروقی نے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں اور کیا گرمی بھی تو بہت ہو گئی ہے۔ اتنی دور دھوپ میں چل کر آئی ہو جب ہی
میں درد شروع ہو گیا۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ یہاں آ جاؤ۔ تکلیف کیوں کرتی ہو۔"

شعاع ہولے سے بولی:

"مسز فاروقی میں تکلف نہیں کرتی۔ البتہ میرا خیال ہے کہ میں مسز قاضی کے ہاں ہی چلی جاؤں"

"وہی جاپانی عورت جہاں تم پے انگ گیسٹ تھیں؟"

"جی ہاں، ہوسٹل میں پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔"

مسز فاروقی کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی بولیں:

"تم میری پے انگ گیسٹ بن جاؤ۔ دیکھو اب تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ پیسے لیا کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑیں کہ کھو کیسی رہی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو شعاع برا مان جاتی مگر اس وقت یہ ترکیب اسے بہت بھلی لگی۔

"میں آپ کو کل جواب دوں گی۔"

"ارے بیٹی جواب کیا دینا ہے بس کل سامان لے آؤ۔"

شعاع نے کہا:

"نہیں مسز فاروقی مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔ یوں بھی ہوسٹل چھوڑنا ممکن نہیں ہے پہلے بتانا پڑتا ہے۔"

مسز فاروقی نجانے کیوں خوش ہو گئیں۔ ان کی کتنی آرزو تھی کہ شعاع ان کے پاس رہے، کہنے لگیں:

"میں تمہارے لئے کمرہ ٹھیک کروا دیتی ہوں۔ جب جی چاہے آ جانا مگر پیسے باقاعدگی سے

لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئیں۔ آبگینہ نے بھی اصرار کرنا لازمی سمجھا مگر شعاع اکتا گئی تھی اس نے اسے ٹال دیا وہ فرصت سے اس پیش کش پر غور کرنا چاہتی تھی۔ اس نے باہر نگاہ ڈالی شام ہونے والی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گیٹ سے باہر اس نے دیکھا ایک خالی رکشہ گزر رہا تھا اسے روکا اور سعدیہ کے ہاں جا پہنچی۔ وہ خلاف توقع اسے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی چیخ کر بولی

"کہاں سے آئی ہو؟"

"چنیوٹ"

"بکومت"

"تم بکومت اور مجھے پانی پلاؤ۔"

سعدیہ نے کاہلی سے نوکر کو پکارا اور شربت لانے کا حکم دے کر آنکھیں زور زور سے ملتی ہوئی بولی:

"تمہیں آج کیا ہوا تھا۔ سارے میں تلاش کیا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہو؟"

شعاع نے اسے گول مول لفظوں میں سارا قصہ سنایا۔ یہ نہ بتایا کہ وہ عورت اس کی ماں تھی۔ بس یہی کہا کہ وہ جن کے ہاں رہتی تھی وہ لینے آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے مسز فاروقی کی پیش کش کا ذکر کیا تو سعدیہ جھٹ سے بولی:

"اگر یہی بات ہے تو تم میری پے انگ گیسٹ بن جاؤ۔"

شعاع نے کہا:

"پٹڑی سے مت اترو اور مجھے مشورہ دو کہ کیا کروں؟"

سعدیہ نے سر کھجانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ نوکر شربت لے آیا وہ دونوں خاموشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پیتی رہیں۔ آخر شاع نے تنگ آکر پوچھا:

"سر کھانا بند کرو اور منہ سے پھوٹو ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

سعدیہ نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے تمہیں مسز فاروقی کے ہاں چلے جانا چاہیئے' وہ بہت اچھی عورت ہے اور سچی بات ہے ہوسٹل سے تو وہ جگہ اچھی ہے۔ کم از کم ہوسٹل کی پابندیوں سے تو بچو گی اور ہم بھی دن بے وقت تمہارے پاس آسکیں گے۔"

شاع نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی:

"کیا یہ مناسب رہے گا' ایسا کرو تم بھی سوچو۔ میں آج اور سوچوں گی۔ کل فیصلہ کریں گے اگر مسز افتخار آئیں پھر تو میں جلدی فیصلہ کروں گی۔ ورنہ ہمارے پاس وقت ہے۔"

سعدیہ نے کہا:

"ٹھیک ہے۔"

شاع جانے کو اٹھی اور جاتے جاتے بولی:

"سعدیہ تم لبنیٰ سے میرے بارے کچھ نہ کہنا۔ آج کی کوئی بات نہ بتانا۔"

"بہت اچھا۔"

سعدیہ نے سر ہلا دیا مگر شاع کے جانے کے بعد بہت دیر تک شرمندہ سی بیٹھی رہی۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر شاع کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو وہ ضدی لڑکی ساری زندگی اس سے بات نہ کرے گی۔

شاع ہوسٹل پہنچی تو اسے سب سے پہلی اطلاع ملی کہ کوئی صاحب جنہوں نے اپنا نام نہیں بتایا' تین چار بار اسے پوچھنے آئے تھے اور عورت کوئی نہیں آئی۔

شاع نے فوراً نتیجہ نکالا کہ ضرور افتخار آیا ہو گا۔ غزالہ نے اسے بھیجا ہو گا۔ اس نے اسی وقت وارڈن سے کہہ دیا کہ وہ جلد ہی ہوسٹل چھوڑ دے گی۔ واقعی اب سوچ بچار کا اتنا وقت نہ تھا۔

نعمان نے گاڑی ہوسٹل کے سامنے کھڑی کی۔ آج وہ مصمم ارادہ کر کے آیا تھا کہ شاع سے ضرور ملے گا اور کوشش کرے گا کہ اس کے دل سے ساری غلط فہمیاں دور کر دے۔ مگر ہوسٹل جا کر اسے پھر مایوسی ہوئی۔ شاع موجود نہیں تھی۔ وارڈن نے پوچھ ہی لیا:

"آپ ہیں کون؟"

"میں شاع کے والد کا دوست ہوں۔ اس کے لئے ایک ضروری پیغام ہے۔"

"کیا پیغام ہے؟"

"یہ مجھے اسے ہی پہنچانا ہے۔"

وارڈن نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے کہا کہ ناجیہ کو بلا لائے۔ وہ سادہ سی لڑکی جلد ہی آ گئی ذرا گھبرائی گھبرائی سی۔ نعمان بھی گھبرا گیا۔ نجانے کون لڑکی ہے۔ اسے پہچانتی نہ ہو۔ وارڈن نے کہا:

"شاع کہاں ہے؟"

"جی وہ ٹیوشن پڑھانے جاتی ہے اس وقت۔"

"کب تک آئے گی؟"

"چھ بجے تک آ جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ جب وہ آئے میرے پاس بھیج دینا۔"

نعمان شکریہ ادا کر کے اٹھا اور کہنے لگا:

"میں چھ بجے آؤں گا۔ اسے کہیئے انتظار کرے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھ بجنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔

نعمان کے لئے یہ دو گھنٹے کاٹنا دشوار ہو رہے تھے۔ ایک ایک پل، ایک ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شعاع سے سب کچھ کہہ دے گا۔ آج وہ شعاع کو بتا دے گا کہ تمہارا باپ ظالم نہیں مظلوم ہے۔ وہ بے بس اور لاچار ہے۔ وہ تمہاری ماں اور نانی کے ظلم و ستم کا نشانہ ہے۔ اس کا دل زخموں سے چھلنی ہے۔ اس نے طلاق نہیں دی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی چھوڑنا گوارہ نہ تھا۔ آج وہ بتا دے گا کہ اس نے بچیوں کی خاطر کیسی کیسی ذلتیں کیسی کیسی باتیں برداشت کی ہیں اور وہ سوچنے لگا:

مجھے یقین ہے کہ میری باتیں سن کر، میرے دکھ سن کر وہ مجھے معاف کر دے گی اور اپنے باپ کو پا کر اپنے دل کی سب باتیں مجھ سے کہہ دے گی۔ میں اسے سینے سے لگا کر پیار کروں گا۔ میری بیٹی، میری بچی! تمہارے دکھ کے دن بیت چکے۔ اب تمہارا باپ تمہیں کوئی دکھ نہ ہونے دے گا۔

وہاں سے نکل کر نعمان ایک ریستوران میں بیٹھ گیا۔ چائے وغیرہ پی۔ چھ بجنے والے تھے۔ جب وہ ہوسٹل کی طرف چلا اس نے شعاع کو ہوسٹل کی طرف جاتے دیکھا۔

وہ وہی سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ آنچل کندھوں کے گرد لپٹا ہوا تھا اور لمبی سنہری چوٹی پشت پر جھول رہی تھی۔ موڑ مڑتے ہوئے نعمان نے اس کے گلابی چہرے کی جھلک دیکھی وہ گاڑی آگے نکال کر لے گیا تاکہ ہوسٹل کے قریب ہی اس سے ملے۔ کار اس نے سڑک کی دوسری طرف روکی اور باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر شعاع کی طرف دیکھا۔

اور

اسی لمحے اس نے یہ بھی دیکھا کہ سیاہ رنگ کی ایک کار شعاع کے بالکل قریب آ کر رکی۔

اور

پھر نعمان نے یہ بھی دیکھا کہ کار میں سے سہیل نکلا اور شعاع کی طرف بڑھا۔

اور

نعمان نے یہ بھی دیکھا کہ اسے دیکھ کر شعاع کے چہرے پر عجیب سی لہر ابھری جو ذہنی خوشگواری کی علامت تو نہیں تھی مگر۔ . . .

یہ لہر واضح کر رہی تھی کہ شعاع سہیل سے ناواقف نہیں ہے۔ ورنہ وہ پرواہ بھی نہ کرتی کہ کون اس کی طرف آ رہا ہے۔ اب سہیل اور شعاع ساتھ ہوسٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شعاع دراز قد سہیل کی اوٹ میں چھپ سی گئی تھی مگر سہیل کا چہرہ نعمان کو نظر آ رہا تھا وہ شعاع سے باتیں کر رہا تھا۔

نعمان کے سینے میں لہر دوڑ گئی اور اس نے اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔

کیونکہ لبنیٰ اور سہیل کی بات ہو چکی تھی اور چند ہی دنوں بعد منگنی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔

وہ پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ اس کی زندگی کا کون سا موڑ تھا۔ اسے زندگی نے، حالات نے کہاں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ لبنیٰ اور سہیل کی تو شادی طے تھی۔ سہیل کے والد جو نعمان کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے اصرار کیا تھا کہ منگنی کی رسم ادا ہو جانی چاہئے۔ مگر نعمان نے کہا تھا کہ لبنیٰ جیسی میری بیٹی ویسی آپ کی۔ آپ جب چاہیں منگنی کر لیں اور جب چاہیں بارات لے آئیں۔

لیکن

لیکن یہ سہیل اور شعاع ایک دوسرے سے کیسے واقف ہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر

سالگرہ کے دن کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ نعمان نے نوٹ کیا تھا۔

سہیل اس دن بھی بہت غور اور حیرت سے شجاع کو دیکھ رہا تھا۔

لبنیٰ جانتی ہے کہ سہیل اور لبنیٰ ایک دوسرے سے منسوب ہو چکے ہیں۔ وہ خاموش اور سادہ طبیعت لڑکی جب یہ سنے گی جب اسے معلوم ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

نعمان سوچ رہا تھا کہ وہ حنا کو کیا جواب دے گا جس کو نہ جانے وہ کتنی بار کہہ چکا ہے کہ لبنیٰ کی رضامندی لے لے تاکہ سہیل سے اس کی منگنی کی جا سکے۔

اف میرے خدایا یہ تو نے مجھے کس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ سہیل اور شجاع آپس میں اس طرح واقف ہوں گے۔ یہ ضرور مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور کیا عجب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں اور شادی کرنا چاہتے ہوں۔

انہی پریشانیوں میں سٹیرنگ وہیل پر سر لٹکائے ٹکائے اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ شجاع ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوتے ہاتھ کے اشارے سے سہیل کو نفی میں جواب دے رہی تھی۔ اور اس کے سر کی جنبش دور سے ہی بتا رہی تھی کہ وہ کسی ہے۔ ہاں البتہ جب نعمان نے سر اٹھا کر گیٹ کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پلٹ کر دیکھا سہیل کی کار غائب تھی، وہ تو نہ جانے کتنی دیر سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی اور اس نے نہ جانے کیا سوچ کر کار کا رخ موڑ دیا۔ سیاہ چمکیلی سڑک اس کی کار کے پہیوں تلے بیدردی سے روندی جا رہی تھی۔

آج جب شجاع آبگینہ کو پڑھانے کے لئے گئی تو مسز فاروقی فوراً ہی اس کے پاس آ گئیں اور بولیں:

سامان نہیں لائیں؟

شجاع خاموش رہی، نہ جانے کیوں وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کو وہ وقت یاد آ گیا تھا جب شروع میں ہی مسز فاروقی نے اس سے کہا تھا کہ وہ ان کے ہاں آ جائے مگر تب شجاع نے کتنے حوصلے اور عزم سے انکار کر دیا تھا، مگر اب وہ چاہتی تھی کہ مسز فاروقی اصرار کریں۔

آہ!

یہ وقت

یہ ظالم وقت

جو انسان کے عزم پر ہنستا ہے اور آخر انہیں پچھاڑ دیتا ہے۔

اور

وہ تقدیر بنانے والا انسان کو آنے والے وقت سے کتنا بے خبر رکھتا ہے۔ وہی شجاع جو عزم و ارادے کی پتلی تھی خود کو وقت کے آگے بے حد کمزور محسوس کر رہی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ مگر یہ اس کی ضدی فطرت تھی جس نے اس کو سنبھال رکھا تھا، نہیں تو یہ کم عمری اور حالات کے اندوہ ناک طوفان اور یہ دنیا' جہاں اس نے یہی دیکھا کہ پرائے اس کے ہمدرد تھے اور اپنے؟

اپنوں کو تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ

وہ کیا کرتی، کیا کھاتی ہے، کیا پیتی ہے، کہیں بیمار تو نہیں۔ سوتوں کو اولاد کی بیماری میں جاگنے والی ماؤں کے قصے اس نے صرف پڑھ رکھے تھے، مگر اس کی ماں کو یہ بھی فکر نہیں تھی کہ اس کی بیٹی جیتی ہے یا مر گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور قصے کہانیوں میں ہی اس نے پڑھا تھا کہ باپ شفقت و محبت کا پیکر ہوتا ہے جو ہر دکھ خود سہتا ہے مگر اولاد کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیتا۔

مگر

اس کا باپ تو اتنا ظالم تھا کہ اس کی ماں کو اور معصوم بچی کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گیا اور کبھی آکر خبر نہ لی کہ اس کی بچی کس حال میں ہے۔

شناع مسز فاروقی کے چہرے کو ایک ٹک تکے جا رہی تھی جن کی گود میں نگینہ سر رکھے بیٹھی تھی اور مسز فاروقی کا ہاتھ اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔

اللہ!

قدم قدم پر یہ نظارے جو مجھے محرومی کا احساس دلاتے ہیں۔

ارے کچھ بولو تو سہی

مسز فاروقی کی آواز اسے بہت دور سے کھینچ لائی۔

"جی وہ میں نے وارڈن سے تو کہہ دیا ہے چند ایک ضروری کارروائیوں کے بعد میں آ جاؤں گی۔

ارے تو سامان لے آتیں کارروائیاں بعد میں ہوتی رہتیں۔ میں اس وقت ڈرائیور کو تمہارے ساتھ بھیجتی ہوں تم سامان بھیج دو خود کل دل آجانا۔ آخر تکلف کاہے کا ہے۔

شناع شرمندہ سی ہوگئی، ساڑھی کا پلو مروڑتی ہوئی آہستہ سے بولی:

تکلف تو کوئی نہیں مسز فاروقی، دراصل میں بغیر اجازت سامان لا نہیں سکتی۔

مسز فاروقی اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں:

بیٹی تم مجھے مسز فاروقی مت کہا کرو۔ خالہ کہہ لیا کرو۔ اگر خالہ برا لگے تو آنٹی کہہ لیا کرو۔ میں تمہاری ماں کی طرح ہوں۔

شناع جہاں یہ بات سن کر ہنس دی تھی وہاں ماں کا ذکر سن کر اس کا دل بھر آیا۔ بات کا رخ موڑ کر بولی:

بہت بہتر خالہ جان، اب ذرا آپ آبگینہ کو بلوا دیں۔

مسز فاروقی اٹھتے ہوئے بولیں:

بس جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ، میں نے تمہارے لئے کمرہ بھی تیار کر لیا ہے۔

شناع خوش دلی سے بولی:

کرایہ کیا ہوگا؟

نئی ڈیوٹی؟

نئی ڈیوٹی کیا؟

مسز فاروقی نے نگینہ کو پیار کرتے ہوئے کہا:

اس کے بدلے میں نگینہ کو پڑھا دیا کرنا۔

جی بہت بہتر

شناع کا دل ہلکا پھلکا سا ہوگیا۔ اس نے سوچا میں کسی کو بھی یہاں کا پتہ نہیں بتاؤں گی سوائے سعدیہ کے اور پھر سعدیہ کو تو پہلے سے ہی معلوم ہے۔

ان ہی خیالوں میں اس نے آبگینہ کو جانے کس طرح پڑھایا، لیکن وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ جلدی سے اٹھی اور اجازت لے کر ہوسٹل کی طرف چل دی۔ اس نے غور نہیں کیا تھا کہ جب وہ مسز فاروقی کے ہاں سے نکلی تھی تو سہیل نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کا جی تو چاہا تھا کہ وہیں اس کو روک لے مگر خالہ کا گھر سامنے تھا اس لئے اس نے شناع کو ذرا آگے نکل جانے دیا اور گاڑی کو آگے لے جا کر کھڑا کر کے پیدل ہی اس سے جا ملا۔ اسے دیکھ کر شناع ذرا ٹھٹکی، ہوسٹل سامنے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی طرح کا بھی اسکینڈل مشہور ہو۔ جب سہیل بالکل اس کے پاس آکر بولا:

آداب عرض ہے۔

تو اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا:

تم؟ کیا بات ہے؟

اور سہیل کو اس کے منہ سے "تم" سن کر عجیب سا سرور محسوس ہوا مسکراتے ہوئے بولا۔

ہوسٹل واپس جا رہی ہیں۔

شعاع خاموشی سے چلنے لگی، مگر سہیل اس کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے پھر کہا:

آپ مجھ سے خفا ہیں؟

آپ میرے کون ہوتے ہیں جن سے میں خفا ہوں گی۔

معاف کیجئے گا آپ کے منہ سے اپنے لئے "آپ" میں پہلی دفعہ ہی سن رہا ہوں۔

شعاع کو اس گوند قسم کے آدمی سے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔

"سنئے سہیل صاحب . . . . "

زہے نصیب آپ نے بھی میرا نام لیا۔ فرمائیے۔

ہوسٹل اب چند قدموں کے فاصلے پر تھا، بغور گیٹ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی:

آپ چاہتے کیا ہیں؟

سہیل سنجیدہ ہو گیا اور بڑے گمبھیر لہجے میں بولا:

میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کی والدہ کے پاس اپنی والدہ کو بھیجنا

چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں ہوسٹل میں رہتی ہوں اور جن کے ماں باپ، ہوں وہ ہوسٹل میں نہیں رہا کرتیں۔

سہیل حالانکہ پوری طرح بات نہ سمجھ سکا تھا مگر اسے بے نام سا صدمہ ہوا۔ بولا۔

نہیں بہت سی لڑکیاں کا گھر بار بھی ہوتا ہے مگر وہ مجبوری کے ساتھ ہوسٹل میں رہتی ہیں۔

مگر میرا کوئی نہیں ہے میں اس لئے یہاں رہتی ہوں۔

اوہ، مجھے یہ جان کر صدمہ ہوا ہے۔

اچھا تو تشریف لے جائیں۔

سنئے

سہیل نے پکارا اور شعاع جو گیٹ کے اندر قدم رکھ چکی تھی پلٹ کر دیکھنے لگی۔ سہیل نے ملتجی لہجے میں کہا۔

آپ اجازت دیں تو میں اپنی والدہ کو یہاں آپ کے پاس ہوسٹل میں لے آؤں، وہ آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔

شعاع کو اس ڈھیٹ آدمی پر بہت غصہ آیا تھا۔ دونوں ہاتھوں اور سر کے زوردار اشارے سے اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

نہیں کبھی نہیں یہ تو بھول کر بھی نہ سوچئے گا، جائیے اب ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر کی طرف۔

ہوسٹل کا گیٹ بند ہو گیا مگر اس کے دل کا دروازہ اسی طرح وا تھا۔ کیا خبر کب وہ اندر قدم رکھ دے۔ ایسا نہ ہو اسے دستک دینا پڑے۔ یہ دَر کھلا ہی رہے تو اچھا ہے۔

وہ نا امید بھی نہیں تھا حالانکہ ایک بار بھی شعاع سے حوصلہ افزا بات نہ ہوئی تھی، مگر دل پاگل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیوانہ ہی تو ہے جو اتنی آس اتنی امید لا دیتا ہے اور لاکھ سمجھانے پر بھی نہیں مانتا۔ وہ لاابالی پن سے چابیاں اچھالتا ہوا کار کی طرف بڑھا مگر ذرا بوجھل بوجھل قدموں سے —— کار لے گیا اور یہ جا وہ جا۔

شعاع کمرے میں داخل ہوئی، حالانکہ سہیل اسے راستے میں مل گیا تھا پھر بھی خلافِ توقع اس کا موڈ اچھا تھا۔ چونکہ اس نے جاتے ہی ناجیہ کو گھورا نہیں تھا اس لئے وہ بھی خوش ہو کر بولی۔

شعاع تمہیں وارڈن نے بلایا ہے۔

کیوں؟

کوئی صاحب تمہیں ملنے آئے تھے۔

شعاع نے تیوری پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

تمہیں کیسے معلوم؟

اور ناجیہ اسی انداز میں ڈرتی ہوئی آہستہ سے بولی۔

میں نے انہیں دیکھا ہے۔ وارڈن نے مجھے بلایا تھا تمہارا معلوم کرنے کے لئے۔

اور تم نے نہ جانے کیا الٹی پلٹی ہانکی ہو گی۔

میں نے تو کچھ نہیں کہا۔

ناجیہ غریب کی آنکھیں بھر آئیں۔ شعاع کمرے سے نکلتے نکلتے بولی۔

بس بس رہنے دو۔

اور وارڈن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کا موڈ بہت خراب ہو گیا۔ اسے غزالہ پر سخت غصہ آرہا تھا۔ بھلا افتخار کو بار بار بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی عالم میں وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وارڈن نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

تمہارے والد کے دوست کل بھی آئے تھے اور آج بھی، ابھی چھ بجے آنے کو کہہ گئے ہیں۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔

لیکن میڈم اب تو سوا چھ بج رہے ہیں۔

اوہ اچھا، چاہو تو یہاں بیٹھ جاؤ، ورنہ میں بلوا لوں گی۔

شعاع وہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر آڑی ترچھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ فیصلہ ہو چکا تھا کل تک اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ وارڈن کا بلاوا آئے گا مگر کوئی نہ آیا اور رات کی جھالر گرتی رہی۔ اندھیرے کی تہہ دبیز اور دبیز ہوتی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حنا سو گئی تھی مگر نعمان اپنے آرام دہ بستر پر بے چین پڑا تھا۔ اس نے مدھم روشنی میں حنا کی طرف دیکھا وہ گہری نیند میں تھی۔ چہرے پر آسودگی کے آثار تھے اور سانس ایک مدھم ہموار لے پر چل رہی تھی وہ غور سے حنا کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دو باتیں حنا سے چھپائی تھیں ایک تو یہ لبنیٰ نے اسے شعاع کا پورا اتہ پتہ دیا تھا۔ دوسرے آج جو سانحہ اس کے دل پر گزرا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں نے حنا کو ساری بات بتا دی ہوتی تو کیا وہ اس طرح سو سکتی تھی۔ کیا پھر بھی اس کے چہرے پر اتنا ہی سکون اور اتنی ہی آسودگی کی جھلک نظر آتی۔

نہیں، کبھی نہیں۔

وہ خود ہی بڑبڑایا اور چت لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ حنا کو کسی بات کی بھی خبر نہیں ہونے دے گا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ شعاع سے بھی نہیں ملے گا اور نہ ہی

بتائے گا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

لیکن

میرے اللہ کیا میری معصوم بچی ساری عمر اسی طرح تڑپتی رہے گی؟ کیا زندگی بھر اسے باپ کی مار رہے گی؟ اور پھر جب اسے معلوم ہوگا کہ اتنی بار ملنے والا نعمان اس کا باپ ہے تو مجھے ہی بہت ظالم سمجھے گی۔

اور کیا میں اسے اسی زمانے کی ٹھوکروں میں چھوڑ دوں؟ اس کے دل اور دماغ میں جنگ ہو رہی تھی۔

اس کے سامنے اس کی دونوں بیٹیاں تھیں لبنیٰ اور شعاع۔

وہ ایک کو دوسری پر کیسے ترجیح دے دے۔

لبنیٰ جانتی ہے کہ وہ سہیل سے منسوب ہے اور وہ حنا کے ساتھ جا جا کر بازار سے اپنے جہیز کی چیزیں ابھی سے لا رہی تھی۔ یہ اس کی سلیقہ مند ماں کا حکم تھا۔

اسے کبھی بھی محرومی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ نعمان اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ چھوٹے بھائیوں کی جان گویا باجی میں تھی اور حنا نے سگی ماں نہ ہوتے ہوئے بھی اسے بھرپور محبت دی تھی جس میں بناوٹ کا تصنع کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اس کے برعکس شعاع نے پرورش ہی محرومیوں کی گود میں پائی ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں محبت کیسی ہوتی ہے خواہ وہ ماں کی ہو یا باپ کی۔ وہ ایک اور محرومی سہہ لے گی۔

نعمان نے کروٹ بدلی اور سوچا۔

لیکن لبنیٰ جس کے احساس کو کبھی ٹھیس نہیں لگی، اتنی بڑی بات سہے گی، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

نہیں، کبھی نہیں۔ اُف۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان کا سر درد کے مارے پھٹنے کو تھا۔ اس کے منہ سے اُف ذرا بلند آواز سے نا
یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نعمان سر تھامے بیٹھا تھا۔ وہ گھبرا کر بولی۔

کیا ہوا؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟

نعمان نے یک دم خود کو سنبھال لیا۔ اگر پردہ داری ہی کرنی ہے تو خود پر جبرا
پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

سر میں بے حد درد ہے۔

حنا نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور عجیب طرح ٹمٹما رہی تھیں
سے دیکھتے ہوئے بولی۔

شام کو تو آپ ٹھیک تھے، کیا نیند نہیں آئی؟

نہیں سو گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اچانک آنکھ کھل گئی تو سر میں درد محسوس ہوا
دم بڑھ گیا ۔۔۔ یہ تم کیوں اٹھ گئیں سو جاؤ۔

حنا نے عجیب لہجے سے نعمان کی طرف دیکھا اور بولی۔

واہ میں کیوں سو جاؤں۔ آپ بیٹھے ہیں آپ کا سر دبا دوں۔

اس نے نعمان کو زبردستی لٹایا اور نرم نرم ہاتھوں سے سر دبانے لگی۔ وہ کبھی اس کے
گھنیرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی اور کبھی ہولے ہولے کنپٹیاں دبانے لگتی اور نعمان آہستہ
سے دیکھتا دیکھتا غنودگی میں ڈوب گیا۔ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ حنا کتنی دیر تک سر دبا
اسے غور سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ پریشانی جو وہ اس سے چھپائے ہوئے تھا سوتے میں اس
کے چہرے سے ہویدا تھی۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ سوچنے کی بات یہ نہیں تھی کہ
نعمان پریشان کیوں تھا، وہ تو اکثر پریشان رہتا تھا۔

لیکن۔

اس سے پہلے اس نے کبھی اپنی پریشانی حنا سے نہیں چھپائی تھی۔ اب نعمان سو رہا تھا اور حنا
جاگ رہی تھی۔

ناشتے کی میز پر حسبِ معمول وہ دونوں ہی تھے۔ لبنیٰ اور بچے ناشتے کے بعد اسکول وغیرہ جا
چکے تھے۔ وہ تب بھی غور سے نعمان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ مسکرا بھی رہا تھا اور حنا سے باتیں بھی کر
رہا تھا لیکن الجھا الجھا سا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجرم جرم کے بعد اسے چھپانے کے لئے ادھر
ادھر کی باتوں میں دوسروں کا دھیان بٹائے۔ حنا انتظار ہی کرتی رہی اور وہ بغیر کچھ بتائے
چلا گیا۔

وہ اپنے دفتر میں بھی پریشان بیٹھا رہا۔ فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کبھی جھکاؤ شعاع کی
طرف ہوتا کبھی لبنیٰ کی طرف۔ آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا اور ایک طویل سانس لی۔

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ سہیل کے والد کا فون تھا۔ سہیل اکلوتا لڑکا تھا اس لئے
ماں باپ کو اس کی شادی کی بہت جلدی تھی، چاہتے تھے جلدی بہو گھر میں آئے اور وہ یورپ
بھر کا چکر لگا کر آئیں ۔۔۔ اس وقت وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ نعمان نے منگنی کی تاریخ طے
کر لی ہے یا نہیں۔ نعمان ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے کہا۔

بس جناب آپ تو یونہی آنا کانی کرتے ہیں۔ اس وقت سہیل کی والدہ آپ کی بیگم کے
پاس گئی ہیں ۔۔۔ دونوں مل کر طے کر لیں گی، مگر آپ نے مجھے بیگم کے سامنے خوب شرمندہ کیا۔

نعمان نے ہڑبڑا کر کہا۔

کیا بھابی صاحبہ گئیں؟

جی ہاں کوئی اعتراض؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں، اچھا آپ شام کو آیئے گا تو باتیں ہوں گی۔

اچھا آجاؤں گا، صاحبزادے کو بھی لاؤں گا۔

بہتر ہے۔

فون بند ہوتے ہی نعمان نے فوراً گھر کا نمبر رنگ کیا۔ دوسری طرف حنا تھی، وہ اس سے بولا۔

حنا، بیگم حق آ رہی ہیں تمہاری طرف، فی الحال انہیں ٹال دینا۔

کیوں ٹال کیوں دوں؟

اتنی بار میں نے کہا مگر اب تک تم نے لبنیٰ سے نہیں پوچھا۔

اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے کل ہی بات کر لی تھی اسے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ وہ تو ——

بہت خوب اور مجھے نہیں بتایا۔

آپ تو جانے کل کہاں کھوئے ہوئے تھے۔

اچھا ٹھیک ہے، ویسے شام کو سہیل اور حق صاحب خود بھی آئیں گے پھر تو میں بیگم حق کو منگنی کی تاریخ دے دوں۔

جیسا مناسب خیال کرو۔

میں انہیں بھی شام تک روک لوں گی آپ کے آنے پر ہی بات ہوگی۔

ٹھیک ہے۔

نعمان عجیب چکر میں پھنس گیا تھا۔ ابھی رات کا اثر زائل نہ ہوا تھا کہ وقت نے اسے اک پلٹا دے دیا تھا۔ وقتی طور پر وہ سب باتیں بھول گیا۔ اسے لبنیٰ کی منگنی کی بے حد خوشی ہوئی،

اس بات کا مطلب تھا کہ سہیل اور شجاع ایک دوسرے سے یونہی واقف تھے، ورنہ حق صاحب اس وقت منگنی کا ذکر نہ کرتے۔ سہیل ان کا بے حد لاڈلا بیٹا تھا اور باپ بیٹے میں بے تکلفی بھی بے حد تھی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ اب تک باپ سے کہہ چکا ہوتا۔

چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا، منگنی ہو جائے گی تو خود ہی بات ٹھیک ہو جائے گی۔ کسی سے بات کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم اتنی دور تک جائیں۔

نعمان کا ذہن اور دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اور وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر وہ فارغ ہوتا تو اسے خود ہی محسوس ہو جاتا کہ مطمئن ہو جانے کے باوجود ایک ہلکی سی چبھن اس کے دل میں ہو رہی تھی۔

وہ بظاہر مطمئن ہونے کے باوجود مطمئن نہ تھا۔ اس لئے شام کو چائے کے وقت حق صاحب سے باتیں کرتے ہوئے سہیل کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ حق صاحب قہقہے لگا رہے تھے۔ سہیل حسب سابق خاموش تھا اور لبنیٰ بھی موجود تھی۔ مگر آج وہ کچھ جھجک رہی تھی اور چائے کے بعد فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہ سب لوگ آ کر لان میں بیٹھ گئے۔

بیگم حق نے سونف چباتے ہوئے کہا۔

نعمان بھائی، بھابی نے صبح سے ہی مجھے روک رکھا ہے۔ اب بہت کچھ کھا پی بھی لیا ہے —— اب تو صحیح بات بتا دیں۔

نعمان ہنس دیا اور حنا سے مخاطب ہوا۔

ذرا مٹھائی کی پلیٹ لاؤ، آج ان کا منہ بھی میٹھا کرا ہی دیں۔

بیگم حق جلدی سے بولیں۔

بھیا منہ تو پہلے ہی میٹھا کر چکی ہوں، اب تو بس منگنی کی تاریخ دے دو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور نعمان نے دیکھا کہ سہیل کا دمکتا ہوا چہرہ یک دم پھیکا پڑ گیا اور وہ ہکا بکا سا لبنیٰ کی طرف دیکھنے لگا ـــــ حق صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹا، تمہاری منگنی کی بات ہو رہی ہے، ذرا منہ پر رومال رکھ کر شرما دو۔"

سہیل نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے دل پر تو قیامت گزر گئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی بے خبری میں بات اتنی بڑھ جائے گی۔ مدت گزری جب ماں نے اس سے لبنیٰ کے بارے میں رائے لی تھی، تو وہ خوشی سے مان گیا تھا، مگر جب تو اس نے شجاعت کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ گو شجاع نے اسے کبھی ہمت نہ دلائی تھی مگر وہ ناامید بھی تو نہیں تھا۔

اسے امید تھی وہ جلد ہی شجاع کو راضی کرے گا تو اماں سے بات کرے گا۔ اس لئے کہ لبنیٰ کے بارے میں رائے لئے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا اور اس نے اس کے بعد سوچا بھی نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ گئی ہو گی۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ وہ یک دم خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے، کیوں ہنس رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بس سر جھکائے بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا کہ یک دم حق صاحب نے اس کے منہ میں برفی کا ٹکڑا ٹھونس دیا اور بولے۔

لو میاں صاحبزادے منہ میٹھا کرو۔

مٹھائی کچھ اس کے ہونٹوں پر اور باقی کپڑوں پر گر گئی۔ سب نے قہقہہ لگایا۔

سہیل شرمندہ سا ہو کر مسکرایا اور رومال سے منہ صاف کر کے کپڑے جھاڑنے لگا۔

شرمندگی کی یہ مسکراہٹ تو یونہی اس کے لبوں پر آ گئی تھی، لیکن نعمان اس کے مسکرانے پر اسی طرح مطمئن ہو گیا جیسے ڈوبتا ہوا انسان تنکے کا سہارا لے کر۔ آخر دل میں اٹھنے والے

اندیشوں کو کم تو ہونا ہی ہے۔

تو اور حکیم حق بھی کھڑے ہو گئے۔ رات ہو چلی تھی وہ گھر جانے کی اجازت چاہتے تھے مگر جانے انہیں رات کے کھانے پر بھی روک لیا۔

اور سہیل کو کھانے پر معلوم ہوا کہ صرف ایک ہفتے بعد اس کی منگنی کی تاریخ طے پائی ہے اور دوسری بات یہ کہ لبنیٰ ان کے ساتھ کھانے پر موجود نہ تھی۔

لبنیٰ نے روشنی گل کر کے سارے دریچے کھول رکھے تھے اور اپنے سیاہ بال کھولے کنگھا ہاتھ میں لئے کھڑکی میں کھڑی لان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہنسنے کی آواز اس کے کانوں میں آتی تھی۔ مگر وہ تو سہیل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں کبھی کسی کا خیال نہیں آیا تھا بھلا جسے گھر میں ہی اتنی محبت میسر ہو، وہ باہر کسی کو کیوں ڈھونڈے۔ اسے سہیل نہ تو برا لگتا تھا نہ اچھا، بچپن کا ساتھ تھا۔ اچھی خاصی دوستی بھی تھی مگر بے حد سادہ قسم کی۔ اسے کبھی سہیل سے شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج وہ اسے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ اس سے منسوب کر دی جانے والی تھی۔ یہ بات اسے حنا نے بتائی تھی۔ آج اسے سہیل اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے گھنے بالوں، اس کے دراز قد کو اس نے پہلی بار پسندیدگی سے دیکھا آج تھا اس نے دیکھا کہ سہیل کے بالوں میں ہلکی ہلکی لہریں ہیں جو بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔ وہ اس کے ماں باپ کی پسند تو تھا ہی، لیکن آج اس کو بھی پسند آ گیا تھا۔ وہ شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ سب کہتے تھے وہ نعمان کی طرح ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کے کھلے بالوں کو ہولے ہولے ہلا رہے تھے اور لبنیٰ بہت خوش تھی۔ اس نے دیکھا سب اٹھ کھڑے ہوئے اور کھانے کے لئے اندر چلے سہیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے غیر ارادی طور پر اوپر نگاہ کی، اندھیرے میں کھڑی لبنیٰ بھلا اسے کیسے نظر آتی مگر وہ گھبرا گئی۔ اور جلدی سے کھڑکی بند کر کے کمرے میں روشنی کر دی۔ اور آئینے کے سامنے جا کر تکنے لگی۔ آج تو اسے خود سے بھی شرم آ رہی تھی۔

شعاع خوش تھی، بے حد خوش۔ مسز فاروقی نے اسے سب سے آخر والا کمرہ دیا تھا، جس کی کھڑکیاں پچھلے لان کی طرف کھلتی تھیں اور باہر کی سمت دروازہ بھی تھا تاکہ اس کی سہیلیاں آئیں تو اسے دقت نہ ہو۔ وہ باہر کی طرف سے تالا لگا کر یونیورسٹی جاتی۔ اس کا خیال تھا اندر کی طرف سے آنے جانے میں مسز فاروقی کو دقت ہو گی۔ مسز فاروقی بھی خوش تھیں۔ انہوں نے سب نوکروں سے کہہ رکھا تھا کہ شعاع کے ہر حکم کی فوراً تعمیل ہو اور اگر اس سے کوئی ملنے آئے تو چائے وغیرہ اس کے کہنے سے پہلے تیار ہو۔

شعاع کے کپڑے روز دھلتے اور استری کیے کرائے ملتے۔ جب اس نے مسز فاروقی سے ذرا تکلف برتا تو وہ زور سے ہنس کر بولیں۔

میری پے انگ گیسٹ ہونا؟ یہ تو سب اس میں شامل ہے۔ اور بات ختم کر دی۔

آبگینہ اور نگینہ باری باری اس کے پاس پڑھنے اس کے کمرے میں آ جاتیں باقی وقت وہ آرام کرتی، اور امتحان کی تیاری کرتی۔ بڑا سکون تھا۔ دیواروں اور پردوں کا سبز رنگ اس کے دل کو بڑی طمانیت کا احساس دلاتا۔ گو اسے یہ رنگ پسند نہیں تھا مگر جب اس کے تھکے ہوئے ذہن کو سکون ملا تو اس نے اسے قبول کر لیا۔

کمرے کی صفائی اس کے یونیورسٹی سے آنے کے بعد ہوتی تھی۔ اس لئے اب وہ چابیاں مسز فاروقی کو دے جاتی۔ اب اس کا بستر بھی روز صاف ستھرا ہوتا اور چیزیں بھی دھول مٹی سے

صاف ہوتیں۔ ورنہ وہ تو تین تین دن بعد چیزیں صاف کیا کرتی تھی۔ پھر مسز فاروقی نے بسکٹوں کے ڈبے اس کے کمرے میں لا رکھے اور جب وہ کچھ کہنا چاہتی تو وہ ہنس کر بولتیں۔

تم میری پے انگ گیسٹ ہو، اس لئے یہ ضروری ہے۔

پے انگ گیسٹ۔ شعاع کو اب اس لفظ سے شرم سی آنے لگی تھی۔ یہ چند دن جو اس نے گزارے تھے، بے حد آرام دہ تھے اور پگلی لڑکی خوش تھی بے حد خوش۔ جیسے اب اسے کوئی ٹھوکر نہیں کھانا پڑے گی۔ تیسرے دن ہی سعدیہ اسے ملنے آئی تھی اور وہ بھی بے حد خوش تھی۔ مسز فاروقی ان کی بے حد تپاک سے ملنے والی تھیں۔ اس لئے سب مل کر بیٹھے اور بہت دیر تک ہنستے بولتے رہے اور جب ہی اسے معلوم ہوا کہ فاروقی صاحب بھی عنقریب یورپ سے آنے والے تھے۔

لبنیٰ نے شرماتے شرماتے سعدیہ کو کارڈ دیا اور بولی۔

شعاع کہاں ہے؟

سعدیہ عادت کے مطابق گھاس پر بیٹھی تنکے نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی۔ ایک تنکہ چباتے ہوئے بولی۔

معلوم نہیں صبح سے مجھے نظر نہیں آئی۔

اور کارڈ تھامتے ہوئے بولی۔

اب کیا ہے؟ تمہاری شادی؟

لبنیٰ شرما گئی اور بولی۔

منگنی

سعدیہ تنکے پھینک سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہُرّے، بڑی چھپی رستم نکلی ہو۔

لبنیٰ کا چہرہ اور سرخ ہو گیا، دوسرا کارڈ دے کر بولی۔

یہ شجاع کا ہے، تم دے دینا یا میرے ساتھ اس کے ہوسٹل چلو۔

سعدیہ اطمینان سے بولی۔

بے کار ہے وہ نہیں آئے گی۔

کیوں؟

ارے اسے سالگرہ پر کس مصیبت سے میں لائی تھی۔ تمہیں کیا معلوم۔

ارے

لبنیٰ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ذرا ٹھہر کر بولی۔

تم میرے ساتھ اس کے ہوسٹل چلو میں خود منا لوں گی۔

سعدیہ ہنس دی اس کے بھولپن پر اور بولی۔

شجاع کے پاؤں میں چکر ہے۔ اس نے ہوسٹل چھوڑ دیا ہے۔

اب کہاں گئی ہے۔ کیا اپنے عزیزوں کے پاس؟

جی نہیں، کسی اور جگہ رہ رہی ہے۔

اچھا مجھے پتہ بتا دو یا ساتھ چلو۔

سعدیہ نے پھر گھاس کا تنکہ نوچا اور بولی۔

ممانعت ہے۔

میں سمجھی نہیں۔

سعدیہ کو لبنیٰ پر ترس آگیا۔ اس کا جی چاہا اسے پتہ بتا دے مگر شجاع کا بھی تو ڈر تھا۔

اور وہ شجاع جیسی عزیز دوست کو خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے سر ہلا کر بولی۔ ہوسٹل میں اس کے رشتہ دار پہنچنے لگے تھے۔ اس خدشے سے وہ ہوسٹل سے چلی گئی ہے اور اس نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ میں کسی کو بھی وہاں کا پتہ نہ بتاؤں۔

لبنیٰ نے مایوسی سے کہا۔

مجھے بھی نہیں؟

نہیں، مجھے افسوس ہے۔

لبنیٰ کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ اس نے کارڈ سعدیہ کو دے دیا اور دھیمی آواز سے بولی۔

وہ آئے نہ آئے یہ کارڈ اسے پہنچا دینا۔

سعدیہ نے کارڈ تھام لیا۔ اسے لبنیٰ پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ جو اس کے پاس آئی تھی تو اتنی خوش تھی مگر جاتی بار کیسی افسردہ سی ہو کر گئی تھی۔ شام کو وہ شجاع کی طرف گئی اور کارڈ دیتے ہوئے اسے دن کی ساری روداد سنا دی۔ جس کے جواب میں شجاع نے اطمینان سے کہا۔

اچھا کیا، مجھے واقعی وہاں نہیں جانا ہے۔

اور سعدیہ کو اس بے دردی پر غصہ ہی تو آگیا بولی۔

تم بہت ظالم ہو۔

شجاع ہنس دی

کیوں؟

ایمان سے مجھے لبنیٰ پر بہت ترس آیا تھا۔ بے چاری اتنی چاہت کرتی ہے تمہاری۔

شجاع نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیوں کرتی ہے بے چاری حیا ہے۔

سعدیہ نے کہا۔

بس دانت مت نکالو۔

شجاع ہنس دی۔

خفا ہو گئیں، اچھا بس چلوں گی۔

سچ!

سعدیہ خوش ہو گئی اور پھر کسی خیال سے منہ بنا کر بولی۔

اور جاؤ گی وہی کاٹن کے کپڑے پہن کر۔

نہیں ساڑھی پہن لوں گی۔

سعدیہ جل ہی تو گئی بولی۔

رہنے دو ساری ساڑھیوں کا حشر میرے سامنے ہے۔ کسی کی فال پھٹی ہے کسی کا آنچل ادھڑا ہے۔

شجاع ہنس دی، بات بھی سچ تھی۔ کہنے لگی۔

اچھا میرے ساتھ بازار چلو میں ساڑھی خرید لاتی ہوں۔

سعدیہ جھٹ پٹ راضی ہو گئی۔

وہ دونوں اسی وقت بازار گئیں اور شجاع نے نیلی جارجٹ کی سادہ ساڑھی اور بلاؤز خرید لیا۔ سعدیہ کو سادہ ساڑھی پسند تو نہیں آئی تھی مگر غنیمت تھا تیار تو تھی، مگر شجاع سے کیا بعید تھا کہ جس حال میں بیٹھی ہو اسی طرح اُٹھ کے چل دے۔ بہت کہنے سننے پر اس نے سفید چپل بھی خرید لی، کیونکہ وہ ساڑھی کے ساتھ چپل ہی پہنا کرتی تھی۔ سب تیاریاں مکمل

ہو گئیں تو سعدیہ گھر چلی گئی۔ اور شجاع اس گھر کے بارے میں سوچنے لگی جہاں جا کر اسے کتنا سکون ملا تھا کتنی محبت ملی تھی۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں جب لبنیٰ سے ملاقات ہوئی تو لبنیٰ نے اسے بذاتِ خود دعوت دی تو شجاع نے انکار کر دیا۔ سعدیہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ مگر جب اس نے شجاع کی آنکھوں میں شرارت کی چمک دیکھی تو خوش ہو گئی۔ کافی دیر تک لبنیٰ کو تنگ کرنے کے بعد آخر اس نے حامی بھر لی۔

شجاع کو لائبریری جانا تھا۔ وہ سعدیہ اور لبنیٰ سے اجازت لے کر چل دی۔ اُس کی مسکراہٹ، چلبلاپن، شرارت یہ سب باتیں لبنیٰ نے بھی محسوس کیں اور سعدیہ نے بھی۔

وہ کتنا بدل گئی تھی یہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہی سوچتی رہیں۔

وہ اتوار کا دن تھا اور موسم بے حد خوشگوار تھا۔ شجاع پانچ بجے تیار تھی جب سعدیہ اسے لینے آ پہنچی۔ سالگرہ والے دن کے تجربے سے وہ ڈری ہوئی تھی اس لئے وہ بھی سادہ ساڑھی باندھ کر آئی تھی۔ البتہ بال بہت خوب صورت طریقے سے سیٹ کروائے تھے۔ ہاتھ میں موٹا سا سونے کا کنگن اور کانوں میں بھاری بالیاں پہنے، وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اس نے شجاع سے کہا کہ لاؤ تمہارا بھی جوڑا بنا دوں، مگر وہ شجاع ہی نہیں جو کسی کی بات آسانی سے مان جائے۔

وہی ڈھیلی ڈھالی چوٹی باندھ کر سوکھا منہ لئے تیار تھی مگر اس سوکھے منہ پر بھی وہ نکھار تھا کہ سعدیہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

ہونٹ دیکھو کیسے خشک ہو رہے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو اب تو نہیں ہیں۔

شجاع نے کولڈ کریم لگائی۔ سعدیہ جل کر بولی۔

تم سے کوئی بات کہنا ہی مشکل ہے۔

ملازم شربت لے آیا تھا، تھوڑے سے تکلف کے بعد انہوں نے پی لیا۔

شجاع نے ملازم سے پوچھا۔

مسز فاروقی کیا کر رہی ہیں۔

اس نے گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

جی ان کے کسی عزیز کی منگنی ہے وہاں گئی ہیں صبح سے۔

شجاع ایک دم رک گئی۔ پھر ہنس کر بولی۔

عجیب اتفاق ہے، سعدیہ کہیں یہ عزیز لبنیٰ ہی نہ ہو۔

سعدیہ نے ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

سالگرہ پر تو یہ نہیں تھیں، خیر اب تم چلو۔

ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب وہ دونوں وہاں پہنچیں۔ منگنی کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر تھا دور سے ہی شامیانے لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نعمان جانے کہاں تھا۔ وہ دونوں اندر گئیں تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہیں فوراً لبنیٰ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ مگر وہاں خلاف توقع نہ لڑکیوں کا جھرمٹ تھا نہ بلند قہقہے۔ لبنیٰ گھر کے کپڑوں میں بیٹھی تھی۔ اس نے شجاع کا ہاتھ تھام کر پاس بٹھا لیا۔

میز پر سنہری ٹشو کا جوڑا اور زیورات کے ڈبے پڑے تھے۔ حنا نے آ کر کہا۔

تم لوگ اس کو تیار کر دو بس تمہارا ہی انتظار تھا۔ سب چیزیں وہاں سے آ گئی ہیں۔

انگوٹھی لڑکا خود پہنائے گا اور پھولوں کا زیور اس کی ساس۔

اتنا کہہ کر وہ تو چل دی، کام بھی تو بہت تھا۔

شجاع اور سعدیہ نے لبنیٰ کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ سعدیہ بہت ماہر تھی، اس لئے میک اپ کے وقت شجاع ایک طرف ہٹ گئی۔ البتہ بعد میں لبنیٰ کے زیور ٹھیک ٹھاک کرتی رہی۔ اسے الجھن ہو رہی تھی کہ لبنیٰ بار بار اس کا ہاتھ تھام لیتی تھی، نہ جانے کیوں۔

سعدیہ نے ماہرانہ انداز میں لبنیٰ کا بے حد شاندار میک اپ کر دیا تھا اور وہ بالکل دلہن لگ رہی تھی۔ پھر پیغام آیا کہ لبنیٰ کو نیچے لے آیا جائے۔ یہ کام بھی ان دونوں کے سپرد تھا، نیچے مسند تیار تھی۔ اور لبنیٰ کی ساس پھولوں کا زیور لئے لبنیٰ کی منتظر تھی۔ ان دونوں نے لبنیٰ کو بٹھا دیا اور ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور نعمان جو دروازے میں کھڑا تھا اس کے حواس پر بجلی سی گری۔

اس کی شجاع وہاں موجود تھی اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

وہ پورے انہماک کے ساتھ لبنیٰ کی طرف متوجہ تھی۔ بیگم حق نے لبنیٰ کو پھولوں کا زیور پہنا دیا تھا اور اب سب منتظر تھے کہ سہیل آئے اور لبنیٰ کو انگوٹھی پہنا دے۔

سہیل اپنے والد کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے دیکھا کہ شجاع لبنیٰ کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ قدم منوں بھاری ہو گئے، ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور چکر سا آ گیا۔ وہ ایک ٹک شجاع کو دیکھے جا رہا تھا۔

ادھر

شجاع نے نظر بھر کر آنے والے کو دیکھا تو اس کا مسکراتا چہرہ بجھ سا گیا۔ شگفتہ اور بشاش چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ ایک دھچکا سا لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ اس جذبے کو کیا نام دے۔ اسے سہیل سے محبت

تو نہ تھی۔ اس نے اس سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا، کوئی آس تو نہیں دلائی تھی۔

تو پھر اسے کیا ہو رہا ہے۔

اس کا دل کیوں ڈوبا جا رہا ہے۔ اس کا بدن کیوں کانپ رہا ہے۔

اس کی نبضیں کیوں رکتی محسوس ہو رہی ہیں۔

اس نے خود پر قابو پانے کی لاکھ کوششیں کیں مگر دل و دماغ اور جسم اس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

اور

اس نے اپنا سر سعدیہ کے کندھے پر ٹکا دیا۔

نعمان جلدی سے لپکا اور زور سے پکارا۔

" پانی لاؤ ——— پانی لاؤ

حنا پانی لینے بھاگی۔

ملازمہ پانی کے لئے لپکی۔

بیگم حسن گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

لبنیٰ نے پھول اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔

نعمان نے شعاع کا سر اپنی گود میں لے لیا۔

ہر شخص شعاع کو ہوش میں لانے کی کوشش میں لگا تھا۔

اور

کسی نے یہ نہ دیکھا

کہ

کہ سہیل انگوٹھی ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں سے جا چکا ہے۔

وہ گھر جہاں چند لمحے پہلے غیر معمولی خوشی ہر چہرے پر نظر آ رہی تھی، اب وہاں ہر شخص فکرمند نظر آ رہا تھا۔ سب کو ہٹاتے ہوئے مسز فاروقی آگے بڑھیں۔ انہوں نے نظر بھر کر شعاع کو دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ نعمان نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا ہے، اس لئے وہ آگے بڑھیں اور نعمان کو ایک طرف ہٹا کر شعاع کا سر تکیے پر رکھ دیا جو نہ جانے کون لے آیا تھا۔

سب بے حد مصروف نظر آ رہے تھے، لیکن ابھی تک پانی کا گلاس کوئی نہیں لایا تھا، لیکن ایک لمحہ بعد آگے پیچھے حنا اور ملازمہ گلاس لئے کھڑی تھیں۔

حنا نے شعاع کے بے حد زرد چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے مگر اس نے آنکھ نہ کھولی۔

سعدیہ کا سارا بدن کانپ رہا تھا، اس نے تو کبھی شعاع سے یہ بھی نہ سنا تھا کہ اس کے سر میں درد ہے۔ بس ایک بار سعدیہ کے گھر میں بیمار ہوئی تھی۔ مگر زبان سے اس نے کسی تکلیف کی شکایت نہ کی تھی۔

کیا وہ اتنی بیمار تھی کہ بے ہوش ہو گئی۔ اس وقت ایک لمحے کو بھی سعدیہ کو یہ یاد نہ آئی کہ کچھ ہی دیر پہلے اس نے شعاع کا بے حد گلابی چہرہ دیکھ کر رشک محسوس کیا تھا لیکن یہ وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ یاد کرنے کا نہیں تھا۔ اسے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود نہ بے ہوش ہو جائے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔

ارے بھائی لڑکی اتنی دیر سے بے ہوش ہے ڈاکٹر کو بلاؤ۔

ڈاکٹر کو بلاؤ۔

ڈاکٹر کو بلاؤ۔

کچھ اور آوازیں بھی آئیں تو نعمان کو بھی ڈاکٹر بلانے کا ہوش آیا اور وہ ٹیلی فون کرنے کے لئے بھاگا۔

لبنیٰ بے حد پیار سے نشاع کے رخسار پر چپکے ہوئے بالوں کو ایک ایک کرکے الگ کر رہی تھی۔ سارے پھول اس کی گود سے پھسل کر قالین پر ڈھیر تھے۔ ہر شخص کی توجہ نشاع پر تھی۔ اس ساری بھگدڑ میں صرف مسز حق تھیں جو سہیل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

ارے یہ کہاں چلا گیا، منگنی کا وقت نکلا جا رہا ہے۔

انہوں نے برآمدے میں کھڑے کھڑے گیٹ اور لان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ جہاں کسی کو اندر ہونے والے واقعے کی خبر نہ تھی۔ پھر وہ ہاتھ ملتے ہوئے اندر آئیں اور آبگینہ کو برآمدے میں لے آئیں۔ آبگینہ کی آنکھوں میں آنسو امڈے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی چھلکے اور ابھی چھلکے۔

تم کیوں رونے والی ہو رہی ہو۔

باجی میری باجی کو کیا ہوا۔

ارے کونسی تیری باجی، وہ لڑکی تیری باجی کہاں سے بنی۔

ہائے خالہ جان وہ تو میری باجی ہیں مجھے پڑھاتی ہیں اور ہمارے پاس ہی تو رہتی ہیں۔

وہ کب سے

خیر تم یہ رونا دھونا بند کرو اور جا کر سہیل کو بلا کر لاؤ

کہاں ہیں وہ

میرے خیال میں تمہارے خالو کے پاس ہی ہوگا۔

آبگینہ اپنا چہرہ صاف کرتی ہوئی شامیانے کی طرف گئی، واپس آئی تو سہیل کے بجائے حق صاحب اس کے ساتھ تھے۔ مسکراتے ہوئے بولے۔

کیوں بھئی ہو گئی رسم؟

آپ اندر کیوں نہیں آئے تھے۔

تو بھلا میں عورتوں میں آ کر کیا کرتا۔

جو نعمان بھائی کر رہے تھے۔

ارے بیگم وہ تو لڑکی کا باپ ہے۔

سہیل کہاں ہے؟

اندر ہی ہوگا، ابھی تو باہر نہیں آیا؟

اندر نہیں ہے۔

کیا معموں میں باتیں کرتی ہو، میرے سامنے تو اندر گیا تھا۔

بیگم حق ان کے ساتھ ہی برآمدے سے اتر آئیں اور اندر ہونے والے واقعے کو سنانے کے بعد کہنے لگیں۔

اندر جاتے ہی پریشان ہو گیا اور جونہی وہ لڑکی بیہوش ہوئی باہر نکل گیا میں سمجھی آپ کے پاس ہوگا۔

حق صاحب نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو سکتا ہے وہ ڈاکٹر کو لینے گیا ہو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر زیدی کی کار رکی اور وہ بڑی تیزی سے اندر لپکے اور
بس کھڑے نعمان سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

کہاں ہے مریضہ؟

مگر نعمان حیران تھا۔ اس نے ڈاکٹر زیدی کو تو نہیں بلایا تھا۔ پھر بھی وہ جلدی سے ا
شماع کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے سب لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کو کہا۔ صرف نعمان، حنا، لبنیٰ اور
وہاں رہ گئے تھے۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر نصرت بھی آ گئے۔ جنہیں نعمان نے ٹیلی فون کیا تھا
اور ڈاکٹر نصرت شماع کا دیر تک چیک اپ کرتے رہے۔

وہ اکڑنے والا جسم اس وقت کتنی بے بسی سے پڑا تھا۔

یہ بات لبنیٰ اور سعدیہ نے بیک وقت محسوس کی۔ آخر شماع کو کچھ کچھ وقفوں سے
دیئے گئے۔ ڈاکٹر زیدی نے نعمان کو ایک طرف بلایا اور کہا۔

یہ کیفیت کب سے ہے؟

نعمان کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

مجھے نہیں معلوم یہ تو ہماری مہمان ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا۔

دراصل انہیں گہرا دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ ان کی بے حد احتیاط کی جانی چاہیے ایسا
دوبارہ نہیں پڑنا چاہیئے۔

نعمان کے ذہن پر جیسے بھاری بوجھ آن پڑا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر کہنے لگا۔

ڈاکٹر آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی؟

ڈاکٹر زیدی بولے۔

مسٹر سہیل نے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ نے ڈاکٹر نصرت کو بلایا ہے ورنہ میں نہ آتا۔

نعمان کو خیال آیا کہ اس نے کتنے غلط موقعے پر یہ بات کہی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں ہے۔ دراصل سہیل کو بھیج کر میں بھول گیا تھا۔ آپ مجھے بچی کی
کیفیت بتایئے۔

اب پہلے سے بہتر ہے لیکن فوری علاج کی ضرورت ہے۔ میں نے انجکشن دیئے ہیں۔ یہ
اب بے ہوش نہیں ہیں، بلکہ سو گئی ہیں۔ انہیں کسی ہوادار کمرے میں منتقل کر دیں۔

نعمان نے ڈاکٹر زیدی کو باہر تک جا کر رخصت کیا۔ ڈاکٹر نصرت اس کے بے حد گہرے
دوستوں میں سے تھے۔ اس نے ڈاکٹر زیدی کی آمد پر برا نہ مانا تھا۔ ڈاکٹر زیدی تھے بھی تو
تجربہ کار ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نصرت نے پوچھا۔

کوئی تقریب ہے کیا؟

ہاں، میری بیٹی کی منگنی تھی۔

مبارک ہو۔

شکریہ۔

پھر ڈاکٹر نصرت بھی رخصت ہوا مگر جاتے جاتے تسلی دے گیا کہ لڑکی کی حالت بہتر
ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر زیدی کا علاج موزوں ہے۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی نعمان نے حنا سے
الگ کمرے کی بات کی مگر حنا کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ کہنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہنے دیں ہوش میں آجائے گی تو اپنے گھر جائے گی البتہ فی الحال میرے کمرے میں لٹا دو۔

نعمان نے نگاہ بھر کر حنا کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا اور بے حد پیار سے شجاع کو اٹھا کر

اور لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ مہمان عورتیں پھر کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ نعمان بے حد الجھا

کھڑا تھا۔ بکھری ہوئی بساط پر دوبارہ مہرے سجانے کی تیاری ہوئی۔ حنا نے لبنیٰ کو ٹھیک سے

دوپٹہ اوڑھایا اور بولی۔

یہ تم نے پھول کیوں اتار دیئے۔ ابھی تو تقریب ہونی ہے۔

اس کے لہجے میں خفگی تھی جو لبنیٰ نے بھی محسوس کی۔ مگر واقعی اس نے پھول کیوں اتار

دیئے تھے۔

بیگم حق نے حنا کو اشارے سے بلایا اور ایک طرف لے جا کر بولیں۔

بھابی، سہیل نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔

حنا نے کہا،

کیا کہہ رہی ہیں آپ؟

بیگم حق نے کہا۔

ہاں، سہیل کہیں چلا گیا ہے۔

حنا نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

مگر گیا کہاں ہے؟

بیگم حق نے جلدی سے کہا۔

ارے کوئی بات نہیں، دراصل گھبرا گیا ہوگا۔

ایک عورت بولی۔

اور کیا رنگ میں بھنگ جو پڑ گئی گھبراتا نہ تو کیا کرتا۔

بیگم حق نے اس کی تائید کی۔

سعدیہ تو جا کر شجاع کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ حنا مہمان عورتوں کے

پاس تھی اور لبنیٰ تنہا سر جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی۔

یہ کیا ہو گیا، کون سوچ سکتا تھا کہ عین موقعے پر ایسا ہوگا۔

لبنیٰ نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، مخروطی انگلیاں خالی تھیں۔ وہ بہت دیر تک اپنے

ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے ایک دم شجاع کی یہ حرکت غیر معقول نظر آئی تھی۔ اگر طبیعت

اتنی ہی خراب تھی تو نہ آتی۔

اس نے طویل سانس لی اور ذرا سیدھی ہو کر بیٹھی تو نعمان سر جھکائے کمرے میں ادھر اُدھر گھوم

رہا تھا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے وہ آثار تھے جو کبھی لبنیٰ نے نہ دیکھے تھے۔ وہ ایک دم لبنیٰ

کے پاس آکر بولا۔

کیا یہ لڑکی بیمار رہتی ہے؟

مجھے نہیں معلوم ابو یہ وہی لڑکی ہے جسے آپ اپنے دوست کی بیٹی سمجھ رہے تھے۔

اوہ اچھا، میں پہچان نہیں سکا۔

نعمان نے مصلحتاً لبنیٰ سے یہ بات چھپائی کہ وہ تو شجاع کو ڈھونڈنے ہوسٹل تک جاتا

رہا تھا۔

ابو آپ تو کہہ رہے تھے میں اس کے بارے میں معلوم کروں گا۔

نعمان نے جلدی سے کہا۔

ارے نہیں نہیں، اس کی ضرورت ہی نہ پڑی، وہ لڑکی تو اور ہے۔ اس کے باپ سے میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاقات ہوئی تھی۔

پھر وہ دونوں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ عورتیں اجازت لے کر جانے لگیں مگر سہیل نہ آیا۔ جہاں جہاں اس کے ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے، معلوم کروایا گیا۔ ہر جگہ ٹیلی فون کئے گئے مگر سہیل کا پتہ نہ معلوم ہو سکا۔ بیگم حق حنا سے شرمندہ تھیں اور حق صاحب نعمان کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جب بہت رات ہو گئی تو نعمان نے کہا۔

اب انتظار فضول ہے، آپ لوگ بھی آرام کریں۔

لبنیٰ کو پہلے ہی اوپر بھیج دیا گیا تھا، سعدیہ جا چکی تھی، شجاع غافل تھی۔ سب سے پہلے مسز فاروقی نے اسے لے جانے کی اجازت چاہی۔ نعمان تو نہیں چاہتا تھا مگر حنا نے فوراً اجازت دے دی۔ اس پر نعمان نے اتنا کہا۔

ڈاکٹر زیدی کو اس کی حالت کی اطلاع کر دیجئے گا۔ اس کے علاج پر جو خرچ ہو میں دینے کو تیار ہوں۔

مسز فاروقی نے اسے ایسے کڑے تیوروں سے گھورا کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ بس آگے بڑھ کر شجاع کو اٹھایا اور ان کی کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

آبگینہ نے شجاع کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مسز فاروقی آگے جا بیٹھیں۔ رخصت ہوتے ہوئے مسز فاروقی نے کہا۔

نعمان بھائی میرے لئے یہ بچی پہلے ہے اور میری دوسری بچیاں بعد میں، اس کے علاج کی آپ فکر نہ کیجئے گا۔

بیگم حق اور حق بے حد شرمندہ شرمندہ رخصت ہو گئے۔

نعمان اور حنا اندر آئے۔ سجی ہوئی مسند اور سنورا ہوا کمرہ کتنا ویران لگ رہا تھا۔ نعمان سر تھام

کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بچے نہ جانے کب سے کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ حنا نے جا کر انہیں بلایا، کھانا وغیرہ کھلایا۔ نعمان نے کھانا نہ کھایا، صرف چائے کا ایک کپ پیا۔

لبنیٰ کے کمرے کا دروازہ بند تھا، کھٹکھٹانے کی ہمت حنا میں نہ تھی۔ اس لیے خاموش ہو کر آ گئی۔ نعمان بھی چائے پی کر اپنے کمرے میں آ لیٹا تھا۔ حنا بھی آ گئی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ جیسے کسی نے بیدردی سے نوچ ڈالی تھی۔ بولی۔

کیسی منحوس لڑکی تھی۔

نعمان کے دل میں کانٹا سا چبھا۔ تڑپ کر اس نے حنا کی طرف دیکھا جو اپنی فکر میں گم کہہ رہی تھی۔

میری بچی کی پہلی پہلی خوشی اس منحوس نے چھین لی۔ اگر طبیعت خراب تھی تو نہ آتی۔ اور پھر جب آئی تھی تو اچھی خاصی تھی۔ نعمان خاموش رہا، وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا، وہ حسرت بھرے انداز میں کہتی رہی۔

کتنا چاؤ تھا مجھے اپنی بچی کی منگنی کا، اور وہ بھی دل میں کیا سوچتی ہو گی۔ کیسی پیاری دلہن بنی تھی۔ دلہن بناتے وقت بھی تو یہ لڑکی اس کے پاس تھی۔ جل ہی گئی ہو گی۔ میری لبنیٰ کو اس نے ٹوک دیا ہو گا، نظر لگا دی ہو گی۔

حنا ذرا دیر کو خاموش ہوئی پھر تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ گئی اور بولی۔

اور ذرا سہیل کو دیکھئے ایسی بھی کیا گھبراہٹ کہ اٹھ کر بھاگ گیا۔ انگوٹھی پہنا کر ہی چلا جاتا۔ سب ملنے جلنے والے نہ جانے کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔

نعمان نے آخر کہا۔

کیوں پریشان ہوتی ہو، بات ہی ایسی تھی کہ انسان گھبرا جائے۔ میرا خود دل چاہتا تھا میں کہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھلی ہوا میں نکل جاؤں۔ اب تم سو جاؤ، ذرا آرام کرو منگنی کہیں بھاگی نہیں جا رہی اس سے بھی زیادہ دھوم دھام سے کر لینا۔

حنا نے کہا۔

اتنی پریشانی میں نیند کیسے آئے گی۔ مجھے منگنی کی فکر تو کیا ہو گی، فکر تو لبنیٰ کی طرف سے ہے کچھ کھایا بھی نہیں اور میری تو ہمت بھی نہیں پڑی اسے بلانے کی۔ کیسی خوشی کی تقریب ستیاناس ہو گئی اس لڑکی کی وجہ سے۔

نعمان نے کہا۔

اچھا اب سو جاؤ دن میں باتیں کریں گے۔

حنا کا ذہن بوجھل سا تھا۔ تاہم بستر پر لیٹی تو نرم نرم بستر نے لوری کا کام دیا۔ اور وہ جلد ہی سو گئی۔ لیکن نعمان کی عجیب حالت تھی۔ گو شعاع کی اتنی بری حالت دیکھ کر اسے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ فوراً اس کا سر گود میں رکھ لیا اور یہ تک نہ سوچا کہ لوگوں کی نگاہ میں وہ اس کی بیٹی نہیں، کوئی انجانی لڑکی ہے۔ اس کے باوجود اس کے لبوں پر نہ جانے کس نے تالے ڈال رکھے تھے کہ وہ اپنی بیوی سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اس لڑکی کو نہ کوسو۔

وہ تو پہلے ہی اتنی بدنصیب ہے۔

باپ کے ہوتے ہوئے یتیم ہے، گھر ہوتے ہوئے بے گھر ہے۔ سب موجود ہیں مگر لاوارث ہے وہ یہ سب کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا تھا۔

شعاع کی تکلیف پر اس کا دل بے کل ضرور تھا مگر جب دونوں بیٹیوں کو سامنے لاتا جب دونوں کا موازنہ کرتا تو اپنے دل میں شعاع کے لئے ہمدردی کے جذبات محسوس کرتا، اس کی گزرتی ہوئی زندگی کی تلخیوں کو محسوس کر کے پریشان ہو جاتا، لیکن آخر میں پلہ بھاری لبنیٰ کا ہی رہتا۔ نعمان

اس پر بہت غور کرنے کی کوشش کرتا، لیکن وہ سمجھ نہ پاتا کہ اس کی کیا وجہ ہے جب کہ شروع سے اسے شعاع سے زیادہ پیار تھا۔ کبھی کبھی ایک وجہ اس کی سمجھ آتی تھی کہ شعاع اس سے دور پلی ہے لیکن کن لفظوں نے، کن حالات نے اس کے معصوم ذہن میں زہریلے کانٹے بوئے تھے — یہ نعمان نہیں جانتا تھا۔

جب وہ اور غزالہ ایک ساتھ تھے تو اسے شعاع سے لبنیٰ کے مقابلے میں زیادہ پیار تھا، لیکن اب اس کی وجہ شائد دوری تھی یا صبر کی وہ سل جسے دل پر رکھ کر نعمان اس گھر سے آیا تھا جب وہ زندگی کی بازی ہار کر، ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا تو اس وقت اس کی زندگی کا واحد سہارا لبنیٰ تھی، اس کی باتیں تھیں۔

جب وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ نعمان کے گلے میں حمائل کر دیتی تو نعمان اپنی زندگی کے آدھے دکھ آدھی تکلیفیں بھول جاتا۔

لیکن یک لخت اسے حنا کے وہ الفاظ یاد ہو گئے۔

میری بچی کی پہلی پہلی خوشی اس منحوس نے چھین لی۔

منحوس —

اس لفظ پر نعمان نے اس سے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا مگر اسے پچھلا زمانہ شدت سے یاد آ رہا تھا۔ جب اس کا اپنا گھر تھا، غزالہ تھی اور ایک ننھی منی جیتی جاگتی گڑیا تھی۔ وہ دفتر سے آتا غزالہ مسکرا کر اس کا استقبال کرتی، وہ بچی کو گود میں لے لیتا، پھر وہ لوگ اکٹھے چائے پیتے۔

باتیں ہوتیں۔

پیار کی باتیں —

آئندہ زندگی کے پروگرام —

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور دن بھر کے واقعات ایک دوسرے سے کہتے۔

بلکہ ——

جب تک یہ دونوں ایک دوسرے سے دن بھر کی رُوداد نہ کہہ لیتے چین نہیں پڑتا تھا۔

زندگی کتنے سکون سے گزر رہی تھی، دونوں ملازمت کرتے تھے اور اپنے مستقبل کو اور [illegible] بنانے کے لئے محنت کرتے تھے۔

غزالہ سلیقہ مند تھی، پیسہ بچاتی مگر تنگی نہ ہونے دیتی۔ گھر میں سکون ہی سکون، خوشیاں ہی خوشیاں تھیں —— ہاں کبھی کبھی میمونہ بیگم ایسی بات کر جاتیں جس پر نعمان ناگواری محسوس کرتا، مگر وہ محسوس کرتا تھا کہ میمونہ بیگم کی باتیں اس سے زیادہ غزالہ کو ناگوار گزرتی تھیں۔ وہ ہنس کر نظرانداز کر جاتا۔

پھر ان ہی ہنستے مسکراتے دنوں میں ایک اور ننھے مہمان کی آمد کی اسے اطلاع ملی تو وہ بے حد خوش ہوا۔ غزالہ کو لڑکے کی کتنی تمنا تھی مگر ان کے ہاں بچی آ گئی۔ اور اس گلابی گڑیا کو دیکھ کر نعمان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شعاع ——

اور اس نے اس گڑیا کو سینے سے لگا لیا تھا۔

مگر —— آہ ——

نعمان کے دل سے آہ نکلی۔ اس نے کروٹ بدل کر حنا کی طرف دیکھا اور وہ دوسری طرف منہ کئے سو رہی تھی۔

یہ عورت جو اب میرے بچوں کی ماں ہے اُس وقت بھی مجھ سے محبت کی متمنی تھی مگر میں نے

ہر بار غزالہ کی محبت پر غرور کرتے ہوئے بُری طرح اسے جھڑکا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہی عورت میرے زخموں کا مرہم بن کر آئے گی —— وہ بہت دیر تک حنا کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے ذہن میں غزالہ کے ہیولے اٹھتے بھاگتے رہے۔

شعاع جو اجالوں کا پیغام ہوتی ہے اس کے روشن گھر میں اندھیرے کی پہلی لکیر بن کر نمودار ہوئی۔ اور غزالہ کا مزاج خراب [illegible] ساس نندکو وہ شروع سے پسند نہیں کرتی تھی۔

ان ہی دنوں میمونہ بیگم نے ان کے ہاں مستقل ڈیرہ ڈال دیا اور غزالہ کا مزاج اور خراب رہنے لگا۔ اسکول میں پڑھانا چھوڑ دیا اور گھر بیٹھ گئی۔

وہ غزالہ جو دوپہر تک اسکول میں رہتی تھی، واپس آ کر گھر کے کاموں میں جُت جاتی تھی اب سارا دن فارغ ہونے کے باوجود کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی۔ ہر وقت جلتی بھُنتی رہتی اور جب وہ تھکا ہارا دفتر سے آتا تو مسکرانے کی بجائے کڑے تیوروں سے اس کا استقبال کرتی اور وہ کبھی نہ جان سکا کہ اس کی کیا خطا تھی۔ اور پھر ایک رات اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی سمجھ دار بیگم بات بات پر طلاق کیوں مانگ رہی ہے۔ یہ بات بہت جلد آشکارا ہو گئی کہ وہ اپنی ماں میمونہ بیگم کے سکھانے سے اس کی زندگی کو جہنم بنا دینے کی فکر میں تھی۔

نعمان راتوں کو دیر تک باہر گھومتا مگر اس کے بے قرار دل کو چین نہ ملتا۔ اور آخر ایک دن یہ بات بڑھ گئی۔

اور بڑھتی ہی رہی

پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔

محبت ——

سکون ——

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ اپنی پیاری بچی کی صورت دیکھنے کو ترستا رہا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہ اس سے چھپائی گئی۔ آخرکار اس کے اندر چھپا ہوا مرد جاگا اور ایک باپ اور شوہر سو گیا اور اس مرد نے اپنے ہاتھوں اس بند دروازے پر تالا ڈالا اور چابی پھینک دی۔ وہ دروازہ اب اس کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ ان سب کو بھول گیا۔ زبردستی بھول گیا۔ زندہ رہنے کی خاطر لبنیٰ کی خاطر۔

یہ سب تبدیلی شعاع کی پیدائش پر ہی تو شروع ہوئی تھی۔ کیا واقعی شعاع منحوس ہے۔ کیا اسی کی وجہ سے میری رستی بستی دنیا اجڑی تھی۔

نہیں وہ منحوس نہیں، میں اس چیز کو نہیں مانتا، اس کی ذمہ دار تو میمونہ بیگم ہے ــــ اور غزالہ بھی ــــ غزالہ کوئی دودھ پیتی بچی تو نہ تھی کہ اپنا اچھا برا نہ سمجھ سکتی۔ نعمان نے ذہن کی کہی ہوئی بات کو جھٹلانے کی بے سود کوشش کی کیونکہ اسے بار بار بیتی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

وہ حنا اور بچوں میں مگن ہو گیا تھا۔ اور خاصی پرسکون زندگی گزار رہا تھا کہ اس نے شعاع کو دیکھا۔ جب سے اس نے شعاع کو دیکھا تھا اس وقت سے ہی اس کی ذہنی پریشانیوں کا دور شروع ہو گیا تھا۔ وہ جتنی بار بھی اس کے سامنے آئی۔ ہر بار نئی پریشانی لائی اور یہ ہی کیا کم تھا کہ وہ سہیل سے ملتی ہے، رہی سہی کسر پوری یوں ہوئی کہ عین ایسے موقعے پر بے ہوش ہو گئی جب کچھ ہی لمحوں بعد سہیل اور لبنیٰ کی منگنی ہونے والی تھی۔

اُف خدایا۔ نعمان بھنے ہوئے ماتھے پر مٹھیاں مارنے لگا۔

یہ کیا عجیب موڑ ہے میری زندگی کا، ابھی تو یہ مجھ سے 'میرے گھر سے' اتنی دور رہتے ہوئے بھی ہم پر اتنی اثر انداز ہے۔ اگر میں اسے اپنے گھر میں لے آیا ہوتا، تو نہ جانے کیا ہوتا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے نعمان کے دل میں باپ کی شفقت اور محبت نے سر اٹھایا۔ اسے

شعاع کا مسکراتا ہوا گلابی چہرہ یاد آیا، پھر فوراً ہی اس کے سامنے اس کا زرد پسینے سے تر چہرہ تھا۔

شعاع جو اس کی اپنی بیٹی تھی۔

لیکن ــــ

وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا وہ بدنصیب باپ ہے جس کے گھر میں دو دو کاریں ہیں جس کے بچوں کو زندگی کی ہر سہولت میسر ہے، جو سیٹھ کہلاتا ہے اور اسی سیٹھ باپ کی بیٹی ٹیوشن پڑھاتی ہے، محنت کرتی ہے اور ان معمولی پیسوں سے زندگی کی ضروریات پوری کرتی ہے پیدل چلتی ہے، جس کے پاس گنی چنی ساڑھیاں ہیں، جس نے اپنی نو عمری میں اتنے دکھ اٹھائے ہیں زندہ رہنے کے لئے اتنی جدوجہد کی ہے، وہ زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اپنی ہمت کے بل پر یہ شخص اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ سوائے اس کے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ بس اور وہ اس کا باپ ہے۔

سیٹھ نعمان احمد ــــ

اور ــــ

سیٹھ نعمان احمد رات کے پچھلے پہر میں اپنی بدنصیب بیٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی شعاع کو منحوس سمجھے مگر بیٹی کی محبت اس کو روک لیتی۔ وہ چاہتا تھا صبح ہوتے ہی اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے آئے اور سب کو بتا دے کہ وہ اس کی بیٹی ہے مگر ذہن کی کہی ہوئی باتیں اس کا راستہ روک لیتیں۔ وہ سوچتا رہا اور جب مؤذن کی پہلی آواز بلند ہوئی۔

اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر ــــ

اللہ واقعی بہت بڑا ہے اور نعمان اس لمحے فیصلہ کر چکا تھا، ایک بہت بڑا فیصلہ، فیصلے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد کیا سوچنا' اس لیے وہ بھی سینے تک کمبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔
دُور کہیں سورج نمودار ہونے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ مگر ابھی نہیں' ابھی تو اس کی پہلی شعاع
نمودار ہونے کے لئے ذرا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ ننھی منی چڑیوں نے ایک دوسرے کا
مزاج پرسی کرنی شروع کر دی تھی اور اس لمحے نعمان سو گیا تھا۔

تمام رات شعاع بے خبری سے سوتی رہی۔ مسز فاروقی بھی دو بچیوں کی ماں تھی اسے شعاع
کی اس حالت پر دکھ ہو رہا تھا' اس لئے اس نے صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر زیدی کے ہسپتال میں فون
کیا تو معلوم ہوا کہ کسی مریض کو دیکھنے گئے ہیں۔ بار بار فون کرنے پر کہیں آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر زیدی
سے بات ہوئی۔ وہ فوراً آنے کو تیار ہو گئے۔ فرض شناس ڈاکٹر کی طرح۔ انہوں نے شعاع کو دیکھا'
حالت پہلے سے بہت بہتر تھی' مگر وہ ابھی غافل تھی' اس لئے وہ مسز فاروقی سے پوچھنے لگے۔
یہ آپ کی عزیزہ ہیں۔
اس پر مسز فاروقی کو جو جو کچھ شعاع کے بارے میں علم تھا انہوں نے ڈاکٹر زیدی کو بتا دیا۔
ڈاکٹر کو بے حد دکھ ہوا' کبھی اس کی بھی ایک بچی تھی جو زندہ ہوتی تو شعاع جتنی ہی ہوتی۔ وہ بے حد
رحم بھری نگاہوں سے شعاع کو تکنے لگے۔ مسز فاروقی اصرار کر کے ڈاکٹر کو چائے پلانے لے گئیں کیونکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر کو شعاع کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ چائے وغیرہ پی کر انہوں نے شعاع کو ایک انجکشن دیا
دن کے دس بجے تھے جب شعاع نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے مدتوں کا تھکا ہارا انسان سامنے آ کھڑا ہوا۔ شعاع نے دیکھا ڈاکٹر کے ہاتھ میں اس کی کلائی تھی اور مسز فاروقی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ بہت دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ڈاکٹر نے پوچھا بھی۔

بے بی طبیعت کیسی ہے؟

مگر وہ خاموش پڑی رہی۔ ڈاکٹر زیدی نے دوائیں لکھ کر نسخہ مسز فاروقی کو پکڑاتے ہوئے کہا
شام کو کسی وقت آؤں گا، امید ہے جلدی اچھی ہو جائے گی اور پھر وہ مسکراتے ہوئے جھکا اور شعاع کے سنہری بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

بے بی بہت بہادر ہے شام تک بالکل اچھی ہو جائے گی۔

مگر شعاع تو مسکرائی بھی نہیں۔ اداس اداس نظروں سے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور پردوں میں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی بتا رہی تھی کہ سورج کافی بلند ہو چکا ہے۔ اتنے میں مسز فاروقی ڈاکٹر زیدی کو رخصت کر کے آئیں اور شعاع سے پوچھنے لگیں

کچھ کھاؤ گی اس وقت، دودھ لاؤں۔

ان سادہ سے فقروں میں محبت کا سمندر تھا۔ شعاع نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے کیا ہوا تھا؟

اس پر مسز فاروقی نے اسے تفصیل سے گزرے ہوئے واقعات کی کہانی سنانی شروع کی
شعاع کو بے حد ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ سب لوگ کیا سوچتے ہوں گے، وہ شرمسار سی نگاہیں جھکائے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آہ تو میں اتنی کمزور ہو گئی ہوں کہ سہیل کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی، کیا یہی حوصلہ رہ گیا

ہے مجھ میں۔

مسز فاروقی نے کہا۔

بیٹی لیٹی رہو، ابھی تم ٹھیک کہاں ہو۔

شعاع نے کہا۔

نہیں خالہ جان میں ٹھیک ہوں، دراصل کل میرے سر میں بے حد درد تھا۔ سعدیہ سے وعدہ کر چکی تھی، اس لئے چلی گئی۔ مجھے پہلے سر میں درد اٹھا اور پھر ایک دم ہی چکر آیا اور مجھے معلوم بھی نہیں ہو سکا کہ کیا ہوا ـــــ نہ جانے لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔

مسز فاروقی سادہ دل تھیں فوراً اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ بولیں۔

سب لوگوں نے تمہارے بارے میں تو کیا سوچنا تھا مگر حیرت تو یہ ہوئی کہ سہیل اسی وقت اٹھ کر چلا گیا، انگوٹھی پہنائے بغیر اور گئی رات تک واپس نہ آیا تھا۔ اب ذرا ٹیلی فون کر کے معلوم کرواتی ہوں آیا بھی یا نہیں۔

وہ اٹھ کر چلی گئیں مگر شعاع کی حالت ایک بار پھر خراب ہونی شروع ہو گئی۔ ملازمہ اس کے لئے دودھ، کارن فلیک وغیرہ لے کر آئی اور ساتھ کی میز پر رکھ گئی۔ اس نے کیا کہا، شعاع نے نہ سنا۔ دودھ پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا اور وہ گم صم بیٹھی رہی۔ سہیل نے انگوٹھی نہیں پہنائی، وہ اٹھ کر چلا گیا، کیوں چلا گیا، کیا مجھے دیکھ کر چلا گیا۔ وہ سوچتی رہی۔

ٹھیک تو ہے، اسے بھلا کیا معلوم ہو گا کہ میں بھی لبنیٰ کو جانتی ہوں۔ دو ہفتے بھی نہیں گزرے کہ وہ اپنی ماں کو مجھ سے ملوانے کے لئے کہہ رہا تھا، میری ماں کا پتہ پوچھ رہا تھا اور اب کیسے ٹھاٹھ سے منگنی کی انگوٹھی پہنانے آ رہا تھا۔ اُف، یہ مردوں کی ذات، سب مرد ایک سے ہوتے ہیں میرے باپ کی طرح ـــــ ظالم ـــــ فریبی ـــــ دھوکے باز ـــــ بے وفا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسز فاروقی آئیں اور جلدی سے کہنے لگیں۔

بیٹی تم ناشتہ کر لو، مجھے سہیل کی ماں نے بلایا ہے، واپسی پر تمہاری دوائیں لاؤں گی، کچھ اور کھانے کو جی چاہے تو خانساماں سے کہہ دینا۔

شعاع نے ان کی کوئی بات نہ سُنی، بس ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھتی رہی بس ایسا محسوس ہوا جیسے کہہ رہی ہوں۔

سب مرد بے وفا ہوتے ہیں۔

سعدیہ نے ایک بار کہا تھا کہ فاروقی صاحب نے لندن میں شادی کر رکھی ہے۔ وہ بھی تو مرد ہے۔

سب مرد میرے باپ جیسے ہی ہوتے ہیں، لڑکیوں کو اپنی جھوٹی وفا کا یقین دلا کر شادی کر لیتے ہیں اور پھر بیویوں کو چھوڑ کر دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، دوسری لڑکیوں کو وفا کا یقین دلانا شروع کر دیتے ہیں۔ سہیل بھی تو مرد ہے، وہ تو اچھا ہوا میں نے اسے کوئی امید نہ دلائی تھی اُف، یہ دل اسے کیا ہو گیا تھا اس وقت، یہ کیوں ڈوبنے لگا تھا۔ کیا مجھے سہیل کی منگنی کا دکھ ہوا تھا یہ دماغ میں دھواں سا کیوں بھر رہا ہے، یہ سر کو کیا ہو رہا ہے۔ نہیں، نہیں، وہ جلدی سے لیٹ گئی، مجھے سہیل سے کیا واسطہ، مجھے تو مردوں سے نفرت ہے۔ سہیل نے اس نفرت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ وہ تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ غنودگی پھر اس کے حواس پر چھا گئی۔ خانساماں پوچھنے آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ ملازمہ آئی اور چپکے سے ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔

مسز فاروقی دوا لے کر آئیں تو بھی وہ سو رہی تھیں۔ وہ بے چاری بے حد پریشان تھیں سہیل گھر نہیں پہنچا تھا اور بیگم حق بے حد پریشان تھیں۔ جوان لڑکا ایسی بھری پُری محفل سے اُٹھا اور کہیں چلا گیا اور واپس نہیں آیا تھا، ایک ماں کیلئے اس سے بڑی تکلیف کی کیا بات ہو سکتی تھی۔ مسز فاروقی

کی پریشانی بھی بجا تھی، کیونکہ بیگم حق نے شعاع کے بارے میں اَن گنت سوال کر ڈالے تھے۔ انہوں نے بتا دیا کہ شعاع کئی دن سے بیمار تھی، اسے سر درد تھا، چکر آتے تھے، وہ تو سعدیہ کے اصرار پر چلی گئی تھی۔

مسز فاروقی نے ملازمہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شعاع نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ انہوں نے گھبرا کر ڈاکٹر زیدی کو فون کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

بچی جتنا بھی سوئے گی اچھا ہے، سونے دیں، کھانے پینے کی فکر نہ کریں، میں نے طاقت کا انجکشن دے دیا تھا۔ شام کو آ کر دوبارہ دیکھوں گا۔

شام ڈھل رہی تھی جب شعاع کی آنکھ کھلی۔ کمزوری بے حد تھی۔ مسز فاروقی نے اسے زبردستی دودھ کا بھرا ہوا گلاس پلایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ڈاکٹر بھی آ گیا۔ دوائیں وغیرہ دیکھ کر استعمال کا طریقہ بتایا۔ اس دوران شعاع بالکل خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے جاتے جاتے کہا۔

تین دن بعد مجھے اطلاع کیجئے گا اور مجھے یقین ہے تب تک یہ ٹھیک ہو جائے گی۔

شعاع بس ایک ٹک کھڑکی کے باہر دیکھتی رہتی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خاموش رہنے لگی تھی۔ اس کی حالت کی وجہ سے آبگینہ اور نگینہ کو مسز فاروقی نے اس کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ جب بھی اس کی طبیعت کے بارے میں معلوم کیا جاتا وہ کہہ دیتی۔

ٹھیک ہے۔

مگر اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اور جب وہ اُٹھ کر کھڑی ہوتی تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔

ڈاکٹر زیدی نے اسے اپنے ہسپتال میں بلوا لیا۔ مسز فاروقی نے اسے آبگینہ کے ساتھ کار میں بھیج دیا۔ ہسپتال دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ تو سمجھی تھی عام سا کلینک ہو گا مگر وہ تو بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا ہسپتال تھا۔ کاریڈور میں سے گزرتے ہوئے اس نے بستروں پر پڑے مریضوں کو دیکھا میں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو کسی کی کراہ گاہے گاہے تھی۔ ڈاکٹر اپریشن تھیٹر میں تھا۔ اس لئے وہ دونوں اس کے کمرے میں بیٹھی رہیں۔ آگینہ رہی اور شعاع سوچوں کی دنیا میں رہی۔ ڈاکٹر کافی دیر کے بعد آیا اور مسکراتا ہوا بولا۔

ہیلو بے بی کیسی ہو؟

اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور پھر آبگینہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شعاع نے کہا

اچھی ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا

بالکل اچھی ہو جاؤ تب بات ہے۔

پھر ڈاکٹر اسے مختلف جگہ لے گیا، خون ٹیسٹ، ایکسرے وغیرہ۔ پھر وہ انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔ چائے پلائی۔ شعاع نے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب، آپ کے ہاں کتنی نرسیں ہیں کیونکہ اتنے بڑے ہسپتال میں اسے کوئی نرس نظر نہ آئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔

میرے پاس تین نرسیں ہیں مگر وہ زیادہ تر پرائیویٹ کمروں میں ہوتی ہیں جب ضرورت ہو تو یہاں بلائی جاتی ہیں۔

شعاع نے کہا

حالانکہ یہاں زیادہ ضرورت ہے

ہاں ہے تو، خیال ہے دو نرسیں اور رکھوں، مگر سب عورتیں وارڈ کی نسبت پرائیویٹ کمروں میں کام کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں اور میرے ہاں بھی پرائیویٹ کمرے زیادہ ہیں۔ جنرل وارڈ تو صرف دو ہی ہیں۔

شعاع سوچ میں ڈوب گئی پھر آہستہ سے بولی۔

میں اگر آپ کے ہسپتال میں کام کرنا چاہوں تو۔

ڈاکٹر اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر ہنس پڑا۔

ابھی تو تم خود مریضہ ہو۔

ڈاکٹر نے شعاع کی اتنی پرخلوص پیشکش ہنسی میں اڑا دی تھی، وہ بہت افسردہ سی ہو گئی تھی۔ کار میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچ رہی تھی۔

جنگ کے دنوں میں فرسٹ ایڈ کا کورس پاس کیا تھا، انجکشن لگانا جانتی ہوں، پٹی باندھنا مجھے آتا ہے۔ مگر ڈاکٹر سمجھا یونہی کہہ رہی ہے۔

اس نے نگاہیں پیچھے بھاگتے درختوں اور مکانوں پر جما دیں اور جانے کون سے عقدے وا کرتی رہی۔

حق صاحب اور بیگم حق برآمدے میں بیٹھے تھے جب سہیل آیا۔ حق صاحب بے حد غصے میں تھے جب کہ بیگم حق پریشان زیادہ تھیں۔ سہیل انہیں دیکھ کر ذرا ٹھٹکا ضرور مگر اندر جانے کے ارادے سے آگے بڑھا ہی تھا کہ حق صاحب نے کہا۔

یہاں آؤ۔

جی!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہاں گئے تھے؟

کہیں نہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہاں گئے تھے؟

جی یہیں تھا۔

یہاں کہاں ———؟

یہاں ——— یہاں

اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

مسٹر حق بولے۔

ماں باپ کی عزت اڑانی تھی سو اڑا لی۔ نعمان صاحب کے سامنے شرمندہ کروانا تھا کروا لیا۔

سہیل خاموش رہا

یہ چپ کیوں سادھ لی ہے، کچھ بولو، منہ سے پھوٹو۔

بیگم حق نے مداخلت کی۔

اب اسے بیٹھنے بھی دو گے یا سوال ہی پوچھتے رہو گے۔

بیگم تم نے اسے بگاڑا ہے۔

چلو میں نے ہی سہی، مگر اب یہ دو دن کے بعد گھر آیا ہے تو اسے آرام کرنے دو، بعد میں پوچھ لینا۔

میں یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ دو دن کے بعد کیوں آیا ہے؟

بیگم نے حیرت سے کہا۔

آپ کا مطلب ہے یہ گھر کیوں آیا ہے۔

حق صاحب بولے۔

کبھی کوئی سیدھی بات بھی سمجھ لیا کرو۔

اور کیا ——— میں تو الٹی ہوں۔

اب میں اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا ہوں۔

جو کسر رہ گئی ہو ——— وہ بھی کہہ لیں۔

اس وقت میں تم سے نہیں، اس صاحبزادے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

آپ تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔

اور وہ بے عزتی۔

بے عزتی ان کی ہوئی ہو گی ہم کوئی لڑکی والے تھوڑی ہیں اللہ رکھے میرے بیٹے کے لئے لڑکیوں کی کمی ہے۔

حق صاحب بگڑ گئے۔

بیگم میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا، نعمان کی عزت میری عزت ہے تم اسے میری آنکھوں کے سامنے سے لے جاؤ اور پوچھو کہ یہ حرکت اس نے کیوں کی ہے، ورنہ

ہاں ہاں لے جاتی ہوں۔

اور بیگم حق سہیل کو لئے ہوئے اندر چلی گئیں۔

سہیل کے پیچھے پیچھے اس کی ماں بھی کمرے میں گئی۔

میرے بیٹے، میرے لال، تو کہاں چلا گیا تھا؟

سہیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے، وہ تو خود نہیں جانتا تھا کہ ان پچھلے دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنوں میں کہاں رہا ـــــ ہاں آخری بات جو اسے یاد تھی ـــــ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسکراتے گلابی چہرے کو زرد ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں نے شعاع کو بے ہوش ہوتا دیکھا تھا۔

وہ خیالات کی دنیا میں پہنچ گیا۔

میں خود کو معاف نہیں کر سکتا۔ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک معصوم لڑکی کے جذبات کو کچلا ہے۔ میں نے اس کا دل دکھایا ہے ـــــ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس سے اس کو مانگا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اپنی امی کو تمہاری امی کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔

مگر ـــــ

مگر اس نے بھی تو مجھے کوئی آس نہیں دلائی۔ اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے لگاوٹ، پیار، محبت کی بو آئے۔ وہ تو ہمیشہ مجھ سے بے رخی اور سختی سے پیش آئی۔ اس نے تو ہمیشہ یہی کہا، وہ مجھ سے نہیں مل سکتی۔

تو پھر یہ کیا ہے؟

یہ کیا معمہ ہے؟

وہ بے ہوش کیوں ہوئی تھی؟

اسے ضرور میرا خیال ہے، ضرور اس کے دل میں میرے لئے جگہ ہے اور وہ مجھے کسی اور کا ہوتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکی۔

ماں نے دوبارہ اپنے لہجے میں پوری ممتا بھر کر کہا۔

سہیل بیٹے، تم کہاں چلے گئے تھے؟

سہیل نے کچھ سنا، کچھ نہ سنا، ماں کے ہلتے ہوئے ہونٹ ضرور نظر آئے لیکن ماں نے کیا کہا؟

اور ـــــ

پھر اس نے سوچوں کے تانے بانے کو وہیں سے جوڑنا شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں اسے ڈھونڈوں گا، تلاش کروں گا، اور اس سے کہہ دوں گا کہ سہیل کو بے وفا نہ سمجھے سہیل بے وفا نہیں ہے، باوجودیکہ تم نے کبھی کوئی آس نہ دلائی، باوجودیکہ تم ہمیشہ سختی سے پیش آئیں، تم نے کبھی غلط نہ دی۔ مگر اس کے باوجود سہیل کے دل میں جو جگہ بن چکی ہے، وہ ختم نہیں ہو سکتی۔

شاید اسی لئے منگنی رک گئی۔

شاید کوئی جذبے کام آ گئے۔

شاید ـــــ

ماں نے پھر پوچھا۔

بیٹے، تم کہاں چلے گئے تھے؟

سہیل نے کہا۔

معلوم نہیں امی، بس ایک دم شور اٹھا تو میں گھبرا کر باہر نکل گیا اور پھر مجھے کچھ نہ یاد رہا۔

بیگم حق کا دل دھک سے رہ گیا۔

مگر تو دو دن رات رہا کہاں؟

سہیل نے کہا۔

معلوم نہیں امی، کہاں کہاں گھومتا رہا، مجھے تو کچھ یاد نہیں، بس ایسا لگتا تھا کہ دماغ پھٹ جائے گا۔

ماں نے کہا ـــــ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سب اسی لڑکی کی وجہ سے ہوا، پتہ نہیں کہاں سے رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئی ــــ کمینی

سہیل تڑپ کر بولا۔

ماں اسے کچھ نہ کہو۔

اماں نے حیرانی سے پوچھا

کسے ــــ؟

اس لڑکی کو

آخر کیوں نہ کہوں، اسی کی وجہ سے تو تمہاری منگنی رُک گئی۔

نہیں امی، اسے کچھ نہ کہو، اسے کچھ نہ کہو۔

ماں نے تشویشناک نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

اچھا، تو یہ بات ہے ــــ یہ تو کچھ لمبی بھگت معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال ماں نے موضوع بدل دیا اور سہیل سے کہا۔

اچھا بیٹا، نہا کر چائے پی لو، تمہارے پاپا کا موڈ بہت خراب ہے۔

سہیل سیدھا غسل خانے میں چلا گیا۔ نہانے سے پہلے جو شیشے پر نظر پڑی تو اپنی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر خود کو بھی پہچان نہ سکا۔ اس نے شیو کی، نہایا، کپڑے بدلے اور چائے پی کر باہر جانے لگا

ماں نے پوچھا۔

کہاں جا رہے ہو؟

کہیں نہیں؟

پھر بھی؟

امی میں نے کہا نا کہ کہیں نہیں جا رہا ــــ میں ابھی آ جاؤں گا۔

سہیل گھر سے نکلا تو تھا شاع کے پاس ہوسٹل جانے کے لئے۔ لیکن راستے میں اس نے فیصلہ بدل دیا۔ اس نے کار اپنی خالہ مسز فاروقی کے گھر کی طرف موڑ دی۔

میں کیوں نہ اسے خالہ کے ہاں دیکھتا جاؤں۔ ممکن ہے وہ نگینہ اور آبگینہ کو پڑھانے آئی ہو۔ یا نگینہ اور آبگینہ سے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔

اور ــــ

اگلے لمحے اس کی کار خالہ مسز فاروقی کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل کی کار مسز فاروقی کے گھر کے برآمدے میں رکی، تو نگینہ نے شور مچایا۔

بھائی جان آگئے، بھائی جان آگئے۔

اور مسز فاروقی نے سہیل کو صوفے پر بیٹھنے بھی نہ دیا تھا کہ سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

کہاں گئے تھے؟ کہاں رہے؟ اب کہاں سے آرہے تھے۔ اس دن کیا تماشا کیا تھا؟

سہیل نے کہا۔

خالہ جان آرام سے بیٹھ تو لینے دیجئے

مسز فاروقی نے کہا۔

اور میری بہن کو کچھ ہو جاتا تو —— ان کی حالت دیکھی ہے۔

خالہ جان! میں امی کے پاس سے ہی آرہا ہوں۔

اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لے لیا ہو گا۔ میں اس کی طرح سیدھی سادی ہوں نہیں میں نے یہ بال دھوپ میں چٹے نہیں کئے۔

سہیل نے کہا۔

خالہ جان، آپ کے بال چٹے کہاں ہیں۔

زیادہ باتیں نہ بناؤ، سیدھی طرح سب کچھ کہہ دو، اگر وہ لڑکی پسند نہیں تھی تو پہلے ہی کہہ دیتے، اپنی امی سے نہیں کہہ سکتے تھے تو مجھ سے تو کہہ سکتے تھے، نگینہ اور آبگینہ کو بتا دیتے خالہ سے کہہ سکتے تھے۔

شعاع ——

شعاع ——

شعاع ——

سہیل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

شعاع سے کہہ سکتا تھا شعاع سے کیا کہہ سکتا تھا۔ شعاع سے کس طرح کہہ سکتا تھا

اسی نے تو درد دیا تھا۔

وہی تو میرا مسیحا ہے۔

مگر بہت جلد سہیل نے خود پر قابو پا لیا۔

خالہ جان، ویسے بھی کوئی بات نہ تھی اور بات نہ بھی ہوتی تو میں غیروں سے کیسے کہہ سکتا تھا۔

خالہ نے کہا۔

شعاع غیر تھی تو میں تو غیر نہ تھی۔ آبگینہ اور نگینہ تو غیر نہ تھیں۔ اور شعاع بھی کیوں غیر ہونے لگی میں تو اسے بیٹی بنا کر اپنے گھر لے آئی ہوں۔

سہیل نے حیرت سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ اسے یہاں لے آئی ہیں؟

ہاں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

یعنی وہ آپ کے گھر میں ہے؟

ہاں ہاں ہے۔

اور وہ آپ کی بیٹی ہے؟

ہاں بیٹی ہے۔ اب وہ اسی گھر میں رہے گی۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

اعتراض —— وہ کھسیانا سا ہو گیا —— جی نہیں اعتراض تو کوئی نہیں

اب تم یہ بتاؤ کہ تم عین منگنی کے وقت کیوں بھاگ گئے تھے۔

دراصل خالہ جان میں اس لڑکی کو بے ہوش دیکھ کر گھبرا سا گیا، مجھے چکر آ گیا، دل گھبرانے لگا اور میں جلدی سے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔

ہوں، تو تم اتنے گھبرا گئے تھے کہ دو تین دن تک تمہیں گھر کا راستہ ہی یاد نہ رہا۔ ارے کیا پاگل سمجھتے ہو مجھے؟

سہیل سٹپٹا گیا۔ آیا تھا کس کام سے اور پھنس گیا کہاں۔

مسز فاروقی نے ناراضگی کے لہجے میں پوچھا

چائے پیو گے؟

پھر اس کا جواب سنے بغیر آواز دی۔

رمضو —— رمضو۔ نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے؟

اور وہ دوپٹہ شانوں پر سنبھالتی ہوئی باورچی خانے کی طرف نکل گئیں۔

سہیل نے نگینہ کی طرف دیکھا جو انگلی منہ میں ڈالے سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سہیل نے مسکرا کر اسے پاس بلایا۔

مسز فاروقی کی دونوں بچیوں کو سہیل سے بے حد محبت تھی۔ کچھ اس لئے بھی کہ ان کا اپنا کوئی بھائی نہ تھا اور کچھ اس لئے کہ دونوں بہنیں یعنی مسز فاروقی اور مسز حق کافی عرصہ ایک ہی جگہ رہی تھیں، وہ تو حق صاحب نے بڑی کوٹھی بنوالی تو انہیں جانا پڑا، ورنہ مسز حق کو بھی آبگینہ اور نگینہ سے بہت پیار تھا۔

سہیل نے نگینہ کو بلایا تو وہ بالکل پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ سہیل نے اس کے سیاہ بالوں کو ماتھے پر سے سمیٹا اور پوچھا۔

"نگو، تیری باجی کہاں ہیں؟"

نگینہ نے انگلی منہ سے نکال لی اور آہستہ سے بولی۔

ہسپتال گئی ہیں۔

ہسپتال گئی ہیں، کیوں؟

وہ حیران سا رہ گیا۔ نگینہ ابھی خاموش ہی تھی کہ مسز فاروقی آ گئیں۔ رمضو بھی چائے لے آیا۔ سب چائے پینے لگے۔ مسز فاروقی نے دروازے کی جالی میں سے باہر نگاہ دوڑائی اور بولیں۔

اتنی دیر ہو گئی اور لڑکیاں ابھی آئی نہیں؟

سہیل نے پیالی لبوں سے ہٹا کر پوچھا

کہاں گئی ہے آبگینہ؟ نگینہ کہہ رہی ہے ہسپتال گئی ہے۔

مسز فاروقی نے بسکٹوں کی پلیٹ اس کے آگے کھسکا کر کہا۔

شجاع کے سر میں درد تھا۔ وہ منگنی میں جانا نہیں چاہ رہی تھی، مگر سعدیہ کے اصرار پر چلی گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اس کا سر چکرایا اور وہ گر پڑی۔ بے چاری پریشان لڑکی ہے۔ میں تو پہلے یہاں بہت مانی تھی، اب تو میں نے اسے بیٹی ہی بنا لیا ہے اور مستقل طور پر اسی گھر میں رکھ لیا ہے۔

پھر سہیل کو حیران بیٹھا دیکھ کر بولیں۔

"یہ ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے اب پی ڈالو اسے۔"

سہیل نے جھٹ پٹ ٹھنڈی چائے حلق میں انڈیل لی۔ وہ جس ہیرے کی سن گن لینے آیا تھا وہ تو وہیں موجود تھا۔ اسے مسز فاروقی کے بات کرتے کرتے رکنے سے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ کچھ پوچھنا مناسب نہ تھا، پہلو بدل کر ہی رہ گیا۔ مسز فاروقی نے بیان شروع کیا کہ ڈاکٹر زیدی نے ہسپتال بلوایا تھا۔ میں نے آبگینہ کے ساتھ بھیج دیا۔ کافی دیر ہو گئی گئے ہوئے اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اسے زندگی میں کوئی صدمہ پہنچا ہوگا جس کی وجہ سے یہ سر کا درد ہے ملنے ٹمیں کیا بتاؤں اس عمر میں اس نے کتنی سختی کا زمانہ دیکھا ہے، بھلا صدمے بھی انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے۔ پھر بھی بڑی جی دار لڑکی ہے۔ تم نے تو شائد غور نہ کیا ہوگا ــــ ایسا گلابی رنگ تھا مگر اب تو زرد ہو گئی ہے۔ سچ میرا کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں اسے بہو بنا لیتی۔ لے لو وہ آگئیں۔

واقعی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور فوراً بعد ہی آگے پیچھے آبگینہ اور شعاع داخل ہوئیں۔ آبگینہ نے سہیل کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ اور آ کر گلے میں جھول گئی۔ مسز فاروقی نے اسے ڈانٹ کر ہٹایا۔ مگر سہیل کو کسی چیز کی خبر نہ تھی، وہ تو کھڑا ایک ٹک اس زرد مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔

شعاع خاموش کھڑی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ سہیل کو اس طرح اچانک اپنے سامنے پائے گی۔ مسز فاروقی جہاندیدہ عورت تھیں بہت کچھ بھانپ گئیں مگر خاموشی میں مصلحت تھی کچھ ظاہر نہ کیا اور آبگینہ سے بولیں۔

بہت دیر لگ گئی بیٹی ؟

ہاں امی باجی کا خون ٹیسٹ، ایکسرے اور نجانے کیا کیا ہوا ہے۔ بس دیر ہو گئی۔

آبگینہ نے بسکٹ کھاتے ہوئے کہا۔

مسز فاروقی نے جب شعاع کو ویسے کا ویسا کھڑا دیکھا تو اُٹھ کر گئیں اور ساتھ لا کر بٹھا لیا۔ یہ سہارا غنیمت تھا، کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پھر بے ہوش ہونے کو ہے، بالکل نڈھال ہو رہی تھی مگر خود کو بے حد سنبھال رکھا تھا۔ سہیل بھی بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ نگاہیں جھکائے اپنے چمکیلے بوٹوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ مسز فاروقی نے پھر ممنو کو آواز دی اور اٹھ کر چلی گئیں کیں دوسرے کمرے سے انھوں نے آبگینہ کو پکارا۔ وہ بھی چلی گئی۔ اب کمرے میں تیسرا فرد نگینہ تھی اور وہ معصوم بے خبر بچی تھی۔ سہیل نے بڑی مشکل سے کہا۔

اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ؟

اچھی ہے ؟

آواز میں وہی روکھا پن تھا۔ اس نے بڑی جرأت کے ساتھ کہا۔

آپ مجھے جھوٹا سمجھتی ہوں گی۔ دراصل . . . دراصل یک دم ہی میرے والدین نے یہ فیصلہ کر لیا، میرا مطلب ہے ان کی بہت عرصے سے یہ تمنا تھی، بس انہوں نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں

اور ـــ اور ـــ میں

سہیل کہتے کہتے رک گیا۔ شعاع کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا زرد چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ بھی غیر ارادی طور پر کھڑا ہو گیا اور اضطراب کے عالم میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

آپ نے اس بات کا اتنا اثر لیا ہے۔ سوائے معذرت کے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

شعاع جو اندرونی کمروں کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔ رک کر بولی۔

آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے، مجھے یہ تکلیف نئی نہیں ہے، پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور رہے آپ تو آپ کا کیا خیال ہے میں نے آپ کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں مان لوں؟ واہ کیا خوش فہمی ہے۔

سہیل دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چلی بھی گئی۔ اس کی نفرت انگیز اور نہ میل کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ کیسی لڑکی ہے جو کسی بات کو مان کر ہی نہیں دیتی۔ یہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ میرا دل کہتا ہے ڈاکٹر کہتا ہے اس کو صدمہ پہنچا ہے مگر یہ درد و کرب کو چھپا کر صاف انکار کر رہی ہے یہ مان کیوں نہیں لیتی کہ اس کے دل پر چوٹ پڑی ہے۔

مسز فاروقی جب رمضو کے ساتھ تازہ گرم چائے بنوا کر آئیں تو کمرہ خالی پڑا تھا سہیل اور شجاع دونوں میں سے کوئی نہ تھا۔ بس نگینہ صوفے پر لیٹی چھت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

لرزتے کانپتے قدموں کو بڑی مشکل سے سنبھالتی ہوئی شجاع اپنے کمرے میں پہنچی تو سارا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیٹ کیا گئی لیٹنے پر مجبور ہو گئی۔ سارا بدن کانپ رہا تھا، لاکھ روکتی رہی مگر آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ خود اپنے ارادوں اور دل کے آگے مات کھا گئی تو ممکن تھا کسی اور کے سامنے بھی مات کھا جائے۔ یہ اسے منظور نہ تھا۔ اپنی جان دے کر بھی نہیں منظور تھا کہ کوئی اس کے اندر چھپی دکھی روح کو بھولے سے بھی دیکھ لے۔ قوت ارادی پھر عود کر آئی اور اس کے آنسو تھم گئے۔ مسز فاروقی جب کمرے میں دبے پاؤں آئیں تو شجاع بالکل نارمل تھی۔ اس نے اپنی کسی حرکت سے مسز فاروقی پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اس کا کوئی واسطہ سہیل سے بھی ہے۔ مسز فاروقی نے اسے چائے بنا کر دی اور وہ دونوں اس دوران ادھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہیں۔

افتخار نے ناشتے کی میز پر کہا۔

سنا ہو نعیم آ رہا ہے۔

میمونہ بیگم نے جلدی سے ان کی طرف کان لگا دیئے اور اسی افراتفری میں اپنی چائے میں چینی زیادہ ڈال لی بچے اسکول جا چکے تھے۔ غزالہ سب سے چھوٹے بچے کو انڈا کھلا رہی تھی۔ اسی مصروفیت میں پوچھنے لگی۔

کون نعیم؟

میرا بھانجہ ہے۔

میمونہ بیگم نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

وہ کیوں آ رہا ہے؟

افتخار نے بڑے طنز سے کہا۔

اسے یہاں آنے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت تو نہیں والدہ محترمہ؟

میمونہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

افتخار انتہائی منہ پھٹ اور ذرا بدتمیز سا آدمی تھا۔ شروع شروع میں تو میمونہ بیگم نے اس پر ذرا رعب ڈالنے کی کوشش کی، مگر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے گھر پر آپ کا رعب نہیں چل سکتا۔

میمونہ بیگم بہت چیخی چلائی اور رعب جمانے کی کوشش کی۔ یہ تک کہا کہ مکان کے کاغذات میرے پاس ہیں، میں سب کو نکال باہر کروں گی۔

اس پر افتخار نے اپنا بڑا سا ہاتھ دکھا کر کہا کہ جب وہ چاہے میمونہ بیگم کا گلا دبا کر کاغذات قابو میں کر سکتا ہے۔

میمونہ بیگم ڈر گئی۔ دھیرے دھیرے افتخار نے کہا، بڑھیا اس گھر میں رہنا ہے تو کھانا پکایا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرو، کام کیا کرو۔

اب تو بیشتر کام میمونہ بیگم کو کرنے پڑتے تھے۔ افتخار کی طنزیہ باتوں پر بھی غزالہ نے کبھی ماں کی حمایت نہ کی تھی۔ کیونکہ جب کبھی غزالہ بیگم نے کوئی بات کی تو افتخار گندی اور طنزیہ زبان پر اتر آیا۔ اگر تم اچھی ہوتیں تو طلاق ہی کیوں ہوتی۔ میں تو ایسے ہی رکھوں گا، ورنہ تم کسی تیسرے کی تلاش کر لو۔

وہ اسکول میں پڑھانے جاتی اور میمونہ بیگم گھر سنبھالتی۔ غزالہ پہلے تو رکشا ٹیکسی میں اسکول جاتی تھی۔ مگر افتخار نے ساری فضول خرچیاں بند کرا دیں۔ اب وہ بس میں جاتی تھی۔ میمونہ بیگم کچھ کہتیں تو افتخار کی زبان اسے خاموش کرا دیتی۔ اب وہ افتخار سے کچھ کچھ ڈرنے لگی تھی، مگر پرانی عادت سے مجبور تھی۔ ہر بات میں ٹانگ اڑاتی اور پھر منہ کی کھاتی۔

نیم کے آنے کا مطلب تھا کہ گھر کا کام اور بڑھ جائیں۔ یوں بھی افتخار نے بچوں کو کافی سر چڑھا رکھا تھا۔ لے دے کے غزالہ کی ہمدردی ہی ہو سکتی تھی مگر وہ بھی افتخار سے دبتی تھی۔ افتخار کا طنزیہ جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ مگر باتیں سننے کے چسکے سے مجبور ہو کر سر جھکائے چائے پینے لگی۔ مگر کان ادھر ہی کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

افتخار نے ہنس کر کہا۔

اور تم جو اس دن اپنی صاحبزادی کو لینے گئی تھیں اس کا کیا ہوا؟

غزالہ نے اس بات کا بھی کوئی خاص اثر نہ لیا۔ بولی۔

گئی تو تھی، مگر اسے لانے کا کیا فائدہ، الٹا خرچ بڑھے گا ہی، اور پھر میں اسے لانا بھی نہیں چاہتی، اس کا مزاج بہت خراب ہے، باتیں ایسی کیا کرتی ہے نشتر چبھوتی ہے۔

اگر میں اس کے آنے کا فائدہ بتا دوں تو؟

افتخار نے چور نظروں سے میمونہ بیگم کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھی تھی۔ غزالہ بھی حیران ہوئی، بولی۔

معموں میں کیوں باتیں کرتے ہیں؟

میرا مطلب ہے کہ نعیم سے شعاع کی شادی کر دی جائے۔

واہ ——— وہ کیوں؟

وہ اس لئے کہ نعیم میرا بھانجہ ہے اور اس کی کافی جائیداد ہے۔

غزالہ بالکل نہ سمجھی بولی۔

تو ———

افتخار ہنس پڑا اور بولا۔

میمونہ بیگم کی بیٹی ہو کر بھی نہ سمجھ سکی۔

میمونہ بیگم نے اس وار کو بھی تحمل سے سہہ لیا۔ غصہ ظاہر کرتی تو اٹھ کر جانا پڑتا۔ اور جانے کا مطلب تھا کہ گفتگو سے لاعلم رہتی۔ اس لئے جلدی سے چائے بنانے لگی تاکہ ظاہر ہو کہ کچھ سنا ہی نہیں۔

غزالہ نے کہا۔

بات سمجھ میں آئی نہیں۔

ماں کی اتنی بے عزتی پر خاموشی۔ میمونہ بیگم کا خون ہی کھول گیا۔

افتخار نے کہا۔

بھئی جس طرح تمہاری ماں نے تمہارے مکان پر قبضہ جما رکھا ہے، اسی طرح تم کرنا۔ شعاع کی نعیم سے شادی ہو جائے۔ نعیم کے پاس دولت کی کمی نہیں۔ تم سلیقے سے اسے ہاتھوں میں لے لینا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو پچپن پچاس ہزار تو کہیں نہیں گئے۔

غزالہ نے کہا۔

آپ اسے نیلام پر چڑھا رہے ہیں۔

افتخار نے کھڑے ہو کر زوردار انگڑائی لی اور کف کے بٹن بند کرتے بولا۔

اب تم جلدی سے اپنی صاحبزادی کو لے آؤ، وہ بھی تو عیش کرے گی۔

غزالہ نے کہا۔

یہ نہیں ہو سکتا۔

کیوں ؟

لوگ کہیں گے بیٹی کو بیچ دیا۔

میمونہ بیگم نے دخل دیا۔

اے ہے، لوگ کہنے والے کون ہوتے ہیں، افتخار کوئی اس کا دشمن تھوڑی ہے۔ اسی کے بھلے کی کہہ رہا ہے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ میمونہ بیگم نے کوئی بات کہی اور افتخار نے اعتراض نہ کیا۔

غزالہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

کچھ سوچنے تو دیں، اسے لانا آسان تو نہیں۔

ارے سوچنا کیسا ؟

وہ چلا گیا۔

غزالہ بھی کمرے میں سے چلی گئی۔

[illegible]ر کا نواسہ سامنے زردی سے تھڑے ہوئے منہ کے ساتھ بیٹھا رہ گیا۔

میمونہ بیگم کو سخت غصہ تھا۔ غزالہ سامنے ہوتی تو تھوڑا سا اس پر اتارتی۔ گو اب وہ غزالہ سے بھی ڈرنے لگی تھی۔ کچھ نہ سوجھا تو اس نے ننھے میاں کو کرسی پر سے بے دردی سے گھسیٹا تاکہ منہ دھلا دے۔ ننھا بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اس نے انڈے کی بساند مارتے ناخنوں سے اس کے کھچڑی بال نوچ لئے اور اسی پر بس نہ کرتے ہوئے زور زور سے چلّانے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افتخار نے بات کہی اور غزالہ مصروفیت میں بھول گئی۔ لیکن ایک دن جب وہ اسکول سے تھکی ماندی گھر لوٹی تو نعیم کو موجود پایا۔ دراز قد خوش شکل لڑکا تھا۔ غزالہ کو ایک ہی نظر میں پسند آگیا۔ نعیم نے بھی بہت ادب سے سلام کیا۔

نعیم کو آئے ہوئے تین چار دن ہو گئے تھے کہ غزالہ سے افتخار نے پھر شجاع کے متعلق بات کی۔ بھولی بسری محبت غزالہ کے دل میں بھی ابھری۔ اس نے سوچا، پڑھا لکھا خوبصورت لڑکا ہے صاحب جائیداد ہے، شجاع کی شادی اس سے کر دی جائے تو اچھا ہی ہے۔ کون سا اس کا باپ بیٹھا ہے جو اسے بیاہنے کی فکر کرتا۔ دل ہی دل میں افتخار کی بھی احسان مند ہوئی کہ شجاع کی عادتوں کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنے بھانجے کے لئے اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ جائیداد کا سن کر تو میمونہ بیگم کی بھی رال ٹپک رہی تھی۔ آخر کو زندگی ان لوگوں کے ساتھ ہی گزارنی تھی۔ اگر ان کی اچھی طرح گزر ہوتی تو ظاہر ہے

میمونہ بیگم کی ان سے بھی بھلی گزر ہوتی۔ ایک طرف افتخار دوسری طرف میمونہ بیگم۔ جب کئی بار شجاع کا ذکر ہوا تو غزالہ ایک بار پھر شجاع سے ملنے کے لئے تیار ہو گئی۔ خاص طور پر اسکول سے چھٹی لی اور بن سنور کر ہوسٹل میں جا دھمکی۔

وارڈن سے پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ سامنے برآمدے میں ناجیہ چلی آ رہی تھی۔ اس نے غزالہ کو ایک بار ہی دیکھا تھا۔ پہچان نہ سکی۔ مگر غزالہ نے اسے پہچان لیا۔

سنیے

ناجیہ کھڑی ہو گئی۔ غزالہ نے پلو درست کیا اور کہا۔

وہ شجاع کہاں ہے؟

جی معلوم نہیں۔

ناجیہ نے روکھا سا جواب دیا، اس کو یونیورسٹی سے دیر ہو رہی تھی، مگر غزالہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں شجاع کی ماں ہوں۔

اوہ، معاف کیجئے گا، وہ تو ہوسٹل سے چلی گئی۔

غزالہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا، صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

چلی گئی؟ کہاں؟

خود ناجیہ بھی حیران تھی۔ غزالہ اور شجاع کی شباہت دیکھ کر وہ یہ تو مان گئی کہ اس عورت سے شجاع کا کوئی رشتہ ہے لیکن ماں کو یہ خبر نہ ہو کہ بیٹی ہوسٹل سے کہاں گئی۔ حیرت کی بات تھی۔ ناجیہ نے کہا۔

وہ تو یونیورسٹی بھی نہیں آتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ بتا سکتی ہیں کہ کہاں گئی ہے اب؟

جی جی مجھے تو معلوم نہیں، البتہ یونیورسٹی میں اس کی سہیلیوں سے معلوم کر سکتی ہیں آپ، معاف کیجئے گا مجھے دیر ہو رہی ہے۔

ناجیہ نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر معذرت کی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ غزالہ اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔ دونوں ایک ہی بس میں سوار ہوئیں۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا مگر جب ناجیہ بھاگ کر کلاس روم کی طرف جا رہی تھی تو اس نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ سامنے والی لڑکی شعاع کی سہیلی ہے۔

سعدیہ حسب عادت کتابیں پھیلائے گھاس کے تختے پر نوٹ [illegible] رہی تھی۔ اور اس کے پاس ایک بے حد خوبصورت قد و قامت کی سیاہ بالوں والی لڑکی کھڑی تھی۔ اور دونوں باتوں میں مصروف تھیں۔ غزالہ کے قریب جاتے جاتے وہ لڑکی چلی گئی۔ اس کی شکل و شباہت میں ایک جانی پہچانی سی بات تھی۔ ہو سکتا ہے غزالہ اس کا قریب سے جائزہ لیتی مگر وہ جا چکی تھی۔ سعدیہ نے اپنے بالکل پاس کھڑی نیلی ساڑھی والی عورت کو دیکھا اور بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ غزالہ نے کہا۔

میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟

تشریف رکھئے۔

سعدیہ نے مارے تکلف کے کتابیں سمیٹ لیں اور پھر اسی بے نیازی سے اپنے شغل میں مصروف ہو گئی۔

آپ شعاع کو جانتی ہیں؟

سعدیہ نے تعجب سے سوال کرنے والی کو دیکھا، شعاع سے کس قدر مل رہی تھی وہ، مگر

پوچھنا واجب تھا۔

آپ کون ہیں؟

میں اس کی ماں ہوں۔

غزالہ نے انتہائی اطمینان سے کہا۔

وہ ہوسٹل سے بھی چلی گئی۔ عجیب خودسر لڑکی ہے، چلو مجھ سے خفا تھی ہوسٹل میں آگئی مگر اب ہوسٹل چھوڑا تھا تو میرے پاس ہی چلی آتی۔

سعدیہ نے بڑے غور سے غزالہ کی طرف دیکھا، اس کی نفیس ساڑھی پر نگاہ ڈالی تو اسے شعاع کی کئی پھٹی ساڑھیوں کا خیال آگیا۔ اس کا جی چاہا وہ شعاع کی ماں سے صرف اتنا پوچھ لے کر۔

اے بنارسی ساڑھی پہننے والی خاتون!

اے عورت!!

جو تو خود کو شعاع کی ماں کہتی ہے، کبھی اپنی ساڑھی اور شعاع کی ساڑھی کا موازنہ بھی کیا؟ کیا تو نے یہ بھی دیکھا کہ جوان لڑکیوں کی مائیں کس قسم کے کپڑے پہنتی ہیں؟ کیا کبھی تو نے یہ بھی سوچا کہ جوان بیٹیوں کو ماں کے پیار کی کتنی ضرورت ہوتی ہے؟ اور تو نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس لڑکی نے اس ہوسٹل سے پہلے کہاں کہاں دھکے کھائے ہیں۔ اس پر کیا کیا گزری ہے؟

اور اس بڑھاپے میں جوانی کا روپ بنانے والی عورت!

جا چلی جا تو اس لڑکی کی ماں نہیں ہو سکتی۔ میرے تصور میں، میرے ذہن میں میرے خیالات میں جو ماں کا روپ ہے، ماں کی شکل ہے ماں کا تصور ہے تو اس پر پوری نہیں اترتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو شجاع کی ماں نہیں ہو سکتی۔ تو کسی بھی جوان لڑکی کی ماں نہیں ہو سکتی۔

مگر وہ تیز دار لڑکی تھی۔ کسی کے گھریلو معاملات میں دخل دینا اچھی بات نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ شجاع کے بارے میں کسی بھی بات سے انکار کر دے۔ لبنیٰ بھی جا چکی تھی ورنہ اسی سے مشورہ کرتی۔ بہرحال اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایک پرزے پر خاموشی سے مسز فاروقی کا پتہ لکھ دیا۔
غزالہ نے بیٹھے بیٹھے پتہ پڑھا اور وہاں سے سیدھی گھر آ گئی۔

گھر آ کر غزالہ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ افتخار یا میمونہ بیگم سے وہ اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ میمونہ بیگم بیسیوں بار آ کر اس کے کمرے میں جھانک چکی تھی۔ مگر غزالہ نظر انداز کر کے پڑی رہی۔ شام کو اس نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور چھوٹے بچے کو بھی بنا سنوار کر ٹیکسی میں مسز فاروقی کے ہاں جا دھمکی۔
شجاع اور آبگینہ اس دن بھی ڈاکٹر زیدی کے ہسپتال گئی ہوئی تھیں۔ غزالہ نے جب گھنٹی کا بٹن دبایا تو مسز فاروقی کو بے حد حیرت ہوئی۔ ان کے ہاں کم ہی کوئی آتا تھا۔ اور یوں بھی جاننے والے سیدھے آ کر کمرے کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتے تھے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ رمضو نے آ کر کہا۔

کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔

مسز فاروقی نے کہا۔

ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور ہاں چائے تیار کرو، میرے سر میں درد ہے۔

مسز فاروقی نے آئینے میں خود کو دیکھا اور مطمئن ہو کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔ ان کو اندر آتا دیکھ کر غزالہ جو اب تک ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی کھڑی ہو گئی اور سلام کیا۔ مسز فاروقی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولیں۔

فرمائیے کس سے ملنا ہے آپ کو؟

غزالہ مسکرائی اور بولی۔

مسز فاروقی سے اور وہ غالباً آپ ہی ہیں۔

جی ہاں میں ہی ہوں مسز فاروقی۔ فرمائیے مجھ سے کیا کام ہے؟

میں شجاع سے ملنے آئی ہوں، وہ آپ ہی کے ہاں رہتی ہے نا؟

مسز فاروقی نے غور سے غزالہ کا جائزہ لیا۔ جب سے شجاع ان کے ہاں آئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ اس سے کوئی اجنبی عورت ملنے آئی تھی۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی غزالہ نے کہا۔

مسز فاروقی میں اس کی ماں ہوں۔

ماں۔ آپ اس کی ماں ہیں؟

جی ہاں اور یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے

آپ غالباً کسی دوسرے شہر سے تشریف لائی ہیں؟

جی نہیں، میں اسی شہر میں رہتی ہوں۔

مسز فاروقی کو بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ اگر وہ شجاع کی ماں ہے اور اسی شہر میں رہتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ شجاع پہلے ہوسٹل میں رہتی تھی، پھر ان کے ہاں آ گئی اور اس نے کبھی نہیں بتایا کہ اس کی ماں یہیں اسی شہر میں رہتی ہے۔ انہوں نے گہری مشکوک نظر غزالہ پر ڈالی اور بولیں وہ تو بتا رہی تھی کہ اس کے کچھ رشتہ دار اس شہر میں رہتے ہیں، آپ لوگوں کا تو کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔

بات کرنے کا یہی موقع تھا اس لئے غزالہ جھٹ سے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسز فاروقی میں آپ کو کیا بتاؤں وہ کس قدر خود سر لڑکی ہے۔ گھر موجود ہے، ماں باپ بہن بھائی سب موجود ہیں۔ بس ایک ہی رٹ تھی کہ ہوسٹل میں رہوں گی۔ گھر میں پڑھائی نہیں ہوتی۔ اس کے باپ کو دراصل اس سے بہت پیار ہے، انہوں نے ہی اسے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد وہ تو چلے گئے پنڈی اور میری طبیعت خراب ہو گئی۔ بھئی دیکھئے اگر ہم اسے ہوسٹل میں ملنے نہ جا سکے تو کیا وہ بھی نہیں آ سکتی تھی؟ ایک بار بھی پلٹ کر نہ پوچھا۔ اب مشکل سے میری طبیعت سنبھلی تو میں اسے ملنے آئی۔ وہ تو بھلا ہو بے چاری اس کی سہیلی کا جس نے یہاں کا پتہ بتایا، ورنہ میں اس کے باپ کو کیا جواب دیتی۔

غزالہ نے جلدی جلدی اپنا تسلط جما لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مسز فاروقی کوئی سوال کریں اور مسز فاروقی کو سوال کرنے کا دھیان ہی کہاں تھا۔ وہ تو شعاع کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ کیا بھولا بھالا چہرہ ہے، مگر کس قدر مکار ہے۔ ماں، باپ، بہن بھائی سب موجود ہیں مگر کیسی لاوارث اور مظلوم بنتی ہے۔ اب اتنی باتیں جو غزالہ نے کی تھیں، اس کے جواب میں کچھ کہنا تو لازمی تھا، بڑی مشکل سے بولیں۔

بھئی معاف کیجئے گا بہن، دراصل وہ میری بچیوں کو پڑھاتی ہے۔ ایک دن بتانے لگی کہ رشتے داروں کے پاس رہتی ہوں، وہ بہت تنگ کرتے ہیں، اس لئے میں ہوسٹل میں آ گئی ہوں تو بہن میں نے ہی اسے کہا کہ میرے ہاں آ جائے، مگر توبہ توبہ، مجھے یہ سب کیا معلوم تھا اور اسے ضرورت کیا پڑی تھی اس طرح کی باتیں کرنے کی۔ دیکھنے میں تو بہت بھولی بھالی ہے۔

غزالہ فوراً بولی۔

اجی یہ آج کل کی لڑکیاں ہیں، ہے تو میری بیٹی مگر کیا بتاؤں کس قدر ناک میں دم کر رکھا ہے۔ نہایت بد دماغ اور خود سر لڑکی ہے۔ اپنا مکان ہے، باپ جتنا کماتا ہے ان لوگوں کے

بہت ہے نا؟ بھلا بتائیے پھر ٹیوشن کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں ہر وقت لڑنا جھگڑنا، توڑ پھوڑ، میں تو عاجز آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنی اولاد ہے اور یوں بھی جوان جہان لڑکی کا یوں مارے مارے پھرنا۔ بس میں آپ سے کیا کہوں، اس کے باپ کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں تو شامت میری ہی آئے گی۔

یہ کہہ کر غزالہ نے پرس میں سے رومال نکال کر مگرمچھ کے آنسو پونچھے اور ناک صاف کی اور اسی دوران غزالہ کو خیال آیا کہ شعاع کا معلوم تو کرے کہ ہے کہاں، کہیں پردے کے پیچھے چھپ کر ساری باتیں سن رہی ہو اور آ کر بھانڈا پھوڑ دے اس لئے پوچھنے لگی۔

مگر مسز فاروقی وہ ہے کہاں؟

اس کے جواب میں مسز فاروقی نے تفصیل سے اس کی طبیعت کی خرابی کا سارا قصہ بیان کیا اور پھر بتایا کہ ہسپتال گئی ہے۔ غزالہ نے آنکھوں میں زبردستی آنسو لا کر کہا۔

اب ذرا سوچئے تو بہن، والدین کو خبر نہیں اور دوسرے لوگ لاوارث سمجھ کر اس کی خدمت کر رہے ہیں۔

موقع کے لحاظ سے آنسو تو آنکھوں میں لانا پڑے تھے حالانکہ اس کا جی کچھ اور چاہ رہا تھا۔ لفظ 'ماں' میں ہی اتنا وزن ہے کہ مسز فاروقی اس کی باتوں پر ایمان لے آئی تھیں، ورنہ کوئی ایسی باتیں کرتا تو شاید وہ دشمنی بھی نہ۔

غزالہ نے کہا۔

اچھا اب اجازت چاہتی ہوں، شعاع آئے تو اسے بتا دیجئے گا اور بھئی میں تو کہتی ہوں اسے صاف صاف کہہ دیجئے گا کہ ماں باپ موجود ہیں تو وہاں رہے، ویسے میں کل شام اسے لینے آؤں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسز فاروقی نے بااصرار اسے چائے پر روک لیا۔ اس دوران بھی غزالہ بڑی چالاکی سے مسز فاروقی کے سامنے اس کی خود سری اور بدتمیزی کا رونا روتی رہی۔ اور مسز فاروقی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی گئیں۔ چائے کے بعد غزالہ فوراً چل دی، ورنہ ممکن تھا شجاع آجاتی اور غزالہ کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

مسز فاروقی نے اسے شجاع کے آنے تک بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ بچوں کی تنہائی کا کہہ کر نہ رکی اور جب گھر جانے کے لئے وہ رکشا میں بیٹھی تو وہ بے حد مسرور تھی۔ میمونہ بیگم کی تربیت کا دیا ہوا رنگ وقت آنے پر ابھر ہی آتا ہے۔ شجاع کو مسز فاروقی کی نگاہوں سے گرا کر وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔

گھر جا کر غزالہ نے میمونہ بیگم یا افتخار سے اس سلسلے میں ذرا سی بھی بات نہ کی۔ اسی لئے تو وہ کسی بڑے بچے کو ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ رات کو اس نے سوچا۔

کل شام کو پھر جاؤں گی اور اس کو ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔ دیکھوں گی کیسے نہیں آتی۔

پچھلی ساری حسین یادیں وہ فراموش کر چکی تھی، وہ محبتیں مردہ ہو گئی تھیں جو نعمان کے بچوں کے لئے وقف تھیں۔ اب تو وہ میمونہ بیگم کا دوسرا روپ تھی۔ اور اسے یہی لگن تھی کہ نعمان کی بیٹی کا تنا ہوا سر جھکا دے تاکہ وہ افتخار اور غزالہ کا احسان ماننے پر مجبور ہو جائے۔

نفرتوں اور عداوتوں کے شعلے ہی شعلے بیدار ہوتے۔ اور شجاع کا نازک دل تھا۔ وہ پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ باپ سے خوش سمجھتا تھا، وہ اس سے بے خبر تھی اور ماں اس کے لئے دل میں عداوتوں اور نفرتوں کو جلا دیتی تھی۔

شجاع اتنے حوصلے اور عزم کے باوجود بے حد کمزور تھی خاموش تھی۔

مگر ماں کی محبت کی بھوکی تھی۔ باپ سے شدید نفرت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ باپ کے شفقت بھرے

پہرے کی کتنی متنی ہوتی، کیسی عجیب زندگی تھی۔

اس دن بھی انہیں ہسپتال سے کافی دیر ہو گئی تھی، کیونکہ شجاع ڈاکٹر زیدی سے کہہ رہی تھی کہ وہ اسے اپنے ہسپتال میں رکھ لے اور وہ ہنس کر ٹالے جا رہا تھا۔ مگر شجاع نے اسے قائل کر ہی لیا۔ نہ جانے اس ہسپتال میں کام کرنے سے شجاع کس بات کی تسکین چاہتی تھی۔ ڈاکٹر زیدی کے مان جانے سے شجاع خوش تھی۔ اس لئے وہ گھر میں بھی مسکراتے چہرے سے داخل ہوئی۔ مسز فاروقی کو سلام کیا تو خلافِ توقع انہوں نے سرد مہری سے جواب دیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ نہ طبیعت کا پوچھا نہ دیر کا سبب دریافت کیا۔

شجاع کا خیال تھا کہ جاتے ہی مسز فاروقی کو خوش خبری سناؤں گی، مگر ان کا خشک رویہ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ایسے وقت میں اسے اپنی محرومیوں کا شدت سے احساس ہونے لگتا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ مسز فاروقی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا مگر چائے کے لئے نہ روکا۔

شجاع حیران حیران سی اپنے کمرے میں بہت دیر تک کھڑی رہی، پھر کپڑے بدلے بغیر پلنگ پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ مسز فاروقی اس سے پہلے ہمیشہ اس سے اچھی طرح بولتی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شجاع کے ساتھ ان کے رویے میں تبدیلی تھی۔

نجو چائے لے آئی۔ شجاع نے انکار کر دیا۔ رات کا کھانا منگوایا مگر اس کے ساتھ مسز فاروقی نہ آئیں۔ خود شجاع میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ لوگوں کی خفگی کی وجہ معلوم کرتی پھر بھی اس کا دل دھڑک کر اس سے کہہ رہا تھا۔

کوئی بات ہے ضرور۔ . . .

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات بھر کی بے چینی کے بعد شجاع صبح کے قریب سو گئی۔ اس لئے جب صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ اسے کوئی جگانے نہیں آیا تھا۔ اس نے زور سے اپنی آنکھوں کو مل ڈالا، کیسے کھٹک رہے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ بیٹھی ہی تھی کہ رشنو بڑی خاموشی سے ناشتہ لے آیا اور رات کے کھانے کو ویسے کا ویسا رکھا دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکا پھر خاموشی سے اٹھا کر لے گیا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ ہوا ٹھہر سی گئی تھی۔ شجاع نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر پٹ کھول دیئے۔ نرم گھاس پر دھوپ کتنی خاموشی سے سو رہی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ سوپ کیتلی کا ڈھکن اٹھایا تو تازہ چائے کی خوشبو ناک میں گھسی چلی گئی۔ شجاع کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس لئے اوپر تلے تین کپ چائے پی گئی۔ کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے دوا بھی نہیں کھائی تھی۔ ناشتے کی ٹرے ایک طرف کھسکا کر وہ لیٹ گئی۔ وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی مگر ساری باتیں اس طرح گڈ مڈ ہو گئیں کہ کسی ایک بات کو اس میں سے نکالنا مشکل ہو گیا۔ الٹا ہاتھ پیشانی پر رکھے وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ تیز روشنی میں اس کی کنپٹیوں کے سنہرے رو ئیں بھی لرزتے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کوئی پرندہ بھی نہیں بول رہا تھا۔ ایسا سنسان ماحول، شجاع کا دم گھٹنے کو تھا کہ مسز فاروقی اندر داخل ہوئیں۔ شجاع فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مسز فاروقی کا سخت چہرہ دیکھ کر وہ منتظر انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے غور کیا کہ مسز فاروقی نے ٹرے میں رکھی ناشتے کی چیزوں کو دیکھ کر بھی کچھ نہ کہا تھا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ مسز فاروقی چند لمحے اس کی بھوری آنکھوں اور زرد چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ جانے کہاں سے محبت کی لہر ان کے دل میں آ گئی۔ انہیں شجاع سے یوں ہی محبت تھی، مگر غزالہ کی باتوں نے وقتی طور پر ان کے دل کو سخت کر دیا تھا۔ اب شجاع کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر رحم اور محبت کے جذبات پھر ابھرے اور انہوں نے بے حد نرمی سے کہا۔

شجاع تمہیں معلوم ہے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

جی ہاں خالہ جان میں جانتی ہوں۔

کتنے معصوم الفاظ تھے شجاع کے چہرے کی طرح، اس کے دل کی طرح۔ مسز فاروقی نے اس کی طرف پھر غور سے دیکھا اور بولیں۔

پھر تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔

شجاع کو یک دم خیال ہوا کہ مسز فاروقی کو سہیل اور اس کے بارے میں کوئی گمان ہوا ہے اس نے سر جھکا لیا۔ مگر مسز فاروقی کہنے لگیں۔

”تمہیں معلوم ہے کل یہاں تمہاری والدہ آئی تھیں۔

میری والدہ . . . ؟

شجاع پر جیسے بم پھٹ پڑا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے، وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی بے بسی سے مسز فاروقی کی طرف دیکھا۔

تو تمہیں اس بات سے انکار نہیں کہ تمہاری والدہ اس شہر میں رہتی ہیں۔

شجاع خاموش رہی۔ انہوں نے پھر کہا۔

میں چاہتی ہوں تم میری باتوں کا جواب دو، کیا تمہارے والدین اسی شہر میں رہتے ہیں؟

جی ہاں۔

شجاع نے بے حد دھیمی آواز سے کہا۔ مسز فاروقی نے پھر کہا۔

دیکھو بیٹی تم پڑھی لکھی ہو، پھر بھلا تم نے کیا سوچی، وہ تو تمہارا واسطہ اچھے لوگوں سے پڑا، ورنہ جو لڑکیاں گھروں سے اس طرح نکل آتی ہیں غلط لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ سے اولاد کو بہت سے گلے شکوے ہوتے ہیں مگر اس طرح ان سے رشتہ توڑ دینا دانشمندی نہیں۔ مجھے اس بات پر بے حد صدمہ ہوا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع اپنی انگلی کو اضطراب کے عالم میں ملتی رہی۔ غزالہ کا ہوسٹل اور یونیورسٹی آنا وہ یکسر فراموش کر چکی تھی، لیکن اس کی پہنچ مسز فاروقی تک ہو جائے گی یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ سدا کی بدقسمت تھی، اس کی خوشی ہمیشہ چند گھڑیوں کی مہمان ہوتی تھی۔

مسز فاروقی اس کے دل کی کیفیت سے بے خبر تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس جنت کے لُٹ جانے کے احساس نے شجاع پر کیا اثر کیا تھا، وہ جنت جس کے پُرسکون ماحول میں ابھی شجاع نے ٹھیک سے قدم بھی نہیں جمائے تھے۔

مسز فاروقی نے کہا۔

تمہارا باپ تم لوگوں کے لیے کماتا ہے مگر تم ٹیوشن کرتی ہو۔ اور پھر تمہارے پیارے پیارے بہن بھائی ہیں، کیا تمہیں ان سے بھی محبت نہیں۔ تمہیں اپنے باپ سے بھی محبت نہیں۔ میں تمہیں اتنی سخت دل تو نہیں سمجھتی تھی۔

باپ کے نام پر شجاع کے دل میں وہی نفرت جاگی۔ بولی۔

مسز فاروقی، میرا کوئی باپ نہیں ہے۔

بیٹی سچ ہے۔ ماں باپ لاڈ پیار میں بچوں کو بگاڑ دیتے ہیں، اس حد تک کہ بچے ان کے وجود سے ہی شرماتے ہیں اور شجاع تم تو مجھے خالہ کہتی تھیں۔ یہ یک وقت مسز فاروقی کیوں؟

شجاع شرمندہ تو پہلے ہی تھی گھبرا کر بولی۔

میں معافی چاہتی ہوں خالہ جان۔ آپ کے جو احسانات مجھ پر ہیں وہ میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گی۔ مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ میرے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے۔

مسز فاروقی ابھی اسے اور نصیحتیں کرنا چاہتی تھیں مگر شجاع کی بات سن کر بولی۔

بیٹی تم مجھے آبگینہ نگینہ کی طرح عزیز ہو، مگر تمہارے جھوٹ نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا ہے پھر تمہارا جب تک جی چاہے رہو، مگر میرا خیال ہے کہ لڑکی جب تک کنواری ہو اسے ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے اور شادی کے بعد شوہر کے ساتھ۔ تمہارے ماں باپ کو نہ جانے لوگ کیسی باتیں بناتے ہوں گے۔

شجاع نے پرخیال لہجے میں کہا۔

جو اصلیت ہے وہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرا کوئی نہیں، آپ کے دل میں میری طرف سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔

مسز فاروقی نے کہا۔

شجاع: یہ تو ایک طرح کا فرار ہے کہ انسان حقائق کا سامنا کرنے سے گھبرائے۔ اگر وہ عورت تمہاری ماں ہے تب بھی اور نہیں ہے تب بھی تمہیں اس کا سامنا کرنا ہو گا، وہ شام کو آئے گی اس سے پہلے میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی ـــــ ارے تم نے دوا بھی نہیں پی رمضو ـــــ اے رمضو۔

مسز فاروقی نے بڑی خوبی سے بات کا رخ پلٹ دیا اور رمضو کو آوازیں دیتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

شجاع کے لیے غزالہ کی آمد کی خبر نئی ہی تھی۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ تنہائی میں بات ہوتی تو شاید کوئی راستہ نکل ہی آتا، مگر مسز فاروقی کے سامنے غزالہ کو جھٹلانا بے حد مشکل کام تھا۔ اور اسے ماں تسلیم کرنے کا مطلب تھا، اس کے ساتھ اس جہنم میں واپس جانا ہو گا۔ شجاع نے سوچا کہ کھڑکی کے راستے چلی جائے، مگر یہ تو بہت ہی بُری بات ہو گی کہ مجرموں کی طرح فرار ہوا جائے۔ اسے معلوم تھا کہ جو وقت آنا ہو گا وہ ضرور آئے گا۔ اس سے فرار کیسا۔ بہت دیر سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں کوئی حل نہ آیا۔ تو وہ خاموشی سے شام کے انتظار میں لیٹ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو حالات ہوں گے دیکھا جائے گا۔

اس نے اپنا ذہن خالی کرنا چاہا۔ مگر سوالات تھے کہ پے در پے اس کے ذہن میں امڈے چلے آرہے تھے۔

اب کیا ہو گا؟

غزالہ کیا کیا باتیں کرے گی؟ میرا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

کیا جھگڑا کروں؟ کیا مسز فاروقی کو تمام حالات بتا دوں؟ کیا اسے ماں ماننے سے انکار کر دوں؟

نہیں نہیں —— تو کیا خاموش رہوں؟

غزالہ کے آنے کا مطلب ہے کہ مجھے اسی گھر میں واپس جانا ہو گا۔

نہیں نہیں، میں وہاں نہیں جاؤں گی کبھی نہیں۔

وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی جلدی اپنی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔ شام ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اس کے پاس آئندہ پیش آنے والے واقعات کے ساتھ نمٹنے کے لئے سوچ بچار کا کافی وقت تھا۔ مگر وقت بھی جب ہی کام دیتا ہے جب ذہن فارغ ہو۔ مگر شعاع کے ذہن میں ایک سے ایک باتیں الجھی پڑی تھیں۔ بس ایک ہی خیال تھا کہ غزالہ کے آنے سے پہلے کہیں چلی جائے۔

اس نے اپنا سامان سمیٹا اور فیصلہ کر لیا کہ میں کسی دوسرے شہر میں چلی جاؤں گی۔

شعاع نے کمرے کے وسط میں کھڑے سوچا

شعاع

شعاع نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا، سامنے سعدیہ کھڑی تھی۔

ارے

اس نے حیرت سے سوچا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع اپنی اتنی مخلص دوست کو تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔ سعدیہ نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ تھام لئے۔ وہ کیسی زرد اور دکھی نظر آ رہی تھی۔ سعدیہ کا دل بھر آیا۔

کیسی ہو شعاع؟

وہ شعاع کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شعاع نے کہا۔

تم بہت دنوں بعد آئیں سعدیہ؟

میں بیمار ہو گئی تھی۔ پھر میری کزن کی شادی تھی۔ مگر تم بتاؤ تم نے یونیورسٹی آنا کیوں چھوڑ دیا۔ میں اب ایم اے نہیں کروں گی سعدیہ۔ میں نوکری کروں گی۔ مگر۔۔۔۔

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ سعدیہ نے پوچھا۔

مگر کیا؟

تمہیں معلوم نہیں سعدیہ کیا واقعہ ہوا ہے۔

شعاع تذبذب میں تھی کہ آیا وہ غزالہ کی آمد کا قصہ سعدیہ سے کہے یا نہ کہے۔ سعدیہ کو کچھ اندازہ تھا۔ اسی سبب وہ شعاع سے ملنے آئی تھی۔ مگر اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور خاصی حیرت سے پوچھا۔

کیا واقعہ ہوا ہے؟ جلدی بتاؤ۔

شعاع نے دھیرے دھیرے غزالہ کی آمد کا قصہ سنایا۔ سعدیہ خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر سارے قصے میں شعاع نے یہ نہ بتایا کہ غزالہ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ سعدیہ نے خود ہی پوچھ لیا۔

شعاع وہ عورت تمہاری ماں ہے؟

شعاع چونک پڑی اور بولی۔

تم سے کس نے کہا؟

کیا عجیب موڈ تھا۔ سعدیہ گھبرائی۔

وہ ۔۔۔۔ وہ مسز فاروقی نے۔

تم وہاں کب سے آئی ہوئی ہو؟

تھوڑی دیر ہوئی۔

اس کا مطلب ہے مسز فاروقی نے آتے ہی تمہیں یہ قصہ سنایا۔ یہ بات ہے تو یہی سہی۔

سعدیہ نے پھر پوچھا

شعاع وہ تمہاری ماں ہے؟

اگر جنم دینے والی عورت کو ہی ماں کہتے ہیں تو وہ میری ماں ہے مگر اس نے ماں کے حقوق پورے نہیں کئے اس لئے میں اسے ماں نہیں سمجھتی۔

یہ بات بری ہے شعاع۔ ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔

سعدیہ نے شعاع کے دلی جذبات سے بے خبر ہوتے ہوئے کہا۔ شعاع کے زرد چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔

مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے سعدیہ۔ میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتی۔

ارے خفا ہو گئیں۔ میرا مطلب یہ نہ تھا۔

تمہارا مطلب کچھ ہی سہی۔ برائے مہربانی اب اس موضوع پر بات نہ کرنا۔

شعاع سعدیہ سے لاتعلق ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا بیمار ذہن تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سعدیہ شرمندگی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ بیٹھی ہی رہی۔ شعاع کا جی چاہ رہا تھا کہ سعدیہ چلی جائے۔ وہ آنے والے واقعات سے نمٹنے کے لئے کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا مگر سعدیہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھی رہی۔ پھر مسز فاروقی آگئیں۔ اب سعدیہ اور مسز فاروقی آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور ان کی آواز شعاع کو اپنے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح لگتی محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن تاریکی کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ چمکیلے دن کی سنہری روشنی وہ بند پپوٹوں تلے سرخ محسوس کر رہی تھی۔ پھر وہ آس پاس سے غافل ہو گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ اکیلی پسینے میں شرابور لیٹی تھی۔ گھڑی ساڑھے تین بجا رہی تھی۔ اب سوچنے کے لیے وقت بہت کم تھا۔ وہ بڑی دقت سے اٹھی، منہ ہاتھ دھویا۔ سامان سمیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔

ابھی شام ہونے میں دیر ہے، یہاں سے نکل جاؤں تو بہتر ہے۔

وہ ابھی کلائی کی گھڑی باندھ ہی رہی تھی کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، مسز فاروقی کے ساتھ غزالہ کھڑی تھی۔ پورے میک اپ میں۔ بظاہر مسکرا رہی تھی مگر چہرے پر پریشانی نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ شعاع اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ مسز فاروقی کے سامنے بناوٹ کرتے ہوئے وہ بازو پھیلا کر بڑھی۔

میری بچی۔ میری شعاع۔

شعاع غیرارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

بس بس، بہت ہو چکی مسز افتخار۔

اسی لمحے شعاع کی نظر سعدیہ پر پڑی جو حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

افسوس جس بات کو وہ چھپانا چاہتی تھی، وہی ظاہر ہو گئی تھی۔

غزالہ کھسیانی سی ہو کر بولی۔

بڑی شریر ہے۔ ارے تم نے اپنا سامان بھی سمیٹ لیا۔ بہت خوب۔

سعدیہ کی موجودگی نے شعاع کے لبوں پر مہر سی لگا دی۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ غزالہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مسز فاروقی کرسی پر اور دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ غزالہ کی جو زبان چلنا شروع ہوئی تو مسز فاروقی صرف سامعین میں شمار ہونے لگیں۔ باتیں کرتے کرتے غزالہ نے سعدیہ سے کہا۔

بھئی میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ سے ہی تو مجھے اپنی بیٹی کا پتہ ملا، ورنہ یہ نالائق تو چھپ کر آ بیٹھی تھی۔

اف وہ نگاہ

جو شعاع نے سعدیہ پر ڈالی۔ سعدیہ کا جی چاہا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے آج دوستی کا بھرم بھی ٹوٹ گیا۔ یہ کیسی چبھن تھی جو شعاع کے دل میں ہوئی۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے سعدیہ کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

ارے میں اتنی مخلص دوست کو تو بھول ہی گئی تھی۔

مگر اب اسے معلوم ہوا کہ لوگ مخلص ہوتے ہوئے بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ عجیب سی کھوکھلی آواز میں بولی۔

امی چلئے دیر ہو رہی ہے۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ غزالہ بھی ہکا بکا رہ گئی۔ مسز فاروقی نے انہیں چائے پر روکنے کی بے حد کوشش کی، مگر شعاع کی ایک ہی نہ تھی۔ رمضو ٹیکسی لے آیا، سامان رکھا گیا۔ مسز فاروقی نے شعاع کو گلے سے لگا کر پیشانی چومی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کبھی کبھار آتی رہنا شعاع۔

شعاع کو مسز فاروقی سے کوئی گلہ، کوئی شکایت نہ تھی، مگر آج وہ ان کے محبت کے اظہار پر رو بھی نہ سکی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سعدیہ کے فق چہرے پر نگاہ ڈالی اور بڑی سادگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا۔

شکریہ۔

وہ چلی گئی۔ سعدیہ نے وہیں کھڑے کھڑے رونا شروع کر دیا۔ مسز فاروقی خود بھی رو رہی تھیں وہ تو غنیمت تھا کہ آبگینہ اور نگینہ خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھیں ورنہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

اداس سی شام ڈھل رہی تھی۔ سعدیہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ مسز فاروقی شجاع کے کمرے میں آ گئیں۔ خالی کمرہ —— انہوں نے لیمپ جلا دیا۔ میز کے قریب شجاع کا گلابی رومال گرا ہوا تھا۔ مسز فاروقی نے جھک کر اٹھا لیا۔

تم اتنی خاموشی سے چلی جاؤ گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

رومال کا کونہ مسلتے ہوئے مسز فاروقی نے خالی کمرے پر نگاہ ڈالی۔ ایک کمزور سی لڑکی کے چلے جانے سے وہ کیسا ویران لگ رہا تھا۔

نعمان نے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔

سہیل نے کہا۔

آداب عرض ہے۔

چند لمحے نعمان اسے اجنبی سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ سہیل شرمندہ سا ہو گیا۔ اسے اپنے باپ کی ضد پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ کوئی بات ہے کہ اسے نعمان کے پاس بھیج دیا۔ خفت سے نگاہیں جھکائے وہ دروازے ہی میں کھڑا رہا۔ نعمان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا پھر اس نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

آؤ آؤ میاں، تم تو ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

سہیل ان کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ نعمان اس سے حق صاحب اور بیگم حق کی خیریت پوچھتا رہا۔ بڑی محبت سے چائے پلائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نعمان سہیل کی دلی کیفیت سمجھ گیا ہے۔ اس لئے وہ مسلسل باتیں کرتا رہا۔ سہیل کے ضمیر کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ جب وہ جانے کے لیے اٹھا تو نعمان نے کہا۔

بیٹا تمہارے والد بہت دنوں سے نہیں آئے ان سے کہنا کسی دن آئیں۔

جی اچھا۔

سہیل کے جانے کے بعد نعمان سر تھام کر بیٹھ گیا۔ سہیل کو دیکھ کر زخم پھر ہرے ہو گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی ہوئی۔

نعمان نے شجاع کے بارے میں ایک فیصلہ کیا تھا۔

مگر

اتنے دن گزرنے کے بعد بھی وہ اس فیصلے پر عمل نہ کر سکا تھا۔ بہت سی باتیں، بہت سے رشتے اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔

کاش سہیل، تم مجھ سے ملنے نہ آئے ہوتے تو میں اپنے دل کو اپنے ہاتھوں مارنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مگر تم نے پھر مجھے جگا دیا۔

اسے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا ہی ہوگا۔ سہیل کی آمد کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر بھی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں اپنی بدنصیب بیٹی کو اپنا لوں۔ شجاع کو اپنے گھر لے آؤں۔

نعمان اس مسئلے پر مزید کچھ سوچنے کو تیار نہ تھا۔ ورنہ وہی مجبوریاں، وہی رشتے ممکن ہے پھر اس کی راہ میں آنے کی کوشش کرتے۔

اداس شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ نعمان کی کار فاروقی صاحب کے پورچ میں رکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو شام کا سناٹا ایک پل کو ٹوٹ گیا۔ رمضو نے برآمدے میں آکر دیکھا۔ نعمان نے پوچھا۔

مسز فاروقی ہیں ؟

رمضو نے سر کے اشارے سے ہاں کی اور مسز فاروقی کو اطلاع دینے چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ہی مسز فاروقی آگئیں۔

آئیے بھائی جان

وہ نعمان کو ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ رمضو کو چائے کا کہہ کر وہ بھی ڈرائنگ روم میں آبیٹھیں۔

بھابی کیسی ہیں آپ ؟

اچھی ہوں۔

نعمان آنے کو تو آگیا تھا مگر اب اسے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جھجکتے جھجکتے مسز فاروقی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

ایسا لگتا ہے روتی رہی ہیں۔

اس نے سوچا۔ پھر اس نے فاروقی صاحب اور بچوں کی خیریت معلوم کی۔ پھر دبی زبان سے پوچھا۔

اس لڑکی کا کیا حال ہے ؟

کس کا، شعاع کا پوچھ رہے ہیں ؟

جی ہاں، اب ٹھیک ہے کیا ؟

ٹھیک ہے۔

ایک سرد آہ مسز فاروقی کے لبوں سے نکلی۔ نعمان کانپ گیا۔ کیا پوچھے، کس طرح پوچھے، خاموشی ہی خاموشی تھی۔ نعمان نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

شعاع گھر میں موجود ہے ؟

مسز فاروقی نے نگاہ اٹھا کر نعمان کو دیکھا اور سوچا۔

کتنے ناوقت آیا ہے یہ شخص۔

رمضو چائے لے آیا تھا۔ رات ہونے کو تھی۔ نعمان کا دل چائے پینے کو نہ چاہتا تھا۔ پھر فاروقی صاحب بھی تو نہیں تھے۔ وہ سوچتے ہی رہے۔ مسز فاروقی نے چائے کا کپ انہیں تھما دیا اور بولیں۔

کیا بتاؤں بھائی صاحب، مجھے اس لڑکی سے کتنا پیار تھا۔

لفظ "تھا"، پر نعمان چونکا اور سوالیہ انداز سے مسز فاروقی کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز فاروقی نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔

اس کا علاج ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹی جو بنا رکھا تھا۔ مگر دیکھئے ذرا کل شام ایک عورت آئی اور آج وہ اسے یہاں سے لے بھی گئی۔ جانتے ہیں وہ عورت کون تھی ؟ وہ اس کی ماں تھی۔

نعمان کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔ مگر چائے اس کے کپڑوں پر گر گئی۔

اوہ اوہ، یہ کیا ہوا ؟

مسز فاروقی گھبراہٹ میں بولیں۔ نعمان نے رومال نکال کر پتلون میں سے چائے صاف کرتے ہوئے کہا۔

معافی چاہتا ہوں، ہاتھ ہل گیا تھا۔

نہیں بھائی معافی کی کیا بات ہے۔

نعمان نے بات کا رخ بدلا۔

ہاں تو آپ کیا کہہ رہی تھیں ؟

مسز فاروقی پر پھر رقت طاری ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اے بھیا جب اس عورت نے کہا۔ میں شجاع کی ماں ہوں تو اللہ جانتا ہے مجھے اس لڑکی پر بہت غصہ آیا۔ مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ میرا کوئی نہیں، مگر وہ ایسی بھولی بھالی بچی ہے کہ میں اس پر ناراض بھی نہ ہو سکی۔ میرا خیال ہے بات کوئی ایسی ویسی ضرور ہے۔ جب اس کی ماں اس کے پاس آئی تو ـــ "

مسز فاروقی نے نعمان پر نگاہ ڈالی جو آگے کو جھکا ہوا پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مسز فاروقی کو بھی خیال ہوا کہ یہ کیا طوطا مینا کی کہانی شروع کر دی۔ اور شروع بھی اس کے سامنے جس سے کوئی خاص مراسم بھی نہ تھے۔ بہرحال بات شروع کر چکی تھیں اس سے درمیان میں روکنا بہت بری بات تھی۔ بولیں۔

میں تو سمجھی تھی ماں بیٹی گلے ملیں گی۔ مگر بھائی صاحب شجاع نے کہا۔ امیں بس مسز . . . . .
اے لو میں نام ہی بھول گئی۔ بہرحال کچھ مسز کہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں چلی گئیں۔

نعمان نے عجیب بے تابی سے پوچھا۔

کیا بغیر حیل و حجت کے چلی گئی۔

تو اور کیا۔ آخر ماں آئی تھی۔ بھیا میرا تو جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائے مگر بھئی اس کا گھر بار ماں باپ، بہن بھائی سب موجود ہیں۔ میں کیسے روکتی اور یوں بھی وہ اپنی خوشی سے گئی ہے۔

نعمان نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

وہ خاموشی سے چلی گئی۔

تو اور کیا بھائی صاحب شور مچاتی۔

مسز فاروقی الجھ سی گئیں۔

نعمان نے کہا۔

اچھا میں چلتا ہوں۔

راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا۔

شجاع تم خاموشی سے غزالہ کے ساتھ چلی گئیں، کیوں چلی گئیں۔ آج ہی تو میں نے تمہیں سب کے سامنے اپنی بیٹی کہہ دینے کی ہمت کی تھی۔ تم نے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔

نعمان کو وہ وقت یاد آ رہا تھا۔ جب اس نے یونیورسٹی میں غزالہ اور شجاع کی باتیں سنی تھیں۔

اس وقت شجاع نے کتنی نفرت اور حقارت سے کہا تھا۔

مسز افتخار آپ میری ماں نہیں، صرف مسز افتخار ہیں۔

وہ بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ آج اس کے دل میں چھپی ہوئی باپ کی محبت سارے بندھن توڑ کر ابھری تو اس کی بیٹی اس سے بہت دور چلی گئی تھی وہ جہاں گئی تھی، نعمان کا وہاں جانا ناممکن تھا۔ یادوں کے قبرستان میں وہی قدم رکھ سکتا ہے۔ جو خود کو مار دینا چاہتا ہو۔ اگر غزالہ زبردستی شجاع کو لے گئی ہوتی تو شاید نعمان کو اتنا تعجب نہ ہوتا۔ اسے تو حیرت اس بات پر تھی۔ کہ شجاع بغیر کسی حیل و حجت کے چلی گئی۔

وہی پرانا کمرہ، مگر فضا نامانوس، شجاع نے ہونٹ بھینچ کر سب پر نگاہ دوڑائی۔ میمونہ بیگم کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی۔

سلام تک نہیں کیا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی اٹھ گیا ہے۔

اب چپ بھی ہوتی ہو بڑی بی یا کان کھائے جاؤ گی۔

افتخار نے چڑ کر کہا۔

اس کی آواز سن کر شجاع کے چہرے پر نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے زیر لب کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک ہے، میں بھی بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔

رات کا کھانا اس نے نہیں کھایا۔ غزالہ دودھ لے کر آئی۔

لو بیٹی دودھ پی لو۔

میز پر رکھ دو۔

وہ ششدر رہ گئی۔

تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں ملازمہ ہوں۔

میرے سر میں درد ہے شور نہ مچائیں۔

غزالہ دانت کچکچا کر چلی گئی۔ شعاع نے اٹھ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ دودھ پی لیا اور پھر آرام سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اسے بہت کچھ فیصلے کرنے تھے۔ کوئی نو بجے ہوں گے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔

اس نے پوچھا

کون ہے؟

کوئی نہ بولا، کھٹ کھٹ ہوتی رہی، وہ جھلا گئی۔ اٹھ کر کنڈی کھولی باہر اس کی سوتیلی بہن سیما کھڑی تھی۔

کیا ہے؟

وہ غصے میں بولی۔

باجی میں اس کمرے میں سویا کرتی ہوں۔

خبردار جو مجھے باجی کہا۔ اور سنو یہ کمرہ میرا ہے اس میں اب میں رہوں گی۔ بھاگو یہاں سے

خبردار جو دروازہ کھٹکھٹایا۔

شعاع نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ سیما بسورتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔ غزالہ نے ساری بات سن کر افتخار سے کہا۔

میں منع کرتی تھی اسی لئے، دیکھا اس کا مزاج کتنا بگڑ چکا ہے۔

دیکھنا کیسا ٹھیک کرتا ہوں اسے۔ جاؤ سیما تم نانی کے ساتھ سو جاؤ۔

غزالہ نے احتجاج کیا۔

بھئی اماں کے پاس تو عاصم سوتا ہے، یہ کہاں گھسے گی وہاں جا کر۔

کچھ نہیں ہوتا تمہاری اماں کو۔ جاؤ بیٹا تم نانی کے پاس جاؤ۔

افتخار لمبے چوڑے دعوے کرتا رہا، مگر غزالہ کا دل ڈرتا تھا، وہ شعاع سے واقف تھی سب سے بڑی بات یہ کہ جس خاموشی سے وہ غزالہ کے ساتھ آگئی تھی وہ غیر معمولی انداز تھا۔

بھئی سچ پوچھیں تو مجھے ڈر لگتا ہے ناں۔

افتخار آنکھیں لال کر کے بولا۔

کیا ڈر ڈر لگا رکھی ہے، کھا تو نہ جائے گی نہیں، دیکھنا کیسی سیدھی کروں گا۔

خیر میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ آپ اس سے سختی کریں۔

تمہاری اجازت کون مانگتا ہے۔ بے فائدہ ٹر ٹر کئے جا رہی ہو۔ میں سختی کیوں کروں گا۔ میرا منصوبہ سنو گی تو عش عش کر اٹھو گی۔

افتخار تو مزے سے سو گیا مگر غزالہ ساری رات جاگتی رہی۔ وہ شعاع کو لا کر سخت پچھتا رہی تھی افتخار کا کیا تھا، وہ تو سارا دن دفتر میں گزارتا ہے۔ کم بختی تو غزالہ کی آنے والی تھی۔

اس نے لرز کر دعا مانگی۔

اے اللہ تو ہی اسے نیکی دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افتخار دفتر جا چکا تھا۔ بچے بھی سکول جا چکے تھے۔ آج غزالہ نے چھٹی کی تھی۔ نو بجنے کو تھے مگر شعائر نے دروازہ نہ کھولا تھا۔

غزالہ سوچ رہی تھی۔

یا اللہ کس مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ کیوں افتخار کی باتوں میں آ کر اس لڑکی کو گھر لے آئی۔ خدا جانے کیا حشر کرے۔

ادھر میمونہ بیگم ڈری ڈری سہمی سہمی نظروں سے پھر رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسری کی طرف دیکھ کر خاموش سی ہو جاتی تھیں۔

دونوں طرف خاموشی تھی، سکوت تھا۔ آخر میمونہ بیگم نے اس خاموشی، اس سکوت کو توڑا۔

اب اسے لے آئی ہو تو نخرے بھی اٹھاؤ۔

غزالہ نے کہا۔

مگر آپ اور افتخار ہی پیچھے پڑے ہوئے تھے، اب آپ ہی اٹھائیں اسے۔ میری تو ہمت نہیں پڑ رہی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

مجھے کیا ضرورت ہے۔ بیٹی نے کون سا سکھ دیا جو اب نواسی بھی دے گی۔

غزالہ بیگم کو غصہ تو بہت آیا مگر صبر کر گئی اور نرم لہجے میں بولی۔

امی جان آپ اسے کسی طرح جگا دیں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

میں نہیں جگا سکتی۔

میری اچھی امی!

میں کسی کی امی نہیں ہوں۔ میری تو اب اس گھر میں نوکروں سے بھی بدتر حالت ہے۔ میرے ساتھ تو یہاں کتوں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ اور یہ تمہارا افتخار بات بات پر جھڑکتا ہے اللہ رکھے داماد نے کبھی بڑا بول منہ سے نہ نکالا تھا۔

غزالہ غصے میں بھر گئی مگر ضبط کئے بغیر گزارہ نہ تھا۔ ورنہ تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کہہ دے کہ بدحالوں کو پہنچانے والی آپ ہیں، مگر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

امی جان آپ اسے جگا دیں۔ مجھ سے ایک تو وہ خفا ہے۔ دوسرے میرا لحاظ نہیں کرتی آپ آخر پھر بھی نانی ہیں۔ اس کی بزرگ ہیں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

لحاظ وحاظ تو وہ کسی کا نہیں کرتی۔

امی جان آپ جائیں تو سہی۔

میمونہ بیگم تذبذب کے عالم میں تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ——— کہ شعائر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ سفید ساڑھی باندھے باہر آ گئی۔ غزالہ اور میمونہ بیگم پر ایک قہر آلود نظر ڈالی اور کھانے کی میز پر جا بیٹھی اور چیخ کر بولی۔

ناشتہ ———

غزالہ نے میمونہ بیگم کی طرف درخواست بھری نظروں سے دیکھا کہ اسے جا کر ناشتہ دے دے۔ میمونہ بیگم محبت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنے لہجے میں زبردستی کا پیار بھر کر بولیں۔

شعائر۔

شعائر نے کہا۔

میں پوچھتی ہوں ناشتہ کہاں ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ بیگم نے کہا۔

میں ابھی لاتی ہوں۔

شعاع نے کہا۔

کان کھول کر سن لیں کہ میں ناشتے میں چار کپ گرم چائے دو فل بائل انڈے، صبح بیڈ ٹی، دوپہر میں مرغی کا سوپ، بھنا گوشت، روغنی نان، میٹھے چاول اور ایک سیر سیب کھاتی ہوں۔ اسی طرح رات میں۔

مگر بیٹی، ہم اتنے امیر۔

شعاع نے میمونہ بیگم کا جملہ درمیان میں سے ہی کاٹ دیا۔

اگر اتنے امیر نہیں رہے تو مجھے لانے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ کہہ کر وہ پیر پٹختی باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔

غزالہ نے کہا۔

کہاں جا رہی ہو؟

جہاں میری مرضی۔

ناشتہ تو کر لو۔

نہیں کرتی۔ شعاع نے کہا اور باہر نکل گئی۔

غزالہ نے بڑی مشکل سے میمونہ بیگم کی طنزیہ نگاہوں سے آنکھ بچائی۔

اور ساتھ کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے نعیم نے شعاع کی باتیں سنیں تو کانوں کو چھو کر کہا

باپ رے باپ، لڑکی ہے یا تتیا مرچ، ماموں جان کو بھی خوب سوجھی۔

شعاع نکلنے کو تو باہر نکل گئی تھی مگر وہ جائے کہاں؟ سامنے کوئی جگہ نہ تھی، کوئی منزل نہ تھی،

وہ تو اب ایک ایسی لڑکی تھی۔

جو زندگی کے پلیٹ فارم پر اکیلی کھڑی تھی اور

جس کی سب گاڑیاں چھوٹ چکی تھیں۔

یونیورسٹی جانا تو چھٹ ہی گیا تھا، پھر کہاں جائے؟

ڈاکٹر زیدی۔

اسے خیال آیا اور وہ ان کے کلینک جا پہنچی۔ مگر سخت مایوسی ہوئی۔ ڈاکٹر زیدی موجود نہیں تھے۔ وہ خالی الذہن ہو کر راہداری میں ٹہلنے لگی۔ داہنے ہاتھ کو پرائیویٹ کمرے تھے اور بائیں طرف جنرل وارڈ۔ وہ کھڑکیوں کے شیشوں سے ناک چپکا کر بچوں کی طرح کمروں میں جھانکنے لگی۔ اس طرح گھومنے پھرنے میں اسے اتنا مزہ آیا کہ وہ چند لمحوں کے لئے اپنی زندگی کے تلخ لمحات بھول گئی۔ آخری والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی دبلی سی لڑکی نے حیرت سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ شعاع جھینپ کر جلدی سے زیدی کے آفس میں جا گھسی۔ ڈاکٹر ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر مسکرا دیا۔

ہیلو بے بی۔

ہیلو ڈاکٹر۔ وہ ہولے سے بولی۔

”اچھا، کیا تم آ گئیں۔ ویسے مجھے معلوم تھا تم جلدی آؤ گی، مگر اتنی جلدی کی امید نہ تھی۔ خیر بیٹھو، تنہا آئی ہو؟“

شعاع نے معصومیت سے سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر اداس ہو گیا۔ جب سے شعاع کو دیکھا تھا اسے اپنی مرحومہ بچی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔

میں راؤنڈ پر جا رہا ہوں، چلو گی؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ جواب میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر کے ساتھ گھومتے ہوئے، مریضوں کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو بے حد ذمہ دار نرس محسوس کر رہی تھی۔

بے بی

ڈاکٹر نے کہا۔

یس، ڈاکٹر

ڈاکٹر نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا تو وہ اداسی سے مسکرا دی۔

بہت خوب، چلو جنرل وارڈ کی طرف۔

جنرل وارڈ سے وہ پرائیویٹ کمروں کی طرف چلے گئے۔ آخری والے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دبلی سی لڑکی اب بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ شماع کو دیکھ کر وہ پھر مسکرا دی۔ اس کے زرد چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی ـــ ڈاکٹر نے کہا۔

ادھر آؤ بے بی تمہیں ان سے ملواؤں۔

شماع ایک دم آگے آ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

بے بی یہ صابرہ ہیں۔ اور بیٹی یہ ہیں شماع۔

میری اسسٹنٹ۔

بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ابھی کھڑکی میں سے آپ ہی جھانک رہی تھیں نا؟

شماع شرما گئی۔

شام کو شماع کی واپسی سے پہلے غزالہ، افتخار اور میمونہ بیگم میں کانفرنس ہو رہی تھی۔ غزالہ اور میمونہ بیگم نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور افتخار کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے۔ افتخار خود شماع کی طبیعت سے واقف تھا۔ اس کی خود ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ مگر وہ اپنے چالاک ذہن میں منصوبے بنا رہا تھا کہ کس طرح اس لڑکی کو زیر کیا جائے۔ آخر بہت سوچ سوچ کر اس نے ان دونوں کے سامنے تجویز رکھی کہ جب شماع اکیلی بیٹھی ہو تو نعیم کو اس کے پاس بھیجا جائے نعیم ماشاءاللہ جوان ہے، خوبصورت ہے اور دولت مند بھی۔ اسے دیکھ کر کوئی لڑکی بھی رام ہو سکتی ہے۔ کوئی لڑکی بھی اس سے شادی کی خواہش کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شماع اسے پہلی ہی نظر میں پسند کرے گی۔

غزالہ تو اس تجویز پر خاموش رہی مگر میمونہ بیگم نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افتخار، تمہاری یہ اسکیم فیل ہو جائے گی۔

افتخار نے زہریلی نگاہوں کے ساتھ میمونہ بیگم کی طرف دیکھا۔

کیسے فیل ہو جائے گی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

وہ جس باپ کی بیٹی ہے اسے تم نہیں جانتے۔ نعمان خودداری کا مجسمہ تھا اور اس کی بیٹی...

افتخار نے بات کاٹی۔

اے بڑھیا زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ خودداری کا مجسمہ تھا تو اس کے ساتھ نباہ کیا ہوتا۔ طلاق کیوں لے لی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

کچھ بھی کہو، حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ اصلیت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ خاندانی آدمی خاندانی ہی رہتا ہے۔

افتخار نے غزالہ کو ڈانٹا۔

تم اس بڑھیا کو یہاں سے بھیج دو، ورنہ میں دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ بُری طرح پیش آؤں گا۔

افتخار نے گھور کر میمونہ بیگم کی طرف جو دیکھا تو میمونہ بیگم وہاں سے اُٹھ کر چل دی۔

افتخار اور غزالہ نے میمونہ بیگم میں ایک تغیر محسوس کیا تھا کہ اب میمونہ بیگم جو پہلے بھیگی بلی بنی رہتی تھی اب وہ پہلے جیسی نہ رہی تھی بلکہ جب سے شعاع آئی تھی کچھ شیر ہو چلی تھی اور افتخار اور غزالہ بیگم بیک وقت محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس گھر میں شعاع کے علاوہ کسی سے خوف زدہ نہیں

میمونہ بیگم کے وہاں سے اٹھ جانے کے بعد افتخار نے غزالہ سے یہ اسکیم پکی کروالی کہ نعیم خود ہی شعاع سے نپٹ لے گا۔

رات میں شعاع گھر میں آئی۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدل کر باہر لان میں جا بیٹھی۔

باہر لان میں سناٹا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا، ہلکی ہلکی شبنم پڑ رہی تھی اور بھیگی بھیگی سی چاندنی نے فضا کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا۔

شعاع سوچ رہی تھی۔

کہ زندگی نے اس کے ساتھ کتنے مذاق کئے ہیں۔ کیسی کیسی اذیتیں، تکلیفیں اس نے کاٹی ہیں بچپن سے باپ کی محبت نہ ملی۔ ماں تھی تو وہ کسی اور کے بچوں کی تھی۔ نانی کا کردار ایک کٹیا سے کم نہیں تھا۔ وہ اس گھر سے جا کر بھی دیکھ آئی تھی۔

کہیں چین نہ تھا، کہیں سکون نہ تھا۔

کیسی عجیب زندگی ہے۔ کتنی کٹھن ہے اس زندگی میں۔

قدم قدم پر مایوسیاں۔

اس کا ذہن عجیب سا ہو رہا تھا۔ اس میں ایک دھند سی چھا چلی تھی۔ ایک دھواں سا ابھر چلا تھا

اور ——

اس دھند اس دھوئیں میں کچھ دھندلے دھندلے سے چہرے نظر آ رہے تھے۔

سعدیہ، لبنیٰ، ہما، مسز فاروقی، نگینہ اور آبگینہ کے چہرے۔

اور ——

ان چہروں کے ساتھ دو اور چہرے ابھرے۔

نعمان —— لبنیٰ کا باپ، کتنی شفقت، کتنی محبت تھی اس کے چہرے میں، اس کے دیکھنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے انداز میں۔

اور پھر جو آخری چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرا۔

وہ سہیل کا چہرہ تھا۔

وہ اس چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی رہے کہ اتنے میں اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں ؟

شعاع تو اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک آواز ضرور اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر وہ آواز کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔

اور ——

شعاع کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان اس کے قریب کھڑا ہے۔

کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔

شعاع اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کون ہیں آپ ؟

میں نعیم ہوں۔

کون نعیم ؟

افتخار صاحب کا بھانجہ۔

یہاں کیوں آئے ہو ؟

آپ سے ملنے

کیوں ؟

اس کیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔

کیا ماموں جان نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔

شعاع نے کہا۔ تو آپ کوئی ایسی اہم چیز ہیں جن کا ذکر ضروری تھا۔

نعیم نے کہا، تو مجھے اپنا تعارف خود ہی کروا دینا چاہیے۔

شعاع نے کہا۔ اے مسٹر، سیدھی طرح چلتے پھرتے نظر آیئے۔

نعیم بوکھلا گیا۔ میں اس بے عزتی کا ذکر ماموں جان سے ضرور کروں گا۔

شعاع نے کہا۔ ضرور کرنا۔

ماموں جان خود آپ سے نپٹ لیں گے۔

شعاع نے کہا۔ اگر اپنی اور اپنے ماموں جان کی خیریت چاہتے ہو تو سیدھی طرح یہاں سے چلے جاؤ۔

نعیم نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ دراصل صبح کے منظر کے بعد اس نے حالات کا بڑی حد تک اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کس انداز کی لڑکی ہے۔

نعیم کے جانے کے بعد غزالہ بیگم آ کر شعاع کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھی رہی پھر بولی۔

شعاع ——

شعاع نے کوئی جواب نہ دیا۔

شعاع ——

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع پھر بھی خاموش رہی۔

شعاع نعیم سے کیا بات ہوئی؟

شعاع نے کہا۔

مسز افتخار، کان کھول کر سن لیں کہ اب میں وہ پہلے والی لڑکی نہیں ہوں جس کے ساتھ آپ نے اور آپ کی ماں نے جو سلوک چاہا کر لیا۔ اور نہ ہی میں کوئی موم کی گڑیا ہوں کہ جس طرف چاہا موڑ لیا۔ میں نہ کوئی کھلونہ ہوں اور نہ بچہ۔ آپ مجھے یہاں لے آئی ہیں۔ جس نیت کے ساتھ آپ مجھے یہاں لائی ہیں اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں نے وہاں سے آنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کی، مگر یہاں رہ کر میں سب لوگوں کا جینا حرام کر دوں گی۔ میں اس گھر کی ایک ایک چیز توڑ دوں گی۔ اگر مجھے زندگی میں سکون نہیں ہے تو میں کسی اور کو بھی سکون کے ساتھ نہ رہنے دوں گی۔

اور وہ کہتی رہی۔

اگر تم لوگ آرام اور سکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کل صبح یہاں سے چلی جاؤں گی اور اگر کسی نے روکنے کی کوشش کی تو نتیجے کی ذمہ دار میں نہ ہوں گی۔

غزالہ نے کہا۔

مگر تم جاؤ گی کہاں؟

میں نے ہسپتال میں نوکری کر لی ہے۔

غزالہ نے کہا۔ شعاع خاندان کی عزت کو اچھالو نہیں۔

شعاع نے کہا۔

آپ نے جو خاندان کی عزت بنائی ہے وہ بھی میرے سامنے ہے۔

شعاع نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ اگلی صبح اس نے اپنا سامان باندھا، اٹیچی اٹھایا اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ غزالہ اور میمونہ بیگم اسے کھڑی چپ چاپ دیکھتی رہیں، مگر روکنے کی یا بات کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ غزالہ کو آج ایک بار پھر افسوس ہو رہا تھا، اس کے پرانے دکھ جاگ چلے تھے دل زخم پھر ہرے ہو چلے تھے۔

اور وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ اگر آج وہ نعمان کے ساتھ ہوتی تو اس طرح بیٹی کو گھر سے نہ جانے دیتی۔

شعاع گھر سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی اور ٹیکسی یا رکشا کی تلاش میں چلی جا رہی تھی چاروں طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ رکشا کے انتظار میں اس نے آگے بڑھ کر سڑک پر نگاہ ڈالی۔ تبھی تیزی سے جاتی ہوئی کار زوردار بریک کی آواز سے رک گئی۔ گاڑی بیک کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

کہاں جا رہی ہیں؟

اس نے دیکھا کار میں سہیل تھا۔

وہ خاموش رہی۔ اب اسے دیکھ کر وہ جھنجلاتی نہ تھی۔ بلکہ اس کا مسکراتا چہرہ دھیرے دھیرے اس کے دل کو نرم کر رہا تھا۔ سہیل چپ سا ہو گیا۔

برا مان گئیں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

وہ پھر بھی خاموش رہی

آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکریہ، آپ جائیے میں رکشا لے لوں گی۔

وہ خاموشی سے چلا گیا۔ شعاع کا دل دکھ سے بھر آیا۔ اس نے دور جاتی ہوئی کار کی طرف دیکھا
سہیل، میں نے ہمیشہ تمہارا دل دکھایا ہے۔ تم اپنی راہیں بدل کیوں نہیں لیتے۔ اس سے پہلے
اور اچھے لگنے لگو۔

اتنے میں وہی کار مخالف سمت سے آہستہ آہستہ آئی۔ وہ شعاع کے لئے رکشا لایا تھا۔ اتنا
سے اس نے رکشا والے کو اس طرف بھیج دیا اور خود آگے نکل گیا۔ یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ شعاع
خود کو ظالم محسوس کیا اور ربنی کی منگنی کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ سہیل کی طرف سے اس کا
میں محبت بھرے جذبات ابھرے تھے۔ آج اس نے ان جذبات کو دبانے کی بے سود کوشش بھی

شعاع جنرل وارڈ میں تھی کہ چپڑاسی اسے بلانے آیا۔
ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر ہمیشہ اسے ضروری کام کے وقت بلاتا تھا۔ شعاع جلدی سے گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے
ہی اس کی نگاہ جس پہ پڑی۔ وہ حنا تھی۔ شعاع دروازے ہی میں رک گئی۔ اسے دیکھ کر حنا کو اچھا
نہ لگا مگر ایک شخص ایسا تھا جو کرسی پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حنا نے تعجب سے نعمان کی طرف دیکھا
اور پھر سلیمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

یہ اس لڑکی سے اس قدر متاثر کیوں ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا۔

ادھر آؤ بے بی، یہ سلیمان میاں نے انگلی توڑلی ہے کرکٹ کھیلتے ہوئے۔
شعاع نے آہستہ سے سلام کیا۔

نا نے آہستہ سے جواب دے کر نعمان کی طرف دیکھا جو اپنی غیر ارادی حرکت چھپا نے کے،
کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔
م ایسے وقت میں سامنے آتی ہو۔ جب مجھے توقع نہیں ہوتی۔ تم میرے لئے کیا پیغام لاتی ہو،
نا نا چاہتی ہو۔
نعمان نے پلٹ کر شعاع کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر خود سے کہا۔
اور پہلے کیا ہوا فیصلہ اسے یاد آگیا۔
ب سہیل سے ملنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ تقدیر مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اپنی بدنصیب
چاہوں۔ شعاع کو اپنے گھر لے آؤں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع کو جنرل وارڈ سے چپڑاسی بلا کر لایا۔ ڈاکٹر زیدی سلیمان کی پٹی کر رہے تھے۔ شجاع نے اندر داخل ہو کر حِنا، نعمان اور سلیمان کو دیکھا اور اس نے حِنا کو سلام کیا۔

حِنا نے آہستہ سے جواب دے کر نعمان کی طرف دیکھا جو اپنی غیر اختیاری حرکت چھپانے کو کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

تم ایسے وقت میں سامنے آتی ہو جب مجھے اس کی توقع نہیں ہوتی۔ تم میرے لیے کیا پیغام لاتی ہو؟ تم مجھے کیا بتانا چاہتی ہو؟

نعمان نے پلٹ کر شجاع کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر خود سے کہا۔

اور اسے اپنا کیا ہوا فیصلہ یاد آ گیا۔

جب سیل سے ملنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ تقدیر مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اپنی ہر بیہ

بچی کو اپنا لوں، اسے اپنے گھر لے آؤں۔

ڈاکٹر کے کہنے پر شجاع سارا سامان ڈاکٹر کے کمرے میں لے آئی۔ سلیمان کی انگلی کی مرہم پٹی میں وہ بڑھ چڑھ کر ڈاکٹر کی مدد کرتی رہی۔ سلیمان میں بلا کا ضبط کا مادہ تھا۔ ہونٹ بھینچے اس نے ساری تکلیف برداشت کر لی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

پٹی میں نے کر دی ہے مگر ایکسرے ضروری ہے ایکسرے کے بعد پلاستر چڑھے گا۔

اس دوران نعمان کھڑکی سے باہر نگاہیں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اور حِنا گہری تشویش چہرے پر لیے کبھی سلیمان کو دیکھتی اور کبھی نعمان کی طرف۔ گاہے گاہے اس کی نگاہ شجاع کے صبیح چہرے پر بھی رک جاتی۔ اور وہ بڑے غور سے اس کی جھکی ہوئی سنہری پلکوں کی طرف دیکھتی رہی۔

نہ جانے اس لڑکی میں کیا بات ہے، جتنا غصہ اس کی غیر موجودگی میں اس پر آتا ہے اس کا چہرہ دیکھ کر اتنا نہیں رہتا۔

حِنا نے ایک گہری نظر شجاع پر ڈال کر سوچا۔

سلیمان کی پٹی کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا۔ گولیاں دیں۔ شجاع اپنے کام سے فارغ ہو کر چلی گئی تھی۔ نعمان نے ڈاکٹر سے اجازت لی اور سلیمان کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

حِنا بڑے غور سے نعمان کی ہر حرکت دیکھتی رہی۔ وہ اتنا کھویا کھویا سا تھا کہ ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ حِنا جانتی تھی کہ نعمان اپنے بچوں پر جان چھڑکتا ہے، مگر یہ بھی جانتی تھی کہ وہ شجاع کو دیکھ کر کھو سا جاتا ہے۔ یوں بھی وہ سلیمان کی چوٹ کو دیکھ اس قدر پریشان نہ تھا جتنا شجاع کو دیکھ کر ہو گیا تھا۔

حِنا بھی خاموش رہی اور نعمان بھی، اور وہ لوگ گھر تک آ پہنچے۔ سلیمان غنودگی سی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے حِنا اسے کمرے میں لٹانے لے گئی۔ وہ نعمان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ سلیمان کو دوا دے کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلایا اور جب وہ باہر نکلی تو معلوم ہوا کہ نعمان دفتر جا چکا ہے۔

حنا برآمدے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

آج پہلا موقعہ تھا کہ نعمان مزدوروں، چپراسیوں کے سلام نظر انداز کرتا ہوا جلدی سے اپنے دفتر میں چلا گیا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ نعمان نے تو کبھی بھی کسی پر یہ ظاہر نہ کیا تھا کہ وہ مل کا مالک ہے اور وہ لوگ ملازم۔ آج ایسی کون سی بات ہو گئی ہے، سب پریشان تھے۔ مگر نعمان ان باتوں سے بے خبر تھا۔ جاتے ہی اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور کہا۔

دیکھو میں آج کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس لئے سب کو آنے سے منع کر دو۔ جاؤ۔

متحیر چپراسی سر ہلا کر باہر نکل آیا۔

نعمان سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نعمان نے چپراسی کو بلا کر تمام ٹیلی فونوں کے پلگ نکلوا دیئے۔ اس کا ذہن صرف شعاع کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

شعاع —— میری بیٹی

نعمان نے آہ بھر کر سوچا۔

میں تمہیں سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ تمہارے سب دکھ دور کرنا چاہتا ہوں، مگر میں یہ سب کیسے کروں، میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں ہی تمہارا باپ ہوں۔

وہ اضطراب کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

کاش یہ بات مجھے نہ معلوم ہوتی کہ تم میری بیٹی ہو۔ اگر یہ معلوم ہو ہی گیا تھا تو یہ نہ ہوتا کہ تمہیں اپنے باپ سے نفرت ہوتی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں وہ نہیں جو تم نے اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے۔

نعمان پھر بیٹھ گیا بے سوچے سمجھے کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنے لگا۔

شعاع! میری بیٹی!! آج میں ایک راز سے پردہ اٹھا رہا ہوں۔

آج میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ ایک عجیب بات۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہہ دی، اس وقت تک اسے کیوں چھپائے رکھا۔

میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ ہر بار میں نے ہمت کی، تمہیں یہ بات بتا دوں، تم پر یہ راز افشا کر دوں، مگر ہر بار کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو گئی کہ میں اس راز سے پردہ نہ اٹھا سکا، کبھی خود میں ہمت نہ پائی، کبھی حالات نے اجازت نہ دی۔

شعاع، تم میری بیٹی ہو۔

تم اس بات پر ناراض نہ ہونا، تم واقعی میری بیٹی ہو۔ غزالہ اور نعمان کی بیٹی، تم نے مجھے ہمیشہ ظالم سمجھا، میں ظالم نہیں کم نصیب نعمان ہوں۔ ہاں ظلم تمہاری ماں اور نانی نے کئے ہیں کہ ایک شوہر سے اس کی بیوی چھین لی، ایک بیٹی باپ سے جدا کر دی گئی۔ اور اپنی کمزوریوں کو میری کمزوریاں بنا کر پیش کیا، تصویر کا اصل رخ نہ دکھایا، اور جو رخ دکھایا، اصل تصویر وہ نہ تھی۔

بیٹی! میں تمہیں کس طرح بتاؤں، تم سے جدا ہو کر میں نے کیا کیا دکھ اٹھائے ہیں۔ تم ننھی سی تھیں جب میں تمہارے منہ سے ابو کا لفظ سن کر خوشی سے نہال ہو جاتا تھا۔ مگر انہوں نے ظلم کیا تمہیں مجھ سے چھین لیا تم پر ظلم تھا کہ تمہارا باپ چھین لیا گیا۔ اور مجھ پر ظلم تھا کہ مجھ سے میری بیٹی چھین لی گئی۔ تم ننھی کلی تھیں بہت دیر بعد اس صدمے کا اثر لیا مگر اسی زمانے سے میں اس آگ میں جل رہا ہوں۔

شعاع میری بیٹی۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو اپنی پھوپھی سیما سے پوچھ لو، اس پر بھی یقین نہ آئے تو اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکو۔ جہاں تمہارے لئے پیار ہی پیار ہے۔ اس پر بھی یقین نہ آئے تو مجھے ان ظالم عورتوں کے پاس لے چلو تاکہ ان کے سامنے ان کے دیئے ہوئے دکھ، چن کے بتا دوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری بچی: خدا نے مجھے اور بچے بھی دے رکھے ہیں، وہ مجھے چاہتے ہیں، میں انہیں چاہتا ہوں، مگر میں اُس بیٹی کی محبت کا پیاسا ہوں جسے میری شفقت اور محبت حاصل نہیں۔

شعاع، میں غزالہ پر الزام نہیں رکھتا، مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر وہ میمونہ بیگم کی باتوں میں نہ آتی تو آج میں تم سے دور اتنا پریشان نہ ہوتا۔

میری بیٹی، بہت دنوں کے بعد مجھ میں یہ ہمت آئی ہے کہ میں تمہیں لکھ سکوں۔

ہاں، میں ہی تمہارا باپ ہوں۔

شعاع! تم میرے پاس آجاؤ، تمہاری بہن اور بھائی ہیں، ماں ہے، گھر ہے، ان سب پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں یہ خط پا کر دکھ بھی ہوگا اور خوشی بھی۔ مگر ایسے دُکھ بھلائے جا سکتے ہیں جن کے بعد خوشی ہو۔ میں چاہتا ہوں اس خط کے جواب میں تم میرے پاس آجاؤ تاکہ میرے بے قرار اور پریشان دل کو قرار آجائے۔ اگر تم مجھے قصوروار سمجھتی ہو تو مجھے معاف کر دو۔

تمہارا بدنصیب باپ

نعمان

جو باتیں نعمان کے دل میں اٹھ رہی تھیں وہ انہیں پوری طرح نہ لکھ سکا تھا۔ اس نے ایک بار اپنا لکھا ہوا خط پڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی مجرم نے اپنا جرم صاف چھپانے کی کوشش کی ہو اور الزام دوسروں پر ڈالا ہو۔ نعمان نے جھنجلا کر خط پھاڑ ڈالا۔ ردّی کاغذوں کی ٹوکری میں پرزے ڈالتے ہوئے اس نے سوچا۔

آخر میں کیا طریقہ اختیار کروں کہ شعاع میرے پاس آجائے۔

وہ سوچتا رہا۔ دل و دماغ میں طوفان اٹھتے رہے، وہ بیٹھ جاتا۔ ٹہلنے لگتا۔ مگر کوئی راہ سجھائی نہ دی وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتا تھا کہ جائے اور کہے۔

شعاع، میں تمہارا باپ ہوں، تمہیں لینے آیا ہوں۔

اتنی ہمت ہوتی تو وہ کب سے مدعا بیان کر چکا ہوتا۔

دوپہر کا کھانا کھانے بھی گھر نہ گیا۔ ٹیلی فونوں کے پلگ نکلوا چکا تھا۔ اس وقت باہر کی دنیا سے کٹا اپنے دفتر میں محصور بیٹھا تھا۔

کوئی چار بجے بعد دوپہر وہ کمرے سے نکلا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ڈاکٹر زیدی کے دفتر میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے۔ نعمان کو ایک ایک پل گراں محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

اوہو، نعمان صاحب تشریف رکھتے ہیں۔

اس نے کوٹ اتار کر چپراسی کو تھماتے ہوئے کہا۔

چائے لاؤ ——— ہاں تو نعمان صاحب کیا حال ہے سلیمان میاں کا؟

ٹھیک ہے ——— میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر ہنسا۔

جی ہاں نعمان صاحب ٹھیک ہے کا مطلب ٹھیک ہے ہی ہوتا ہے۔ دراصل آپ بچے کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔

نعمان نے پہلو بدلا۔

جی ہاں، مگر اس وقت تو مجھے تکلیف ہے۔

اوہو، خدانخواستہ، آئیے ادھر بیٹھے، میں دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ نعمان نے گھبرا کر کہا۔

نہیں ڈاکٹر زیدی معائنے کی ضرورت نہیں۔ آپ پہلے سن لیں۔

اچھی صاحب ساتھ ساتھ ہی سُن لوں گا، آپ چل کر لیٹئے تو سہی۔

ڈاکٹر۔ دراصل میں پریشان ہوں، اس لئے کہ ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاں صاحب اولاد بھی بڑی ظالم چیز ہے۔ بچے خواہ تکلیف محسوس نہ کریں، مگر آپ اس کا اثر نہ لیں۔ خیر آیئے میں معائنہ کر لوں۔

نعمان اداس سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔ ڈاکٹر نے ایک طویل سرد سانس بھری اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، معمولی چوٹ ہے، وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

نعمان نے جھنجلا کر کہا۔

میں بچے کی بات نہیں کر رہا، کچھ اپنی بات کہنا چاہتا ہوں، اپنی تکلیف بتانا چاہتا ہوں۔

کمال ہے، نعمان صاحب آپ ذرا سی بات پر اتنا گھبرا گئے ہیں، آپ آرام سے لیٹیے، میں ابھی دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ بادلِ نخواستہ نعمان لیٹ گیا۔ ڈاکٹر نے آواز دی۔

بوٹے۔

لڑکے کے آنے پر نسخہ دیا۔ جلدی یہ گولیاں لاؤ۔

لڑکا جلدی سے دو گولیاں اور پانی کا گلاس لے آیا۔ ڈاکٹر نے گولیاں نعمان کی ہتھیلی پر رکھیں اور کہا۔

یہ گولیاں کھا لیں، ذہن کو سکون ملے گا، پھر میں معائنہ کرتا ہوں۔

نعمان نے چڑ کر گولیاں ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھ دیں اور بیٹھ کر بولا۔

آپ کیسے ڈاکٹر ہیں، کیسے مسیحا ہیں کہ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنس دیا۔

نعمان صاحب بچوں سے سب پیار کرتے ہیں، مگر آپ تو دیوانگی کی حد کرتے ہیں۔

بچہ ــــ بچہ ــــ میں بچے کے لئے نہیں آیا۔ اگر آپ میری نہیں سنتے تو میں جاتا ہوں۔

نعمان کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا۔

نعمان صاحب بیٹھئے تو سہی۔

نعمان بیٹھ گیا۔ جھنجلاہٹ اس کے بشرے سے نمایاں تھی۔ ڈاکٹر نے گولیاں پھر آگے بڑھائیں اور نرمی سے کہا۔

آپ واقعی بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں، یہ گولیاں کھا لیں، ذرا ذہن کو سکون ملے گا تو میں سنتا ہوں۔

نعمان نے گولیاں کھا لیں۔ چپڑاسی چائے لے آیا۔ ڈاکٹر نے کپ نعمان کے آگے رکھا۔ دونوں نے خاموشی سے چائے پی۔ ڈاکٹر غور سے نعمان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

ہاں تو فرمایئے ــــ سگریٹ۔

نہیں شکریہ۔

اب فرمایئے نعمان صاحب۔

ڈاکٹر نے سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

نعمان ایک بار پھر گھبرا گیا۔ کس طرح بات شروع کرے۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب دراصل مجھے کچھ کہنا ہے

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

ہاں ہاں ضرور کہئے۔

نعمان کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کے ہاں جو لڑکی ہے ناشعاع۔

جی ـــــ

وہ میری بیٹی ہے۔

آپ کی بیٹی ؟

جی ہاں ـــــ

سگی ؟

جی۔

ڈاکٹر سیدھا ہو بیٹھا۔ پھر اس کے سوالات شروع ہوئے' پھر باتیں ہونے لگیں اور دھیرے دھیرے نعمان نے اسے سارے حالات سنا دیئے۔ وہ باتیں جو آج تک کسی سے نہ کہہ سکا تھا دل ہلکا سا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے بڑے غور سے سب باتیں سنیں' پھر سوچتا رہا اور بولا۔

اَب آپ کا کیا ارادہ ہے ؟

مَیں چاہتا ہوں اسے اپنے گھر لے جاؤں۔

وہ کیسے جائے گی ؟

بس کیا جانوں' تم کیسے ڈاکٹر ہو ؟ کیسے مسیحا ہو ؟ کہ بیماری جاننے کے باوجود علاج مریض سے پوچھتے ہو۔ آپ جسمانی مرض ہی نہیں ذہنی تکلیف بھی رفع کر سکتے ہیں' سوچئے۔

ہوں' سوچتے ہیں بھائی۔ دونوں سوچتے ہیں۔

نعمان نے کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرتے ہوئے یکدم کہا۔

مگر اسے معلوم نہ ہو کہ مَیں اس کا باپ ہوں۔ کسی بہانے وہ میرے گھر میں آجائے تو کتنا اچھا! سب کی محبت اس کے دل سے نفرت نکال دے۔

اوہ ـــ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔

ڈاکٹر سوچ میں ڈوب گیا' سگریٹ سلگایا اور پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نعمان عادت کے مطابق نظریں باہر جمائے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر اس کی کرسی کی پشت پر جھکا اور دھیرے دھیرے کچھ کہا۔

نعمان کا چہرہ کھل سا گیا' اس نے کھڑے ہو کر ڈاکٹر کا ہاتھ تھاما۔

بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ـــ میں اب چلتا ہوں۔

ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

بے فکر رہیے' آپ جائیے مَیں نسخہ لکھتا ہوں' علاج میں کوتاہی نہ ہو۔

اور دونوں ہنس دیئے۔

نعمان گھر پہنچا تو حنا بے حد خاموش سی تھی۔ گہری سوالیہ نظروں سے نعمان کی طرف دیکھنے لگی۔

نعمان نے بڑے پیار سے کہا۔

سلیمان کیسا ہے اَب ؟

اَب تو ٹھیک ہے ـــ آپ دن میں کھانا کھانے کیوں نہیں آتے ؟ میں نے کئی بار فون کیا مگر معلوم ہوتا ہے فون بھی خراب ہے۔

حنا اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ نعمان نے گہری محبت کی نگاہ اس پر ڈالی۔ وفا شعار بیوی کا متفکر چہرہ سامنے تھا۔ اس کی طرف پیار سے دیکھ کر بولا۔

بس سلیمان کی طبیعت کی وجہ سے ذہن بے حد پریشان ہے۔ صبح مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ ڈاکٹر سے مل کر آیا ہوں' ساری کیفیت پوچھی تو ذرا سکون ملا ہے۔ انشاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا' پریشان کیوں ہوتی ہو۔

حنا نے نگاہیں جھکا لیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تو ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہے، پریشان تو میں آپ کی وجہ سے تھی۔

اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

نعمان نے ہنس کر کہا۔

پگلی —— میں ٹھیک ہوں —— چلو مسکراؤ اب۔

حِنا مسکرا دی۔

چائے پئیں گے؟

پلا دو —— ویسے بھوک لگی ہے

کھانے میں ذرا دیر ہے —— چائے پی لیں۔

ٹھیک ہے، مَیں منہ دھو کر آتا ہوں۔

حِنا باہر چلی گئی۔ نعمان اسے جاتا دیکھتا رہا۔ دبے ہونٹوں سے بولا۔

حِنا ——

حِنا ——

اور پھر غسل خانے میں چلا گیا۔

صبح کے نو بجے تھے، لبنیٰ یونیورسٹی جا چکی تھی اور بچے اسکول۔ حِنا نے کئی بار آ کر دیکھا مگر نعمان ابھی بستر پر ہی تھا۔ پھر دس بج گئے۔ آخر وہ گھبرا کر اندر آئی۔ وہ آنکھیں بند کیے کس قدر معصوم اور نوروز لگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ جوانی بیتے بہت دن ہو گئے تھے، مگر پختہ عمری کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نہ تھی۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

نعمان۔

نعمان نے آنکھیں کھول دیں۔

اُٹھیے گا نہیں؟

وہ خاموش رہا، آنکھیں پھر بند کر لیں۔ چہرے پر کرب کی لہر دوڑی۔ ایک آہ سی لبوں سے نکلی

وہ پریشان ہو گئی، تڑپ کر بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان —— نعمان —— کیا ہوا —— کیا بات ہے ؟

کچھ نہیں۔

نعمان نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا، چہرے پر کرب کی ایک اور لہر اُبھری پھر ڈوبی جنا نے پھر کہا۔

بتاتے کیوں نہیں، طبیعت کیسی ہے ؟

نعمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دل پر رکھا اور گہری آواز میں بولا۔

جنا، مجھے یہاں شدید درد ہے۔

کب سے ؟

ہلکا ہلکا تو کل ہی ہو رہا تھا، مگر رات سے بہت زیادہ ہے اور اب تو بہت شدید ہو گیا ہے۔

اس نے درد سے بے تاب ہو کر ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

جنا رونے لگی۔

ہائے اللہ، اب کیا کروں، بچے بھی اسکول جا چکے ہیں۔

پگلی۔

نعمان تکلیف کے باوجود ہنس پڑا۔ مگر ایک سسکی سی پھر اس کے لبوں سے نکلی۔

روتی کیوں ہو —— ٹھیک ہو جاؤں گا۔

جنا گھبرا کر اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگی۔

بتائیے بھی، میں کیا کروں؟

تم ذرا ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لو۔ درد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

جنا فوراً کھڑی ہو گئی۔

نعمان نے آنکھیں کھول کر نقاہت بھری آواز میں کہا۔

میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔

تم نہ کھانا، میں کھا لوں گا۔

ڈاکٹر مسکرا دیا۔ مگر جنا ویسے ہی کھڑی رہی۔

جائیے مسز نعمان اور آپ سوپ بنوا لیجئے۔

جنا نے افسردہ سی نگاہ نعمان پر ڈالی۔

انہیں کیا ہوا ہے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے جنا کو ایک طرف لے جا کر آہستہ سے کہا۔ دل کا دورہ معلوم ہوتا ہے، لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

ہائیں۔

گھبرائیے نہیں، بروقت معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے علاج شروع کر دیا ہے۔ انشاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔

جنا سے کھڑے نہ رہا گیا۔ جلدی سے بیٹھ گئی۔

نعمان ——

نعمان نے اس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے انجکشن دیا ہے، گولیاں کھلائی ہیں، پہلے سے ٹھیک ہوں، گھبراؤ نہیں۔

نوکر ٹرالی میں لگا کر ناشتے کا سامان لے آیا۔ ڈاکٹر نے تکیے کے سہارے نعمان کو بٹھایا۔ وہ منع کرتا رہا، مگر ڈاکٹر نے چائے پلوائی، اور پھر نعمان کو لٹا دیا۔

سارے کام بند۔ دفتر میں ٹیلی فون کر دیں مسز نعمان۔ نعمان صاحب ایک مہینہ تک کام نہیں کریں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے پھر کہا۔

ڈاکٹر زیدی کو بلوا لو۔ کل میں نے ان سے درد کا تذکرہ بھی کیا تھا۔

حنا نے فون کر دیا اور آکر پھر نعمان کے پاس بیٹھ گئی۔

چائے لاؤں؟

نہیں۔

نعمان سے پہلو بھی بدلا نہیں جا رہا تھا۔ حنا رو کر بولی۔

نہ جانے کون کون سی فکریں پال رکھی ہیں، کیوں اتنا پریشان رہتے ہیں۔

گھبراؤ نہیں —— میں —— ٹھیک ہو جاؤں گا۔

وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اتنے میں نوکر کے ساتھ ڈاکٹر زیدی کمرے میں بغیر اجازت ہی داخل ہوا اور سیدھا نعمان کے پاس جا کر بولا۔

مجھے پہلے ہی خدشہ تھا، اگر آپ کل دوا استعمال کر لیتے تو اتنا شدید حملہ نہ ہوتا۔

حنا گم سم کھڑی رہ گئی۔

کیسا حملہ —— کاہے کا حملہ؟

سوالات اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے، مگر ڈاکٹر زیدی اس قدر انہماک سے نعمان کے معائنے میں مصروف تھا کہ نگاہ اٹھا کر بھی حنا کی طرف نہ دیکھا۔ معائنہ ختم کر کے اس نے ایک زوردار "ہوں" کی اور حنا کی طرف دیکھ کر بولا۔

انہوں نے اس وقت کیا کھایا؟

کچھ نہیں۔

جلدی سے منگوائیے، چائے منگوائیے ذرا گرم ہو خوب۔

حنا نے گھبرا کر کہا۔

جی اچھا۔

ڈاکٹر اطمینان سے بیٹھ گیا، پھر سوچتا رہا۔ پھر حنا سے مخاطب ہوا۔

مسز نعمان، اس وقت تو معمولی بات ہے، مگر احتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ چند دوائیں ایسی ہیں جن کے استعمال میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی دوائیں کم از کم ایک مہینہ تک کھلائی جائیں گی۔

حنا نے جلدی سے کہا۔

میں سب کچھ کر لوں گی ڈاکٹر۔ آپ بس مجھے دوائیں بتلا دیں، میں دن رات احتیاط کروں گی۔

نہیں مسز نعمان۔ ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔

آپ کے لئے بہت مشکل ہے۔ ان دواؤں کے استعمال سے یا تو ڈاکٹر واقف ہو سکتا ہے یا نرس۔ ایک عام عورت کے لئے بہت ہی مشکل ہے۔

حنا نے مایوسی سے کہا۔

پھر —— ؟

آپ دیکھیں میں ان کو انجکشن نہیں دے رہا۔ صرف کھانے کی دوائیاں ہیں۔ بعض دوائیاں ایسی ہیں جن کی ذرا سی زیادہ مقدار تندرست انسان کے لئے بھی مہلک ہو سکتی ہے۔ کجا بیمار آدمی۔ اگر آپ دونوں کی مرضی ہو تو میں تجویز کرتا ہوں کہ ایک مہینے تک انہیں کسی نرس کی نگرانی میں رکھا جائے۔ اور وقتاً فوقتاً میں معائنہ کرتا رہوں گا۔

حنا نے کہا۔

نرس —— اس کا انتظام کہاں سے ہوگا۔

ڈاکٹر نے کہا۔

نرس کا انتظام میں کروں گا۔ انتہائی محنتی، فرض شناس نرس۔

حنا نے کہا۔

بہت بہت شکریہ ـــــ آپ انتظام کر دیں۔

ڈاکٹر نے نعمان سے پوچھا۔

کیوں نعمان صاحب، آپ کا کیا خیال ہے؟

نعمان نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا اور کمزور آواز میں بولا۔

آپ حنا سے بات کریں ڈاکٹر، جیسا وہ مناسب سمجھے۔

ڈاکٹر نے کہا۔

آپ آرام کریں ـــــ ہاں تو مسز نعمان ذرا میں ہسپتال فون کر لوں۔

حنا نے کہا۔

تشریف لایئے۔

حنا ڈاکٹر کو ٹیلی فون تک لے گئی۔ ڈاکٹر نے نمبر ڈائل کئے۔ سلسلہ مل گیا تو اس نے چپراسی سے کہا۔

شماع کو بلاؤ۔

حنا چونک سی گئی۔ شماع غالباً قریب ہی تھی، فوراً اس کی آواز آئی۔

یس ڈاکٹر۔

بے بی، میں نعمان صاحب کے یہاں ہوں۔ ان کی طبیعت خراب ہے، تم فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ ہاں بس جو سواری ملے ـــ ہاں ـــ بس آ جاؤ۔

ڈاکٹر نے ٹیلی فون بند کر کے حنا کی طرف دیکھا اور بولا۔

اس لڑکی کو آپ بھی جانتی ہیں مسز نعمان۔ میں اسے ایک فرض شناس، محنتی نرس سمجھتا ہوں۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہر نرس کا ملنا بے حد مشکل ہے۔ آپ اس کی رہائش کا بندوبست کریں۔ میں مسٹر نعمان کے پاس جاتا ہوں نرس کے آنے پر ہی لکھوں گا۔ فی الحال میں نے دوا دے دی ہے۔

حنا کو یہ اُمید نہ تھی کہ اس کے ہاں نرس کے روپ میں آنے والی شماع ہو گی۔ ورنہ ممکن ہے وہ منع کر دیتی۔ مگر اب تو سب کچھ ہو چکا تھا۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ آنے والی تھی۔

وہ ـــ

جسے حنا منحوس سمجھتی تھی۔

جس کو اپنی بچی کی خوشیوں کا قاتل سمجھ کر کافی حد تک نفرت کی تھی۔

اور ـــ

وہ آ رہی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آتی تھیں۔

لیکن ـــ

جس کا معصوم چہرہ دیکھ کر اس کا دل نرم بھی ہوا تھا ـــ مگر ـــ پھر بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ شماع اب اس گھر میں آئے۔

مگر وہ آ رہی تھی۔ خود اس کی اجازت سے۔

اور اسے شماع کی رہائش کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ بہت سوچ کر اس نے نعمان کے برابر والے کمرے میں شماع کی رہائش کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے وہ بآسانی اپنے مریض کو دیکھ سکتی تھی اور گھر والوں سے زیادہ سامنا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

شماع آ گئی۔

اس نے حنا کو سلام کیا۔ خاموشی سے ڈاکٹر کی ہدایات سنیں اور صرف ایک بات پر جو ڈاکٹر نے کہی تھی

بیٹی، یہاں تم صرف نرس بن کر آئی ہو، اپنا فرض خوش اسلوبی سے پورا کرنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے فوراً پچھلی ساری باتیں دل سے نکال دیں۔ ورنہ اس کوٹھی کے گیٹ پر اس کے قدم جھک گئے تھے وہ ان سب کی مجرم تھی۔ ان کی خوشیوں کو اجاڑنے والی۔ وہ دل ہی دل میں ان سب سے شرمندہ تھی مگر اس احساس نے کہ وہ ایک مریض کے پاس آئی ہے، اسے اندر دھکیل دیا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے نعمان کی ساری کیفیت سمجھائی، پھر بالکونی کے کونے میں لے جا کر کہا۔

بے بی، اب تم نعمان صاحب کے ٹھیک ہونے تک یہیں رہو گی۔ تم محنتی ہو بے حد اچھی نرس ہو، گھبرانا نہیں۔ میں ڈرائیور کے ہاتھ تمہارا سامان بھجوا دوں گا۔

شعاع نے سوچا۔ اگر میں ڈاکٹر کے ساتھ چلی گئی تو ممکن ہے یہاں واپس آنے پر میرا دل تیار نہ ہو، اس نے کچھ سوچ کر بولی۔

بہت اچھا۔

گڈ گرل۔

ڈاکٹر مڑا۔

سنئے۔

شعاع نے پکارا۔ ڈاکٹر نے پلٹ کر دیکھا۔ عجیب ملتجی آواز میں بولی۔

مجھے بلاتے رہئے گا ہسپتال میں۔

او کے ــــ اب میں چلتا ہوں۔ تم مریض کے کمرے میں چلو۔

ڈاکٹر نے اسے نعمان کی خوراک اور دواؤں کی تفصیل سنائی، کھانے پینے کا زیادہ پرہیز تھا۔ شعاع کو بے حد تعجب ہوا۔ جس مرض کا ذکر تھا، اس میں تو بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ بہر حال یہ سوچنا اس کا کام نہ تھا۔ تجویز ڈاکٹر کی اور عمل نرس کا ہوتا ہے۔ اور شعاع نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔

گھر میں خاموشی دیکھ کر لبنیٰ کو حیرت سی ہوئی۔ ہال کمرے میں آ کر ملازم سے بولی۔

امی کہاں ہیں؟

صاحب کے کمرے میں۔

کیا ابو گھر پر ہیں؟

جی ہاں ــــ ؟

اتنے میں اسے حنا سیڑھیوں سے اترتی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر جو فکرمندی کے آثار تھے انہیں دیکھ کر لبنیٰ نے کتابیں وہیں صوفے پر ڈال دیں۔

امی کیا بات ہے؟

حنا کے آنسو نکل آئے۔

بتائیے بھی کیا ہوا؟ سلیمان تو ٹھیک ہے؟

حنا نے ساڑھی کے آنچل سے چہرہ صاف کیا۔

تمہارے ابو کی طبیعت سخت خراب ہے۔

کیا ہوا؟

لبنیٰ نے حنا کو تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔ اور نعمان کے بارے میں پوچھنے لگی حنا نے بتایا، ڈاکٹر زیدی آئے تھے۔ ہارٹ اٹیک بتاتے ہیں، دوائیاں شروع کر دی ہیں اور ڈاکٹر زیدی نے نرس بھی بھیج دی ہے۔

نرس ــــ ؟ ؟

لبنیٰ نے حیرت سے کہا۔

کیا سیریس کیس ہے؟ ابو جاگ رہے ہیں کیا؟ میں جاؤں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حنا نے کہا۔

نہیں ابھی سوئے ہیں۔ اور جانتی ہو نرس کون ہے؟

کون ہے؟

وہی تمہاری سہیلی، جو یہاں بے ہوش ہو گئی تھی۔

شعاع۔

لبنیٰ کے لبوں سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

وہ ——— وہ کب سے نرس بن گئی۔

عجیب سرد سا لہجہ تھا اس کا

حنا نے کہا۔

وہ تو ڈاکٹر زبیری کے ہسپتال میں کام کرتی ہے۔ کل ہم سلیمان کو لے گئے تھے تو وہاں دیکھا تھا

لبنیٰ نے کہا۔

مگر اسے کیوں بلایا گیا ہے؟

ڈاکٹر نے کہا تھا تمہارے ابو کی دیکھ بھال کے لئے نرس ہونی چاہیے۔ میں رضا مند ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ نرس شعاع ہے، ورنہ منع کر دیتی۔

لبنیٰ نے پوچھا۔

کیا آ گئی وہ؟

ہاں بہت دیر ہوئی، ساتھ والے کمرے میں ٹھہرایا ہے میں نے اُسے۔

کیا وہ رہے گی بھی یہیں؟

ہاں۔

اوہ

لبنیٰ نے کتابیں اٹھا کر اپنے کمرے کا رُخ کیا تو حنا نے کہا۔

اپنے ابو کو دیکھنے نہ جاؤ گی۔

چلی جاؤں گی، ابھی تو سو رہے ہیں۔

لبنیٰ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حنا کے دل کو دھچکا سا لگا۔ باپ کی بیماری کا سن کر بھی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے تو چاہیے تھا لپک کر باپ کو دیکھنے جاتی، خواہ وہ سو ہی رہے تھے۔ دیکھ تو آتی۔

پھر اس کا دھیان فوراً شعاع کی طرف چلا گیا۔

یہ لڑکی جب بھی اس گھر میں آتی ہے، کوئی نہ کوئی انہونی بات ضرور ہو جاتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔

حنا نے دل میں سوچا اور خاموشی سے نعمان کے کمرے کی طرف چل دی۔ جہاں شعاع سفید کپڑوں میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور نعمان سو رہا تھا۔ آہٹ پر شعاع نے سر اٹھا کر دیکھا اور حنا کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

بیٹھو، بیٹھو، تمہیں بار بار کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔

حنا کے لہجے میں خواہ مخواہ نرمی آ گئی۔

شعاع بیٹھ گئی۔

حنا بھی نعمان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ اور شعاع کو دیکھنے لگی۔ عجیب بات تھی۔ حنا اس کی غیر موجودگی میں اس کے نام سے جو ناگواری محسوس کرتی تھی، پاس آکر اس کا دل نرم ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی خواہ مخواہ بول اُٹھی۔

شعاع، تم سفید کپڑے نہ پہنا کرو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

حنا خاموش ہو گئی۔ نعمان اٹھ گیا تھا۔ شعاع نے اٹھ کر شیشی میں سے گولیاں نکالیں۔ نعمان نے ایک نظر اس پر ڈالی، پھر مسکرا کر حنا سے کہا۔

چائے بنواؤ حنا۔

جی بہت اچھا مگر زیادہ چائے ۔

شعاع نے کہا۔

کوئی ہرج نہیں چائے دی جاسکتی ہے۔

حنا کا اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر اٹھنا پڑا۔ واپس آئی تو نعمان دوائی کھا چکا تھا۔

اب کس وقت دوائی دینی ہے؟"

حنا نے شعاع سے پوچھا۔

آدھ گھنٹے بعد۔

ٹھیک ہے۔

اس کا ٹھیک ہے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ شعاع خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی حنا تنہائی چاہتی ہے۔ بیس پچیس منٹ وہ بالکونی کے کنارے پر کھڑی بڑی کھڑکی سے لان کی طرف دیکھتی رہی سوچتی رہی۔

یہ قسمت کیا چیز ہے۔

بنانے والے نے میرے دن رات بس اتنے چکر کیوں بنا دیئے ہیں۔

کیا میں ہمیشہ اسی طرح بھٹکتی رہوں گی۔

تنہا۔

اندھیری راہوں میں۔

اسی لمحے نہ جانے کہاں سے آکر ایک چہرہ اس کے ذہن میں چمکا۔

سہیل ——

وہ چونک گئی۔

سہیل، میں نے تمہیں کبھی بھی اپنے دل میں بسانے کی کوشش نہیں کی، تم بار بار میری راہوں میں آئے۔ مگر میں نے راستہ بدل لیا۔ میں نے تمہیں کبھی اس روپ میں نہیں دیکھا۔

مگر ——

سہیل، نہ جانے اب کیا بات ہو گئی ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں، تم مجھے پہلے لگتے ہو، ہاں تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میں دکھوں سے گھبرا کر جب کسی انجانے ہمدرد کو ڈھونڈتی ہوں تو مجھے تمہاری ہی یاد آتی ہے۔ تم —— تم ہی دکھائی دیتے ہو۔

اتنے میں کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ چونک گئی۔

حنا نے کہا۔

شعاع، نعمان کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔

نعمان ——

شعاع چونک گئی۔ کتنا بھلا نام تھا۔ کاش، اس کا بھی باپ موجود ہوتا۔ اسی نعمان کی طرح شفقت اور محبت لئے —— ایک ہی نام کے دو آدمیوں کے مختلف روپ۔

ایک یہ نعمان ہے بچوں سے محبت کرنے والا۔ اپنے گھر کا سربراہ۔ جس کی بیماری نے ہنستے کھیلتے گھر میں اداسی کے سائے پھیلا دیئے ہیں۔

اور ——

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک میرا باپ تھا ـــــ نعمان
جس نے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔ اور خود کہیں دُور اپنی دنیا بسا بیٹھا ہے۔
انہی خیالوں میں وہ نعمان کے کمرے میں آگئی۔ حِنا نیچے چلی گئی۔ شعاع نے گولیاں نکال کر دیں۔ اور جب پانی کا گلاس تھمایا، تو وہ پانی پی گیا۔

گولیاں بھی کھایئے۔

نعمان مسکرا دیا۔

کھا لوں گا۔

نہیں، ابھی کھایئے۔

تمہارا کام مجھے گولیاں پکڑانا ہے، باقی میں کھاؤں نہ کھاؤں۔

مسٹر نعمان: مَیں ڈاکٹر سے کہہ دوں گی۔

ڈاکٹر سے نہ کہئے گا۔ میں کھا لیتا ہوں۔

نعمان نے ساری گولیوں کو مٹھی میں دبا کر منہ میں ڈالا اور پانی پی گیا۔ شعاع کو شک تھا کہ نعمان نے گولیاں نہیں کھائیں ـــــ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ نعمان ہنس دیا۔

جاؤ پگلی لڑکی۔ مَیں نے دوا کھا لی ہے۔ اب بیٹھو۔

حِنا اندر آئی۔ اس کے ساتھ لبنیٰ بھی تھی۔ لبنیٰ کو دیکھ کر شعاع اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اسے بے حد دکھ ہوا۔ لبنیٰ نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ نعمان سے بولی۔

اب کیسی طبیعت ہے ابّو۔

ٹھیک ہوں ـــــ تم کہاں تھیں ؟

آپ سو رہے تھے نا اس لئے اب آئی ہوں۔

باپ بیٹی باتیں کرنے لگے۔ لبنیٰ نے شعاع کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ نعمان نے یہ بات محسوس کی مگر اس کا تذکرہ کرنا مصلحت نہ تھی۔ خاموش رہا ـــــ شعاع پھر وہیں بالکونی میں کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

لبنیٰ اور حِنا دونوں نے محسوس کیا کہ نعمان کے چہرے پر بیماری کی پژمردگی کے بجائے بشاشت کا گلابی پن ہے ـــــ لیکن ہر بدلتے لمحے وہ کسی سوچ میں ڈوب جاتے تھے تو چہرے پر زردی جھلکنے لگتی تھی۔

نعمان کا علاج جاری تھا۔ حِنا راتوں کو اٹھ اٹھ کر نعمان کے کمرے میں آتی۔ نعمان میٹھی نیند سو رہے ہوتے، لیکن شعاع کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی کتاب یا رسالہ لئے اور قریب ٹائم پیس رکھے ملتی۔ حِنا جو پہلے شعاع کو دیکھ کر کڑھنے لگتی تھی اب نرم ہو چلی تھی اور اسے اس معصوم صورت لڑکی پر رحم آنے لگا تھا، اس کا سہاگ سامنے بستر پر بیمار لیٹا تھا اور یہ لڑکی اس کے سہاگ کی تیمارداری، اس کے سہاگ کو بچانے میں پوری تندہی سے مگن تھی۔

شعاع کو اس گھر میں آئے تین دن ہو چکے تھے اور تین دنوں میں رات یا دن کے کسی حصے میں اس نے پل بھر کے لئے آنکھ نہ جھپکی تھی۔ چوتھی رات جب رات کے دو بجے کے قریب حِنا نعمان کے کمرے میں آئی تو شعاع کرسی پر بیٹھی جاگ رہی تھی۔ حِنا کے دل میں اس لڑکی کے لئے کئی جذبے ایک ساتھ اُبھرے۔

شعاع ـــ

جی ـــ

اور شعاع کھڑی ہو گئی۔

نہیں شعاع، تم بیٹھو۔ مَیں تو صرف یہ کہنے آئی تھی کہ اگر تم اسی طرح جاگتی رہی تو تمہاری صحت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خراب ہو جائے گی۔ اَب بھی مسلسل جاگنے کی وجہ سے تمہاری آنکھیں نیند کے مارے پھٹی پڑ رہی ہیں۔ اَب تم جاؤ اور جاکر سو جاؤ۔ مَیں ان کے پاس بیٹھتی ہوں۔

شعاع نے کہا۔

نہیں مسز نعمان، مَیں ایک نرس ہوں، میرا کام جاگنا، وقت پر دوائی دینا اور انسانیت کی خدمت کرنا ہے، مجھے اپنی ڈیوٹی انجام دینے دیں۔

اور وہ کہتی رہی۔

پھر یہ تو میری خوش قسمتی بھی ہے کہ مجھے جس شخص کی خدمت کا فرض سونپا گیا ہے وہ میری لبنیٰ کا باپ ہے، ایک شفیق باپ، مجھ پر تو ویسے بھی ان کی خدمت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ جیسے یہ لبنیٰ کے باپ ہیں ویسے ہی میرے ہیں۔ مَیں تو ان کی خدمت کرتے ہوئے ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں اپنے باپ کی خدمت کر رہی ہوں۔

نعمان جاگ رہا تھا اور آنکھیں بند کئے حِنا اور شعاع کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہہ دے کہ ہاں میں تمہارا باپ ہوں، تم اپنے باپ کی خدمت کر رہی ہو، تم اپنے باپ کی دیکھ بھال میں لگی ہو

مگر ــــ

وہ کچھ نہ کہہ سکا، پیار کے دو بول بھی نہ دے سکا۔ ہاں دل ہی دل میں خوشیاں چھپائے لیٹا رہا۔ اس کی بیٹی اس کی شعاع، اس کے پاس تھی۔ اس سے زیادہ خوشی کا کوئی مقام نہ ہو سکتا تھا۔ اِدھر حِنا عجیب سوچوں میں گم تھی۔ اور شعاع کا موازنہ لبنیٰ سے کر رہی تھی۔

لبنیٰ جانتی ہے کہ باپ دل کے دورے میں پڑا ہوا ہے، زندگی اور موت کا سوال ہے اور وہ پچھلے تین دنوں میں رسماً دوبارا نہیں دیکھنے آئی ہے۔ جب کہ یہ لڑکی، جو کہ نعمان کی بیٹی بھی نہیں، بیٹیوں کی طرح ان کی خدمت میں مگن ہے، ایک لمحے کو حِنا کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کاش ــــ! لبنیٰ کے ساتھ ساتھ یہ لڑکی بھی

ہماری بیٹی ہوتی۔

پھر ایک خیال اور ذہن میں آیا کہ یہ اتنی دکھی لڑکی ہے کیوں نہ میں نعمان کے صحت یاب ہونے پر اس سے کہوں کہ اسے روک لیں، اسے اپنی بیٹی بنا کر گھر میں رکھ لیں۔

پھر اس نے ذہن کو جھٹکا دیا۔

نہیں نہیں یہ منحوس ہے ــــ یہ منحوس ہے۔

یہ منحوس نہیں ہو سکتی، کسی کا سہاگ قائم رکھنے والی لڑکی، کسی کے سہاگ کی حفاظت کرنے والی لڑکی منحوس نہیں ہو سکتی ــــ وہ ایک حادثہ تو اتفاقی حادثہ تھا۔ نعمان کی طبیعت یک لخت خراب ہو سکتی ہے تو اس لڑکی کی بھی ہو سکتی تھی۔

اور ــــ

حِنا نے تہیہ کر لیا کہ نعمان کی صحت یابی کے بعد ان سے کہہ دے گی کہ مَیں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا، آج یہ معصوم لڑکی مانگتی ہوں۔

لبنیٰ تمہاری بیٹی ہے۔

اور ــــ

شعاع میری

اس خیال کے آتے ہی حِنا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان کی بیماری کی خبر تمام رشتہ داروں اور دوستوں کو ہو چکی تھی، جو بھی سنتا مزاج پرسی کو آتا۔ ایک شام شجاع نعمان کو دوا کھلانے کے بعد عادت کے مطابق بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ بالکونی کی منڈیر پر کہنیاں ٹیکے خیالوں میں گم بظاہر باہر کے نظارے میں محو تھی کہ اس نے کار رکنے کی آواز سنی۔

شجاع نے غیر ارادی طور پر جھانک کر دیکھا۔ حق صاحب، بیگم حق اور سہیل کار سے اتر رہے تھے۔ شجاع کی نظر سہیل پر پڑی تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ مگر سرمئی سوٹ میں ملبوس سہیل جیسے اس کی نگاہ میں اتر کر ہی رہ گیا تھا اور وہ گویا اسے عالمِ تصور میں دیکھ سکتی تھی۔ ایک پل پہلے کے پریشان خیالات نہ جانے کہاں جا سوئے تھے۔ اب وہاں خوشی کی نامحسوس سی لہریں تھیں۔ اس کے سوچنے کا انداز بھی اب بدل سا گیا تھا۔ سہیل اب اسے برا نہیں لگتا تھا۔ گو برا تو پہلے بھی کبھی نہیں لگا تھا۔ مگر پہلے وہ کبھی اس بات پر آمادہ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کسی شخص خصوصاً مرد کو دل میں جگہ دے، مگر غیر متوقع طور پر سہیل کو دل میں بسا چکی تھی۔

اس تنہائی اور اداسی میں سہیل کو اچانک دیکھ کر وہ اداسی بھول گئی۔ اس کا معصوم دل آج عجیب انداز
ے دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جھانک کر دیکھا، وہ لوگ اندر آ چکے تھے۔
باہر خاموشی تھی۔ شجاع مسکرا دی۔ سڑک پر ایک ٹرک نکلا چلا گیا جس پر رنگین کرسیاں اور قناتیں
لدی ہوئی تھیں۔ شجاع کی نظروں نے اس ٹرک کا تعاقب کیا مگر ذہن بہت دور پیچھے بھاگتا چلا گیا۔
مسز فاروقی کے ہاں سے وہ بچیوں کو پڑھا کر نکلی تو وہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی اور اسی عالم میں اس
نے پہلی بار سہیل کو دیکھا۔ دوبارہ وہ مسز فاروقی کے گھر میں نظر آیا۔ مگر شجاع کو تو مردوں سے اس حد تک نفرت
تھی کہ ان کے سائے سے بھی بچ کر نکلنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس عالم میں وہ ایک نوجوان مرد کو نفرت
کی نگاہ سے بھی دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اسے محسوس ہوئے بغیر وہ اس کے خیالوں میں
جگہ پانے لگا۔

شجاع گم سم کھڑی سوچ رہی تھی۔ اسے لبنیٰ کی منگنی کا دن یاد آ گیا۔ جب اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا
کہ وہ سہیل کو کچھ اہمیت دیتی ہے۔ دکھ کا وہ احساس اب تک فراموش نہ کر سکی تھی جو سہیل کو دولہا کے
روپ میں دیکھ کر ہوا تھا۔ اسے اپنی بے ہوشی، لبنیٰ کی منگنی کا ملتوی ہو جانا بھی یاد تھا۔ وہ ان سب
کی خوشیوں کی قاتل تھی۔ جبھی تو وہ اس کے بعد لبنیٰ سے اچھی طرح نہ مل سکی تھی۔ اپنی بیماری اور علاج کی
باتیں اسے یکے بعد دیگرے یاد آتی رہیں۔ ایسے میں اسے غزالہ کا ملنا اور گھر لے جانا بھی یاد آیا۔ سہیل کی
راستے میں ملاقات بھی یاد آئی، پھر نرس کی حیثیت سے نعمان کے گھر آنا، اب وہ نعمان کے گھر میں تھی۔
اس نے ایک سرد آہ بھری اور آسمان کی لامحدود وسعت کی طرف دیکھ کر سوچا۔
حالات مجھے کہاں سے کہاں لیے پھرے اور اب کہاں لے آئے ہیں اور سہیل تم میرے ساتھ ساتھ
چل رہے ہو۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں، تم میرے ساتھ ساتھ جاتے ہو۔
کیوں میرے ساتھ ساتھ آتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری منزل ہے بے نشاں ناداں۔

ساتھ میرا تیرا کہاں۔

کیا ہونے والا ہے؟

کیا ہوگا؟

وہ سوچتی رہی۔

کیا انسان کی زندگی میں ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے یا آسمان کو خوشیوں کے ساتھ دشمنی ہے۔ یہ تقدیر کیوں مجھے سکون سے رہنے نہیں دیتی۔ میں ماں باپ، بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہوں۔ سبھی موجود ہیں مگر بے سہارا ہوں۔

اس کا ذہن ایک بار پھر سہیل کے تصور کی طرف مڑا۔

ہاں ایک سہارا ایسا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ زندگی کے ہر مقام پر، ہر موڑ پر وہ اُن ملتا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس سہارے کی طرف بڑھنے سے گریز کیا۔

اس نے سوچا۔

مجھے بھی سہارے کی ضرورت ہے اور جب یہ سہارے میری طرف بڑھ رہے ہیں، تو کیوں نہ بڑھ کر میں ان کو تھام لوں۔

وہ بہت دیر تک کھڑی سوچتی رہی، اس نے سوچا۔ اگر اب سہیل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ تھام لے گی۔ وہ اسے بتا دے گی کہ وہ ہی نہیں، اسے چاہتا وہ بھی اسے چاہتی ہے۔

سڑک پر لگے کھمبے کا بلب جل اٹھا تو شعاع بھی خیالوں کی دنیا سے نکلی۔ اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ نعمان کی دوا کا وقت ہونے کو تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں مڑی اور نعمان کے کمرے میں داخل ہوگئی اس کے قدم وہیں رک گئے۔ باتیں کرتے کرتے لوگ خاموش ہوگئے۔ بیگم حق اور سہیل نے نمایاں تعجب

سے اس کی طرف دیکھا۔ لبنیٰ کے ماتھے پر ناگواری کی واضح لکیریں پڑ گئیں۔ شعاع نے گھبرا کر سلام کیا جس کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ واپس پلٹ جانا چاہتی تھی کہ نعمان نے کہا۔

آؤ بیٹی، یہاں بیٹھو۔

وہ اندر آگئی۔ نعمان نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک نگاہ سہیل کے چہرے پر ڈالی اور مسکرا کر بولا۔

"حق صاحب، یہ شعاع ہے ہماری بیٹی ہی سمجھئے اسے بھی۔ اور شعاع بیٹی، یہ حق صاحب میرے دوست ہیں، یہ ان کی بیگم، اور یہ ان کے صاحبزادے سہیل۔

شعاع نے باری باری سب کو سلام کیا۔ سہیل کا چہرہ دبے ہوئے جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی چاہت اس کے سامنے تھی۔ اور وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

بیگم حق نے دو ایک بار اسے غور سے دیکھا پھر لبنیٰ سے دبے لہجے میں پوچھنے لگی۔

یہ کون لڑکی ہے؟

نرس ہے۔ لبنیٰ کے لہجے میں حقارت تھی۔

شعاع کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اتنی محبت کرنے والی سہیل نے کتنی حقارت سے اسے نرس کہا تھا۔

بیگم حق نے کہا۔

اسے میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں۔

ہمارے ہاں ہی دیکھا ہوگا آپ نے۔

کیا یہ پہلے بھی تمہارے ہاں آتی رہی ہے؟

جی ہاں، یہ میرے ساتھ پڑھتی تھی اور ہمارے ہاں کئی تقریبوں میں آچکی ہے۔ نرس تو اب بنی ہے

ارے یہ تو وہی لڑکی ہے جو منگنی پر بے ہوش ہوگئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی ہاں، وہی ہے۔

اب بنیٰ کے ساتھ ساتھ بیگم حق کے چہرے پر بھی حقارت اور ناگواری تھی۔ بیگم حق نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا، پھر سہیل کی طرف گھورا۔ مگر انہیں دونوں کے انداز سے ہی کوئی بات نہ محسوس ہوئی نعمان حق صاحب سے باتیں کر رہے تھے اور شعاع ان کی دوا تیار کر رہی تھی۔

دوا کھا لیجئے۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ نعمان نے مسکرا کر اس کے اداس چہرے کی طرف دیکھا اور بشاش لہجے میں کہا۔

آج کی چھٹی دے دو۔

شعاع نے گھبرا کر دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔ لبنیٰ نے "اُوں" کہہ کر منہ پھیر لیا۔

سہیل مسکرا دیا۔ شعاع کو محسوس ہوا جیسے سب لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کا روہانسا چہرہ دیکھ کر نعمان نے کہا۔

اچھا بھئی لاؤ دوا۔ حق صاحب اگر دوا نہ کھاؤں تو یہ لڑکی ڈاکٹر سے شکایت کر دیتی ہے۔

شعاع دوا کھلا کر فوراً باہر نکل گئی۔ یہ اس نے دیکھ لیا کہ بنیٰ اور سہیل آپس میں باتیں تو کر رہے تھے مگر سہیل کی تمام تر توجہ اسی کی طرف تھی۔

وہ بالکونی میں پھر جا کھڑی ہوئی۔ کچھ وقت پہلے کے احساسات پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے سہارے اس کی قسمت میں نہ تھے، وہ تنہا تھی۔ اسے تنہا ہی رہنا تھا۔ درخت پر سے سوکھا پتہ ٹوٹا اور ہوا کا معمولی جھونکا اسے اڑا کر کہیں کا کہیں لے گیا۔ شعاع نے اُس اُڑتے پتے کو دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک سوکھا پتہ ہے اور تقدیر کی ہوا کا جھونکا اسے اُڑائے پھر رہا ہے۔

آہ! وہ شعاع جو عزم و ہمت کی پیکر تھی، جو رونا یا تقدیر کا گلہ کرنا جانتی ہی نہ تھی، جو پتھر کی طرح مضبوط

تھی، وہ اندر سے اس قدر ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ وہ جو مایوس ہونا جانتی ہی نہ تھی آج ایک پتے سے خود کو تشبیہ دے رہی تھی۔ وہ مایوس ہو گئی تھی۔ اسے دکھوں نے شکست دے دی مگر اس نے ابھی پوری طرح ہار نہ مانی تھی۔ مگر اب اس کی آنکھوں میں عزم کی مقناطیسی چمک نہ تھی۔ وہاں تو اب بے نام سی اداسی کے ڈیرے تھے۔ شاید اسی لئے وہ اب کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اعتراف کر لیا۔

ہاں وہ سہیل کو پسند کرتی تھی، اس سے محبت کرتی تھی۔

مگر ابھی چند لمحے پہلے کیا گیا یہ فیصلہ کہ وہ اب سہیل کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لے گی، اب ختم ہو گیا تھا۔

وہ اب صرف شعاع یعنی لبنیٰ کی دوست اور کلاس فیلو ہی نہ تھی بلکہ ایک نرس بھی تھی۔

جب وہ صرف شعاع تھی، اس وقت بھی وہ لبنیٰ کی خوشیوں کے پھول اجاڑ کر اپنا گھر مہکانے کو تیار نہ تھی۔ اس کی منگنی کے ملتوی ہونے پر وہ اب تک شرمندہ تھی، ابھی تو وہ اس دیئے ہوئے دکھ کی تلافی نہ کر سکی تھی۔ نیا دکھ کیسے دے دیتی۔ لبنیٰ چاہے اس سے ناراض تھی، نفرت کرتی تھی، جب سے وہ نرس کے روپ میں اس گھر میں آئی تھی، لبنیٰ نے اس سے بات تک نہ کی تھی۔ اس کے باوجود وہ لبنیٰ کو چاہتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے لبنیٰ اسے چاہتی تھی مگر وہ لبنیٰ سے بچتی تھی، اور اب وہ لبنیٰ کو چاہتی تھی اور لبنیٰ اس سے نفرت کرتی تھی۔

شعاع جانتی تھی کہ جس دن اس نے سہیل کی محبت کا جواب ہاں میں دیا۔ دنیا کی کوئی طاقت سہیل کو اس سے دور نہ کر سکے گی۔ پھر اسے نعمان اور حنا کا خیال آ گیا۔ دونوں میاں بیوی اسے اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ حنا کے دل میں اس نے گھر کر لیا تھا اور ان دونوں کے حسن سلوک نے شعاع کے دل میں ان کی محبت بڑھا دی تھی۔ اب وہ نعمان کو صرف سیٹھ نعمان نہیں سمجھتی تھی، اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک مخلص اور نیک آدمی سمجھتی تھی۔ اب وہ نعمان کی بے حد عزت کرتی تھی۔ اسے ایک گھریلو ماحول ملا تھا اور وہ اس گھریلو محبت بھرے گرم ماحول سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کاش! وہ بھی اس طرح اپنے والدین کے ساتھ خوش خوش رہتی، ہر غم فکر سے آزاد۔ مگر وہ نرس بن گئی۔ اس کی تیمار داری نے ایک مریض کو صحت بخشی تھی۔ نعمان کی صحت یابی نے اس گھر میں خوشیاں بکھیر دی تھیں۔ پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ اس شخص کو دکھ دے، جو اسے باپ کی سی محبت سے دیکھتا ہے۔ اس عورت کے دل کو کیونکر ٹھیس پہنچائے۔ جس نے ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح اس کا خیال رکھا تھا اور پھر لبنیٰ۔

اس کی عزیز سہیلی جس کے دل کو پہلے ہی ٹھیس لگ چکی ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ جس گھر میں وہ نرس بن کر مسیحائی کو آئی ہے۔ وہاں مسیحائی ہی کرے گی نرس کا کام زخموں پر مرہم رکھنا ہے نا کہ زخم کریدنا، وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جس کی وجہ سے اس خاندان کو کوئی صدمہ پہنچے۔

ہاں میں سہیل کا محبت سے بڑھا ہوا ہاتھ ٹھکرا دوں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ سہیل صرف لبنیٰ کا ہے اور اسی کا رہے گا۔

میں اپنے دل کی آواز دل ہی میں چھپا لوں گی، یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ مردوں سے نفرت کرنے والی شجاع ایک مرد کی محبت کے آگے ٹوٹ پھوٹ گئی، پگھل گئی۔

شجاع نے فیصلہ کر لیا تھا۔ نعمان اور حنا کے احسانات اور نرس کے فرائض سب نے مل کر اسے پھر سے پرانی شجاع بنا دیا۔ وہ سڑک کی طرف تک رہی تھی کہ دبے قدموں سے سہیل اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ شجاع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں ایسی وحشت اور سناٹا تھا جیسے کوئی بستی تباہ ہو گئی ہو۔ سہیل کا مسکراتا دمکتا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ

کہہ سکے کچھ سمجھ سکے۔ شجاع مڑی اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

سہیل چند لمحے ہکا بکا کھڑا اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں اس کی شجاع کا زرد چہرہ غروب ہو گیا تھا۔ اسی لمحے لبنیٰ نے کمرے سے باہر جھانکا سہیل تنہا کھڑا تھا۔ لبنیٰ نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر وہ دونوں کمرے میں واپس آ گئے۔ یہ جانے بغیر کہ بند کمرے میں ایک کمزور تنہا سی لڑکی بڑی بہادری سے اپنے آپ سے لڑے جا رہی ہے۔ بڑی ہمت سے دل کا مقابلہ کر رہی ہے، مگر اب وہ لڑتے لڑتے تھک سی گئی تھی مگر ہار نہیں مان رہی تھی۔

نعمان شجاع کے جانے کے بعد اداس سا ہو گیا تھا۔ اسے لبنیٰ کا رویہ بُری طرح محسوس ہو رہا تھا اس نے سہیل کا اٹھ کر جانا بھی دیکھا تھا۔ لبنیٰ کی بے چینی بھی دیکھی، اور دونوں کے واپس آنے پر سہیل کا اداس اور بجھا سا چہرہ دیکھا۔

ان سب باتوں نے مل کر نعمان کی طبیعت پر بُرا اثر ڈالا اور وہ نڈھال سا ہو کر لیٹ گیا۔

حنا کھانے کی تیاری کر کے کمرے میں آئی تو فضا عجیب سی تھی۔ بیگم حق لبنیٰ سے دبی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ حق صاحب اور سہیل خاموش بیٹھے رسالے دیکھ رہے تھے اور نعمان اداس اترے ہوئے چہرے کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ حنا کا دل دھک سے رہ گیا۔ جب وہ نیچے گئی تھی تو نعمان ہنس ہنس کر حق صاحب سے باتیں کر رہا تھا، مگر اب، وہ گھبرا کر نعمان کے پاس گئی۔

دوا کھا لی آپ نے؟

ہاں۔

شجاع آئی تھی؟

ہاں آئی تھی۔

طبیعت کیسی ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک نہیں ہے۔

ڈاکٹر کو فون کروں؟

نہیں، ذرا آرام کروں گا، تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔

حق صاحب نے بھی بڑھ کر طبیعت پوچھی، پھر نعمان کی بدلتی کیفیت دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

چلیے بیگم۔

بیگم حق بھی اٹھ کھڑی ہوئیں، مگر حِنا نے کہا۔

کھانا تیار ہے کھا کر جائیے گا۔

سب لوگ کھانا کھانے کے لئے نیچے چلے گئے۔ دوا کا وقت ہونے کو تھا۔ نعمان کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت شعاع کمرے میں داخل ہوئی۔ اسی طرح سنجیدہ، اسی طرح مضبوط قدموں سے جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ مگر باپ کی گہری نگاہ نے اس پرسکون چہرے کے نیچے چھپے ہوئے طوفان کو دیکھ لیا تھا۔

شعاع کے جانے کے بعد وہ تنہا پڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی مناسب موقع پر حق صاحب اور بیگم حق سے شعاع کے لئے سہیل کو مانگ لے گا۔ کسی بھی طرح۔ اگر اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ شعاع اس کی بیٹی ہے تو بتا دے گا۔ ورنہ خاموشی سے وہ ناشاد، نامراد بیٹی کے دامن میں خوشیاں بھر دے گا۔ باپ کا فرض اب پورا کرنے کا وقت آ رہا تھا۔ وہ ضرور حق صاحب سے بات کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد نعمان کا دل پرسکون ہو گیا۔

سب لوگ کھانے کے بعد اس کے کمرے میں آئے تو وہ مطمئن تھا اور کوئی نہ جان سکا کہ اس قلیل وقت میں وہ کتنا اہم فیصلہ کر چکا ہے۔

تم عجیب عورت ہو، تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اسے روک لیتیں۔

وہ اپنی مرضی کی مالک ہے، میں کیسے روک لیتی۔

ہاں ہاں، تم تو باتیں ہی بنا سکتی ہو۔

آپ کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟

غزالہ نے ننھے کو اٹھایا اور منہ دھلانے غسل خانے میں چلی گئی۔ افتخار کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا اسے تیز نگاہوں سے تکتا رہا۔ غزالہ کا خیال تھا وہ غسل خانے سے نکلے گی تو افتخار کا غصہ ہلکا پڑ گیا ہو گا۔ مگر جونہی وہ کمرے میں پہنچی وہ دھاڑا۔

تمہارا کیا خیال ہے میں بکواس کرتا ہوں۔

ایں ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیرت سے غزالہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ افتخار کا منہ تکنے لگی، وہ پھر بولا۔

تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ اُٹھ کر چلی گئیں۔

بچے کا منہ دُھلانے گئی تھی۔

نخے کا منہ نہیں دھلانے نہیں بدتمیز شاہزادی کا غم چھپانے۔

اس بدنصیب کا کیا غم کروں گی۔

واہ وا، اتنا ہی افسوس ہے اس کی بدنصیبی پر تو اسے جانے ہی کیوں دیا۔

غزالہ خاموش رہی، وہ اب تک نعمان کی نرم طبیعت کو فراموش نہ کر سکی تھی، جب بھی بگڑتا، اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کرتا۔ ایسے وقت میں وہ افسردہ ہو جاتی، اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی ملال کی معمولی شکن دیکھ کر نعمان تڑپ اُٹھتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہی نہیں عزت بھی تھی۔ افتخار کی باتیں سُن کر اس کا دل بھر آیا۔ لاکھ چھپانے کی کوشش کی مگر افتخار نے دیکھ لیا۔

ٹسوے کیوں بہا رہی ہو، ابھی تو میں نے کچھ کہا نہیں ہے۔

تو کہہ لیجئے۔

فضول باتیں مت کرو، جب تمہیں معلوم تھا کہ میں اس کی شادی نعیم سے کرنا چاہتا ہوں پھر تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ یہ ضرور اس بڑھیا کی شرارت ہو گی۔ اس نے سکھایا ہو گا لڑکی کو۔

دروازے سے کان لگائے کھڑی میمونہ بیگم کا خون کھول اٹھا۔ وہ دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی تھی۔

میں نے کسی کو نہیں سکھایا۔ افتخار نے اسے گھورا۔

تم کیوں آئی ہو۔

تمہاری فضول باتوں کا جواب دینے۔

لو سن لو، تمہاری والدہ محترمہ چھپ کر باتیں بھی سنتی ہیں۔

میمونہ بیگم شرمندہ ہو گئیں۔

افتخار نے حقارت سے کہا۔

جاؤ مائی جاؤ، ورنہ تم بھی مجھ سے کچھ سن لو گی۔

میمونہ بیگم کا جی چاہا اس کا منہ نوچ لیں۔ انہوں نے غزالہ کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

امی یہ غلط بات ہے، میاں بیوی کے جھگڑے میں آپ کو دخل نہ دینا چاہیئے جائیں آپ یہاں سے۔

میمونہ بیگم چپکے سے باہر نکل گئیں، ان کا جی چاہتا تھا اپنا سر پیٹ لیں۔

افتخار نے کہا۔

ان بڑی بی کو یہاں سے چلتا کرو جی، مجھے اس کی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔

کہاں چلتا کروں انہیں۔

افتخار نے کہا۔

میں نہیں جانتا اور کان کھول کر سن لو، میں نعیم سے وعدہ کر چکا ہوں، لڑکی کو جیسے بھی ممکن ہو لے کر آؤ۔

میں کہاں سے لے آؤں لڑکی کو۔

کہیں سے بھی لاؤ، اور اگر نہ لا سکو تو یہاں سے چلی جاؤ اور کبھی اس گھر میں واپس نہ آنا، اگر واپس آؤ تو شعاع کے ساتھ آنا، ورنہ بغیر لڑکی کے گھر میں قدم رکھا تو دھکے دے کر نکال دوں گا۔

میں نعیم کی جائداد ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا، سمجھ لیں . . . . . میں بہت برا سلوک کروں گا۔

پھر خود سے بولے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر مجھے اس بدتمیز چھوکری کا پتہ مل جائے تو چوٹی پکڑ کر لے آؤں۔

افتخار تو چلا گیا، مگر غزالہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔

اب وہ دل ہی دل میں شجاع کو گالیاں دے رہی تھی، نعمان کو کوس رہی تھی۔ ایسے میں میمونہ بیگم آگئیں تو غزالہ نے ان پر غصہ اُتارا۔

کیا تماشہ دیکھنے آئی ہیں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

تمہیں نے سر چڑھا رکھا ہے، صاف جواب دے دیا کرو۔

غزالہ بیگم نے جل کر کہا۔

کبھی آپ ہی جواب دے کر دیکھ لیں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

کیسا خاموش طبیعت کا تھا نعمان، یہ مُوا تو جنگلی ہے۔

غزالہ نے کہا۔

جی ہاں جب وہ بُرا لگتا تھا، میرا گھر بگاڑ دیا، اب وہ اچھا لگتا ہے۔

تو نہ اجاڑا ہوتا۔

آپ ہی کی وجہ سے یہ ہوا۔

مَیں تو ہوں ہی بُری، تم نے ہی عقل سے کام لیا ہوتا۔

غزالہ نے سر تھام لیا۔

بس آپ جائیے یہاں سے۔

جاتی ہوں، اب تو وہ تمہیں جوتے بھی مارے تو نہ آؤں گی۔

ہاں ہاں، نہ آئیے گا، جائیے۔

میمونہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ غزالہ نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی۔

کیا ہوگا پروردگار۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ ڈاکٹر زیدی کے کلینک میں جا اُتری۔

سُنو۔

اس نے اشارے سے وارڈ بوائے کو بلایا۔

ڈاکٹر صاحب ہیں۔

جی نہیں مریض دیکھنے گئے ہیں۔

کب تک آئیں گے۔

اندر نرس بیٹھی ہے اس سے معلوم کر لیں۔

غزالہ نے رکشے والے کو پیسے دیئے اور پھر ساڑھی کا پلّو سنبھالتی ہوئی اندر کی سمت بڑھی۔

فرمائیے۔

نرس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غزالہ بڑے تکلّف سے بیٹھ گئی پھر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر صاحب کب تک آئیں گے۔

ایک گھنٹے تک، ابھی ابھی گئے ہیں۔

ان سے ضروری ملنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مریضوں کو صرف صبح کے وقت دیکھتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ مسکرا دی۔

میں مریضہ نہیں ہوں، مجھے تو کسی کا پتہ معلوم کرنا ہے۔

اچھا، ڈاکٹر صاحب تو ایک گھنٹہ بعد آئیں گے۔

غزالہ نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رسالہ تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ فارغ ہے۔ غزالہ نے کہا۔

آپ یہاں کب سے ہیں؟

جی کوئی دو ہفتے سے۔

کیا یہاں شعاع نام کی لڑکی بھی کام کرتی ہے؟

جی ہاں، کرتی ہے، آج کل تو وہ ایک سیٹھ صاحب کی دیکھ بھال کر رہی ہے، مجھے اسی کی جگہ رکھا گیا ہے۔

عارضی طور پر؟

جی ہاں۔

آپ کو شعاع کا پتہ معلوم ہے، میرا مطلب ہے جہاں وہ کام کر رہی ہے؟

ممکن ہے رجسٹر میں لکھا ہو۔

نرس نے ذرا سستی برتی، مگر غزالہ بہت چالاک تھی جلدی سے بولی۔

میں شعاع کی ماں ہوں، ذرا تکلیف کر کے پتہ بتا دو۔

اوہ، میں ابھی بتاتی ہوں۔

نرس جلدی سے اٹھی اور ذرا دیر بعد ہی اس نے غزالہ کو ایک چٹ لا کر دی جس پر نعمان کی کوٹھی کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھا تھا۔ سیٹھ نعمان نام پڑھ کر غزالہ ذرا سی چونکی ضرور مگر بیٹھ ساتھ

ی کی وجہ سے اس کا دھیان کسی طرف نہ گیا اور پھر اس کے ذہن پر اس بات کا ہی بہت اثر نا شعاع کو کس طرح وہاں سے لایا جا سکے۔ اس لیے چٹ جلدی سے پرس میں رکھی اور نرس کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر نکل آئی۔ شاید وہ اسی وقت شعاع کو لینے چل دیتی، مگر رات بہت ہو گئی تھی اس لیے وہ گھر چلی گئی۔ اور اس رات اس نے افتخار سے وعدہ کیا کہ وہ جلدی سے جلدی شعاع کا پتہ لگانے کی کوشش کرے گی۔

حنا ذرا مجھے ٹیلی فون لا دو۔

کس کو کریں گے فون۔

حنا نے بڑے پیار سے پوچھا

چند دنوں سے نعمان الجھا الجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ اسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے حنا برابر اس کی دلجوئی کی کوشش کرتی رہی۔ ڈاکٹر بھی آیا، مگر نعمان نے اسے بھی دل کی بات نہ بتائی۔ آج اس نے ذرا مسکرا کر بات کی تو حنا بھی خوش ہو گئی اسی لئے پیار سے پوچھنے لگی۔

بتائیے بھی کس کو کریں گے فون؟

حق صاحب کو۔

کوئی خاص بات ہے۔

ہاں۔

حنا کے ذہن میں لبنیٰ اور سہیل کی صورت لہرائی۔ وہ مسکرا دی، وہ خود بھی چاہتی تھی کہ لبنیٰ کا رشتہ جلدی سے جلدی طے کر دیا جائے کیوں کہ جب سے نعمان بیمار پڑا تھا، لبنیٰ کا رویہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عجیب سا ہوگیا تھا۔ ماں باپ سے لاڈ پیار بے حد کر دیا تھا۔ بعض اوقات عجیب روکھا سا ہو جاتا تھا۔ حنا جلدی سے ٹیلی فون اٹھا لائی اور بولی۔

میں خود بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ حق صاحب سے بات کر لی جائے۔

نعمان نے اسے نظر بھر کر دیکھا، پھر نمبر ملانے لگا۔ لائن کے دوسری طرف حق صاحب تھے۔ نعمان نے صرف اتنا کہا۔

آپ شام کو میرے یہاں آیئے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

اس کے بعد وہ کہنی آنکھوں پر رکھ کر لیٹ گیا۔ حنا خاموشی سے باہر چلی گئی۔

نعمان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حق صاحب سے کہے گا۔

حق صاحب سہیل کو میں نے لبنیٰ کے لئے پسند کیا تھا۔ مگر سہیل شعاع کو اور شعاع اسے چاہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ لبنیٰ کی بجائے شعاع کی شادی سہیل سے کر دوں۔ میں شعاع کی پسند پرائی بیٹی کی خوشی کی قربانی دینے پر تیار ہوں، آپ بھی اس قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔

پھر اس نے سوچا

اگر ضرورت پڑی تو شاید یہ بھی ظاہر کر دوں کہ شعاع میری ہی بیٹی ہے۔

شام تک وہ انہیں خیالوں میں گم رہا۔ جتنی بار بھی شعاع اسے دوا دینے آئی۔ نعمان نے اسے غور سے دیکھا اور سوچا۔

کتنی صابر اور کتنی دکھی ہے میری بیٹی، میں اس کے لئے بہت کچھ کر دوں گا۔

پانچ بجے ہوں گے جب حق صاحب اور بیگم حق آ گئے۔ سہیل ان کے ساتھ نہ تھا۔ وہ لوگ بھی جان گئے تھے کہ کوئی ضروری بات ہے۔ بیگم حق بے حد خوش تھیں، حنا اس سے بھی زیادہ خوش تھی۔

چائے کے وقت لبنیٰ بھی آ گئی۔ نعمان نے اندرونی خوشی سے اس کا دمکتا چہرہ بھی دیکھا، اور اداس ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اداس، ویران اور تنہا شعاع آ کھڑی ہوئی سوال کرتی ہوئی

ابو جی کیا مجھے کوئی خوشی نہ ملے گی۔

وہ کہہ اٹھا۔

ضرور ملے گی میری بچی، یہ ایک باپ کا عہد ہے۔

چائے کے بعد سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ گویا آئندہ آنے والی گفتگو کے لئے راہ ہموار کی جانے لگی۔ حنا نے اشارہ کیا اور لبنیٰ چلی گئی۔ مگر ابھی بات نہ ہو سکتی تھی۔ شعاع دوا کی دوسری خوراک دینے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

آخر حنا نے کہا۔

بیٹی تم دوا نکال کر مجھے بتا دو، اس وقت میں کھلا دوں گی۔

شعاع نے جلدی سے اسے دوا بتائی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ نعمان اپنی گفتگو شروع کرنے کے لئے الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ نوکر نے آ کر کہا۔

صاحب آپ سے کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔

نعمان سے پہلے حنا نے کہا۔

یہیں بلا لاؤ۔

اور چند لمحوں بعد غزالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نعمان نے اسے اور اس نے نعمان کو دیکھا۔ دونوں میں ایک طوفان اٹھا۔ نعمان کا چہرہ زرد پڑ گیا، مگر وہ ضبط کر گیا۔ غزالہ اس سے زیادہ ہوشیار نکلی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اجنبی انداز میں سب کو دیکھنے لگی۔

آخر حنا نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرمائیے کس سے ملنا چاہتی ہیں، نعمان صاحب تو یہ رہے۔

غزالہ نے بڑے اجنبی انداز میں اچٹتا سا سلام کیا۔ ایک ہی نظر میں وہ مکینوں کی دولت کا اندازا لگا چکی تھی۔ حسین ساز و سامان اور خوبصورت بنگلے نے اس پر خوب رعب ڈالا تھا۔ بڑے انداز سے بولی۔

میں نے سنا تھا میری بیٹی سیٹھ نعمان کے ہاں کام کرتی ہے، میں اسے لینے آئی ہوں۔

ذرا رک کر پھر بولی۔

شعاع یہیں کام کرتی ہے نا۔ وہ میری بیٹی ہے۔

نعمان کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے جو سوچا تھا جس بات کے لئے خود کو تیار کیا تھا۔ اس عورت کے آنے سے وہ بات پھر ختم ہو گئی۔

وہ سوچتا رہا۔

اس عورت نے ساتھ رہ کر بھی چین سکون نہ دیا تھا۔ تب بھی اس عورت نے میری بچی کو مجھ سے دور کر دیا تھا، علیحدگی ہوئی، میں اپنی بیٹی کے لئے تڑپتا رہا، پھر سے پانے کے لئے، اپنے گھر لانے کے لئے میں نے ڈرامہ کیا، خود کو بیمار کر ڈالا، وفا شعار بیوی اور لاڈلی بیٹی کو پریشان کیا، رشتہ داروں عزیزوں اور دوستوں کو تکلیف پہنچائی۔ اب یہ عورت مجھ سے میری بیٹی چھیننے پھر آ گئی ہے۔

غزالہ کو حنا نے زبردستی چائے کا کپ تھما دیا۔ وہ چائے پی رہی تھی اور نعمان سوچ رہا تھا کہ پوچھے غزالہ، غزالہ تم یہاں کیوں آئی ہو، کیا ابھی اور کوئی ستم باقی ہے؟ کیا ابھی کوئی اور ظلم باقی ہے؟ اور ــــ اور ــــ کیا تمہارے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی؟ کیا تمہارا بھیانک انتقام ابھی تک پورا نہیں ہوا؟ جو تم پھر مجھے ستانے، جلانے چلی آئی ہو۔

اور ــــ

ایک بار پھر تم میری اور میری بیٹی کی خوشیاں لوٹنے آ گئی ہو۔

جاؤ چلی جاؤ غزالہ، یہاں سے فوراً چلی جاؤ، یہاں تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ کوئی شعاع تمہاری نہیں اگر کوئی شعاع ہے تو وہ ایک بدنصیب باپ کے دل کی ٹھنڈک، آنکھوں کا نور ہے۔ وہ اس گھر کی رونق ہے، یہی اس کا گھر، یہی اس کی جگہ ہے۔

غزالہ تمہیں نہیں مجھے اس بیٹی کی ضرورت ہے۔ اس گھر کو اس بیٹی کی ضرورت ہے جس نے اس گھر کے لئے ہی دنیا بھر کے دکھ اٹھائے ہیں۔

جاؤ چلی جاؤ غزالہ!

نعمان کے ذہن میں طوفان اٹھ رہے تھے، مگر شدت غم سے ہونٹ سل گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا، سرد آہ بھی نہ بھر سکا، بس خاموش رہا۔ پتھر کی طرح جامد۔

غزالہ نے دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ چائے پی چکی تو اخلاقاً تھوڑی دیر وہ بیٹھی رہی، پھر ذرا بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔

مسز نعمان ذرا شعاع کو بلا دیں۔

بلا دیتی ہوں، آپ ذرا بیٹھئے تو سہی۔

حنا نے اخلاقاً کہا۔

پھر وہ کسی کام سے باہر چلی گئی۔ حق صاحب اور بیگم حق بہت غور سے غزالہ کو دیکھ رہے تھے اس کی بے چینی دیکھ کر آخر بیگم حق نے تحکمانہ انداز میں پکارا۔

نرس یہاں آؤ، تم سے کوئی عورت ملنے آئی ہے۔

شعاع نے یہ آواز سنی، یہ الفاظ سنے، یہ مالکانہ انداز، اسے بے نام سا دکھ ہوا۔ مگر وہ نرس تھی۔ دلی جذبات چھپا کر وہ جلدی سے نعمان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ یہ سوچ کر۔

ممکن ہے صابرہ ملنے آئی ہو، یا اسپتال سے کوئی نرس ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر دروازے میں ہی اس کے قدم رک کر رہ گئے۔ سامنے صوفے پر غزالہ بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، بڑے فخر سے بولی۔

شجاع، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔

شجاع کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے بے اختیار نعمان کی طرف دیکھا۔

آنکھوں میں بے بسی تھی۔

حسرت تھی۔

کچلی ہوئی تمناؤں کا غبار تھا۔

وہ چمکیلی بھوری آنکھیں دھواں دھواں سی ہو رہی تھیں۔

نعمان تڑپ اٹھا۔ اس نے دیکھا شجاع دروازے میں مجسمے کی طرح کھڑی تھی جیسے منجمد ہو گئی ہو۔ کمرے میں موجود ہر فرد کی نگاہیں اس پر تھیں اور معمولی سی بات کبھی غیر معمولی لگ رہی تھی۔ خاموشی ہی خاموشی اور اس کے پردے میں طوفان ہی طوفان۔

بیگم حق جو اتنی دیر میں غزالہ کو بھی ناپسند کر چکی تھی، ذرا جھکی اور حق صاحب کے کان میں بولی۔

"ارے میں تو لڑکی کی حرکتوں پر پہلے ہی حیران ہوتی تھی، مگر ذرا ماں کو تو دیکھو، سچ ہے جیسی ماں ہوگی ویسی ہی بیٹی۔

حق صاحب نے جواباً اپنی بیگم کو گھورا، مطلب تھا۔

خاموش رہو۔

نتیجتاً وہ خاموش ہو گئی۔

نعمان نے آخر بات کا آغاز کیا۔ شجاع سے مخاطب ہو کر بولے۔

جاؤ بیٹی تم فی الحال اپنے کمرے میں جاؤ، ہم ابھی تمہیں بلوا لیں گے۔

شجاع سر جھکا کر پلٹ گئی۔

نعمان نے حنا کو اشارے سے پاس بلایا اور دھیرے دھیرے آہستہ آواز میں کہنے لگا۔

حنا تم تو جانتی ہو، یہ لڑکی کتنی اچھی نرس ہے، کون نرس ایسی تیمارداری کرے گی، پھر مجھے تو لبنیٰ کی طرح پیاری لگتی ہے۔ میں جانتا ہوں تم بھی اسے بہت چاہتی ہو۔ یہ ساری باتیں ایک طرف، تم نے دیکھا اس عورت کو دیکھتے ہی سہم سی گئی ہے۔ تم ایسا کرو سب کو کسی بہانے سے یہاں سے لے جاؤ میں اس عورت سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے شجاع کو یہاں چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ دراصل میں چاہتا ہوں یہ لڑکی یہاں سے نہ جائے۔

حنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی۔ نعمان کی صحت یابی میں شجاع کا بڑا ہاتھ ہے [illegible] تھی۔ اس نے ایک دن بھی جا کر باپ کو دوا نہ پلائی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ شجاع کے کاموں پر ناک بھوں بھی چڑھاتی تھی۔ نرس کے فرائض انجام دینے کے باوجود شجاع کا وجود گویا گھر کے لئے لازم و ملزوم تھا۔ وہ جہاں کھڑی ہوتی معلوم ہوتا اسے اسی جگہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ کسی طرح شجاع اس گھر سے کہیں جائے۔ وہ تو بہت پہلے سوچ چکی تھی کہ نعمان سے شجاع الگ رہے گی۔ اسے خود اس ناتواں لڑکی پر رحم آتا تھا۔ جو زمانے کے جور و ستم کا تن تنہا مقابلہ کرتی چلی آ رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے نعمان کا ہاتھ تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بیگم حق کی جانب متوجہ ہو گئی۔

شجاع نے دروازے کے پٹ سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی اور سوچا۔

تم میری ماں ہو؟ تم کیسی ماں ہو؟ جہاں کہیں بھی مجھے ذرا سا سکون ملا وہ تم نے آ کر چھین لیا چاہتی ہوں، ایک زمانے تک میں اس انجانے آدمی سے نفرت کرتی رہی جو میرا باپ تھا۔ جس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم پر ظلم کئے، لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ظلم اس نے نہیں، ضرور تم نے کئے تھے۔ تمہیں اور تمہاری ماں کی عادتیں کوئی سلجھا ہوا آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش! مجھے کوئی ابو کا دامن ہی مل جاتا، کوئی تو سراغ ملتا، کوئی تو ہوتا جو مجھے ان کے بارے میں کچھ تو بتاتا۔ میں نے اپنے ذہن میں باپ کا جو نقشہ بنا رکھا ہے، جو شخص کی تصویر بنا رکھی ہے کیا عجب وہ اس سے کتنے مختلف ہوں آخر نعمان صاحب ہیں جو مجھے ہمیشہ بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر زیدی نے اپنے حسن سلوک سے میرے دل میں اپنی عزت بنا لی۔ ان دونوں میں مجھے ایک باپ کا پرتو نظر آتا ہے۔

اور پھر مرد ہمیشہ ہی تو ظالم نہیں ہوتا۔

سہیل صاحب ہیں۔

شعاع کا دل انجانے غم سے دب سا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے پیر اٹھاتی کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوئی۔

میں کب تک کمزور سہاروں کو دل سے لگاؤں۔ میں تو مسافر ہوں۔ کہیں سایہ دار درخت ملا تو رک گئی اور پھر چلنے لگی۔

اس نے سرسری سی نظر کمرے پر ڈالی، خوبصورت در و دیواریں، اعلیٰ فرنیچر، قیمتی پردے اور اس میں ایک معمولی سی لڑکی۔

کمزور

بے سہارا

شعاع نے نظریں جھکا لیں۔

اپنے کپڑے، اپنے جوتے، کتابیں وہ آہستہ آہستہ میکانکی طور پر سب سمیٹنے لگی۔ اسے جانا ہی ہوگا۔ بات یہ نہ تھی کہ اس میں احتجاج کی قوت نہ رہی تھی، بلکہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کے گھر میں

جھگڑا ہو اور رہی سہی عزت کی بھی دھجیاں بکھر جائیں۔ وہ اپنا معمولی سا سامان بکس میں بھرتی رہی۔

آہستہ آہستہ

اور وقت لمحہ بہ لمحہ گزرتا رہا۔

آیئے آپ لوگ میرے کمرے میں چلئے، کچھ باتیں کریں گے۔

حنا نے مسکرا کر کہا۔

بیگم حق جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں، وہ بھی بہت سی باتیں کرنا چاہتیں تھیں اور نعمان کے کمرے میں بلند آواز سے بولنا منع تھا۔

پھر حنا نے حق صاحب سے کہا۔

بھائی صاحب آپ بھی آ جائیے نا ذرا۔

حق صاحب بھی ذرا کاہلی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پیٹ پر پتلون کی بیلٹ درست کرتے ہوئے غزالہ سے اخلاقاً مخاطب ہوئے۔

آپ بھی چلئے خاتون۔

نہیں۔

حنا جلدی سے بولی۔

ان کی بیٹی تیاری کر رہی ہے یہ تو اب جائیں گی۔

نعمان نے حنا کے لئے دل میں شکر گزاری کے جذبات محسوس کئے۔ کیسی محبت کرنے والی بیوی تھی۔ اتنے سالوں کی ازدواجی زندگی میں ایک بار بھی اس نے نعمان پر شک نہ کیا تھا۔ سب کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلتے وقت اس نے محبت بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ نعمان کا دل تڑپ اٹھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کے جانے کے بعد غزالہ نروس ہو گئی۔ گھبراہٹ میں انگلیاں چٹخانے لگی۔

نعمان نے غور سے اس کی طرف دیکھا، وہ اب بھی خوبصورت تھی۔ اتنی عمر کے باوجود کم عمر لگتی تھی۔ بناؤ سنگھار بھی کر رکھا تھا۔ ساڑھی باندھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سنہرے بالوں کی ایک لٹ گردن پر آگری تھی۔

واقعی شعاع غزالہ سے بے حد مشابہ تھی۔ شعاع بھی اسی طرح بیٹھا کرتی تھی۔ غزالہ نے چور نظروں سے نعمان کی طرف دیکھا اسی لمحے اس نے کہا۔

غزالہ تم بھی جانتی ہو کہ میں کون ہوں اور میں بھی جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ بہرحال اجنبی بننے کا شکریہ۔ تم بھی جانتی ہو کہ ہم دونوں میں مجرم کون ہے اور میں بھی بہرحال ہم دونوں نے بھی اچھا وقت گزارا تھا، بلکہ بہت ہی اچھا وقت۔ مجھے اعتراف ہے کہ اتنی وفا شعار بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اس وقت کی، اس محبت کی، یاد میرے روئیں روئیں میں بسی ہوئی ہے اس محبت کی یاد جسے تم نے قتل کر ڈالا۔

تباہ کر ڈالا۔

س کے باوجود وہ زمانہ مجھے یاد آتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ تم نے میری بیٹی کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اس عالم میں کہ میں اس کی صورت دیکھنے کو ترستا تھا۔

غزالہ نے کچھ بولنا چاہا۔ نعمان کے بات کرتے ہی اس کی تمام حسیں بیدار ہو گئی تھیں وہ کچھ کہنے کو بے تاب تھی۔ نعمان نے اس کی بیتابی بھانپ کر کہا۔

ٹھہرو، پہلے میری بات سن لو۔ میرے دل میں اس محبت کی یاد زندہ ہے۔ مگر تمہاری نہیں، تم نے ہر نقش خود کچل دیا تھا۔ تم نے زندگی میں مجھے بے حد دکھ دیئے ہیں، مگر اب تم شعاع کو لے جا کر مجھے اور دکھ نہیں دے سکتیں۔ جاؤ چلی جاؤ، وہ تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی، وہ میری بیٹی ہے، میری ہی رہے گی۔

زالہ نے بے حد تلخی سے کہا۔

ان سب گزری باتوں کا کیا فائدہ، آپ کو کس چیز کی کمی ہے۔ آپ کے پاس دولت ہے، بنگلہ ہے، ہرکت ہے، خوشیاں ہیں، بیوی ہے، بچے ہیں۔ ہم سے دور ہو کر آپ کو کیا فرق پڑا؟ کیا کیا کچھ ہوا، میں بری تھی، بےشک کہیئے، میں نے ہی دکھ دیئے، فرور کہیئے، مگر مجھے یہ بتایئے کہ شعاع کو س طرح روک سکتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے گھر میں بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی ہے؟ کیا اسے وہ حاصل ہے جو دوسرے بچوں کو ہے۔ اس کی تعلیم ادھوری ہے، کیا آپ نے اسے داخلہ دلوایا؟ یہ سب آپ نے نہیں کیا۔ یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ شعاع سیٹھ نعمان کی لاڈلی بیٹی ہے لاد صرف لوگ اسے نرس سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ اور یہ بھی سن لیں اگر شعاع کو معلوم آپ ہی اس کے والد بزرگوار ہیں، تو وہ ایک پل بھی یہاں نہیں رکے گی کیونکہ وہ اپنے یا آپ سے شدید نفرت کرتی ہے۔

زالہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری، بولی۔

بونہہ، بیٹی کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بنا رکھا ہے نرس، ملازموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ یہ کیسی ہے کہ بیٹی باپ کی تیمارداری کرے اور تنخواہ پائے، نرس کہلائے۔ اگر دنیا کو یہ باتیں بتانے ہیں نہیں ہے تو اسے نرس ہی رہنے دیں، یہ بھول جائیں کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔

نعمان نے بے حد آزردگی سے سر تکیے پر ڈال دیا اور دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

تم کیا جانو غزالہ بیگم، وہ کن کن حالات سے گزری ہے۔ مجھے ر تم ہزار باتیں سنا رہی ہو۔ یہ بتاؤ تم نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا، پھر وہ لاوارثوں کی طرح ہوسٹل میں اور مسز فاروقی کے ہاں کیوں رہی، وہ کیا حالات تھے کہ وہ ہر جگہ خود کو لاوارث ہی بتاتی تھی، بتاؤ تم نے اس کا خیال کیوں نہ کیا، کیوں وہ ٹیوشن کر کے تعلیم حاصل کرتی رہی؟ تم کس منہ سے دعویٰ کرتی ہو کہ وہ تمہاری بیٹی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے ٹھیک ہے مگر غزالہ بیگم وہ تم سے بھی نفرت کرتی ہے۔ یہ بات میں اپنے کانوں سے سن چکی ہوں —— رہی بات نرس کی تو یہ وقتی بات ہے، اس میں بعض مصلحتیں ہیں۔ عنقریب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ میری بیٹی ہے۔

غزالہ نے تنک کر کہا۔

سب سے پہلے تو میں ہی اس کو بتاتی ہوں کہ آپ کیا ہیں۔

نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتیں۔

نعمان یکدم غصے میں آ گیا۔

غزالہ نے کہا۔

تو پھر میں اسے لے کر جاؤں گی۔

نعمان نے کہا۔

یہ بھی ناممکن ہے۔

آپ مجھے منع نہیں کر سکتے۔

کیوں نہیں کر سکتا۔

نعمان اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ غزالہ ڈر سی گئی۔ نعمان بھی اس کی حالت سے بھانپ گیا کہ وہ ڈر گئی ہے۔ ذرا نرم لہجے میں غزالہ نے کہا۔

میں اس کی شادی طے کر چکی ہوں۔

کہاں؟

افتخار کا بھانجہ ہے، بے حد امیر ہے۔

امیر سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

اس کی بہت بڑی جائداد ہے، جو وہ شجاع کے نام لکھ دے گا۔ اور افتخار کو کاروبار کے لئے بھی دے گا۔

نعمان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غزالہ رو میں یہ باتیں کہہ تو گئی تھی، مگر پھر شرمندہ سی ہو گئی۔ نعمان نے غصے کو دبا کر کہا۔

تو یوں کہو، بیٹی نہیں وہ دولت پیاری ہے جو اس کو بیچ کر حاصل ہو گی۔ اس کا سودا کر رہی ہو دولت کی پجارن، صرف جائداد کی خاطر تم نے اپنا گھر تباہ کیا تھا اور مجھے قربان کر دیا تھا۔ اب تم جائداد کی خاطر ایک بار پھر میرا گھر برباد کرنا چاہتی ہو۔ اب میری بیٹی کو قربان کرنا چاہتی ہو۔ دولت، دولت، لوگوں کا ایمان ہی دولت ہے۔

غزالہ نے اپنی شرمندگی کو ڈھٹائی میں بدل کر کہا۔

یہی سمجھ لو، تم جو دولت میں کھیل رہے ہو، کیا جانو کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے۔ تمہارے گھر میں دس دس نوکر کام کرتے ہیں اور ادھر ہم دونوں ملازمت کرتے ہوئے بھی ایک نوکر نہیں رکھ سکتے۔ شجاع بھی سُکھ سے رہے گی اور ہم بھی۔ یوں بھی شجاع کی جائداد ہماری ہی ہو گی، دیکھنا ایک دن اسی طرح کا بنگلہ ہمارا بھی ہو گا۔

نعمان اس کی باتیں سن سن کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

خوب خوب، ضرور ہو گا ایسا ہی بنگلہ، مگر میں اپنی بیٹی بیچنے نہیں دوں گا، تمہیں دولت کی ضرورت ہے نا؟ بتاؤ کتنا پیسہ چاہیے تمہیں؟ سودا ہی کرنا ہے تو مجھ سے کر لو، بتاؤ کتنا روپیہ دوں، ابھی اور اسی وقت، بولو؟

غزالہ جو بہت تن تن کر باتیں کر رہی تھی گڑبڑا گئی۔ بونقوں کی طرح نعمان کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے پھر کہا۔

فیصلہ کرلو، ممکن ہے جلدی میں کم رقم مانگ بیٹھو۔ سوچ سمجھ کر بتاؤ، اور اپنے ابا سے بھی مشورہ کرلو، میں انتظار کروں گا۔

غزالہ نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

ٹھیک ہے۔ میں افتخار سے بات کروں گی۔ انہوں نے اپنے بھانجے کے ساتھ رشتہ کیا تھا، ان سے پوچھنا ضروری ہے۔

تو پوچھ لو، اور اس گھر کے دروازے کھلے ہیں جب جی چاہے آجانا۔ یہ لو ہزار روپے پیشگی بیعانہ۔

نعمان نے ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے میز پر پھینک دی۔ غزالہ سوچتی رہی۔ پھر نوٹ اٹھا کر پرس میں رکھ لئے اور جھکی جھکی نظروں سے بولی۔

اچھا تو میں چلتی ہوں، افتخار سے بات کرلوں تو بتاؤں گی۔

نعمان نے کہا۔

بہتر۔

غزالہ گیلری میں نکل آئی۔ سامنے اور نیچے کوئی نہ تھا۔ سب لوگ جنازے کے گرد بیٹھے تھے اس لئے اس نے جی بھر کر ادھر ادھر دیکھا اور دل ہی دل میں نعمان کی امارت کا اندازہ لگاتی رہی۔ پھر جب ایک نوکر نیچے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، تو وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر باہر نکل آئی۔

شعاع —— شعاع

شعاع نے یہ آواز سنی، وہ سمجھ گئی کہ رخصتی کا پیغام ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے بندھے سوٹ کیس

پر ڈالی۔ اتنے میں نعمان کی ایک اور آواز آئی۔

شعاع ——

اور شعاع نے خاموشی سے دروازہ کھول کر کہا۔

جی۔

سامنے کا صوفہ خالی تھا، غزالہ کہیں نہ تھی۔ تنہا نعمان زرد چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے د رہا تھا۔

بیٹی دوا کا وقت ہو گیا ہے، بھول گئی تھیں کیا؟

جی نہیں دراصل وہ . . . . . میں''

وہ جلدی سے کیپسول نکال کر دینے لگی۔

وہ خاتون، یا واقعی تمہاری والدہ ہیں؟

جی۔

وہ تمہیں لینے آئی تھیں؟

جی۔

میں نے انہیں واپس بھیج دیا ہے۔

جی —— وہ کیوں؟

میں چاہتا ہوں تم یہیں رہو بیٹی کی طرح میری بیٹی بن کر۔

شعاع خاموش رہی، مگر دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

مجھ سے اتنا پیار نہ کریں، میں بدنصیب ہوں، ایک نہ ایک دن آپ کو چھوڑ کر ا

چلی جاؤں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے اس کی جھکی ہوئی پلکوں کی طرف دکھ سے دیکھا اور بولا۔

میں نے بُرا تو نہیں کیا بیٹی؟

جی نہیں — لیکن ایک نہ ایک روز تو میں چلی ہی جاؤں گی۔

اگر تمہیں یہیں رہنا پڑا تو رہ لو گی؟

شعاع خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواب وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ اسے یہاں نہ رہنے دیں گے اور خود اس کی اپنی خودداری بھی یہ گوارا نہ کرے گی۔

نعمان نے دوائی کھالی۔ شعاع نے باہر کی سمت قدم بڑھائے۔ نعمان نے کہا۔

ذرا اپنی امی کو یہاں بھیجنا۔

شعاع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور رک رک کر بولی۔

مگر... آپ تو کہہ رہے تھے کہ... وہ...

نعمان ہنس دیا۔

میرا مطلب حنا سے ہے، کیا وہ تمہاری امی نہیں ہو سکتی؟

جی... جی؟

ذرا اسے بھیجنا۔

جی اچھا۔

حنا کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ شعاع نے پردہ ہٹا کر جھانکنا چاہا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

گندی بات، اچھے بچے کمروں میں جھانکا نہیں کرتے۔

شعاع نے چونک کر دیکھا۔ سہیل مسکراتی شریر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شعاع

دھیرے سے کہا۔

آپ؟

جی خاکسار۔

سہیل کو دیکھ کر اب اس کا دل عجیب طریقے سے دھڑکنا لگتا تھا۔ پہلے وہ سپاٹ چہرہ بنا کر اس طرف دیکھا کرتی تھی، مگر اب وہ نظریں جھکا لیتی۔ اور اس کی کنپٹیوں کے سنہری روئیں لرزنے لگتے۔

دونوں طرف خاموشی تھی۔ شعاع نے دھیرے دھیرے پلکیں اٹھا کر سہیل کا چہرہ آنکھوں میں ...ا چاہا۔ ایک نظر دیکھا۔ ہونٹ لرزنے لگے۔

جی۔ جی فرمایئے۔

سہیل نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

وہ ذرا مسز نعمان سے کہئے کہ نعمان صاحب بُلا رہے ہیں۔

میں کہہ کر آتا ہوں مگر آپ جایئے گا نہیں۔"

سہیل کمرے میں داخل ہوا اور شعاع پلٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

سہیل — سہیل

اس نے زیرِ لب کہا۔

تم کیوں میری راہوں میں آکھڑے ہوتے ہو۔ میں اعتراف کرتی ہوں سہیل کہ تم ہی میری زندگی ہو ...میں تمہیں چاہتی ہوں، میں تمہیں اپنانا چاہتی ہوں، مگر سہیل تم کسی کی امانت ہو۔

اس کے خیالوں کی رَو بھٹکنے لگی اور وہ اپنے سوٹ کیس پر نظریں جمائے کہیں سے کہیں نکل گئی

نعمان نے اپنا سر تھام لیا، وہ اپنی بے بسی پر تڑپ تڑپ اٹھتا تھا۔ غزالہ کی تیز باتیں اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بار بار یاد آ رہی تھیں۔ کبھی شعاع کی بے کسی پر نظر ڈالتا۔ کیونکہ جب بھی شعاع سامنے آتی
چاہتا وہ اس سے کہے۔

شعاع تم میری بیٹی ہو، میری سگی بیٹی، میرا ہی خون۔

مگر وہ جانتا تھا کہ شعاع اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے، وہ چاہتا تھا کہ پرائی ہی کر
گھر میرے سامنے رہے۔ دل ہی دل میں ڈرتا تھا کہیں شعاع پر یہ بھید نہ کھل جائے۔ اپنی بیٹی کو
کو لینے کے لئے اس نے کیا کیا نہ جتن کئے تھے۔ بیمار بنا، جھوٹ موٹ کی دوائیں کھائیں، غرض
کہ بیٹی اس کے پاس رہے۔ چاہنے والی بیوی اور بہنوں کو پریشان کیا، بیماری کے مغالطے میں
تاکہ اپنی شعاع کو بیٹی کہہ سکے مگر غزالہ نے آکر اس سے یہ چند روزہ خوشی بھی چھین لی تھی
دور میں اسے دکھ ہی دکھ دیتے تھے۔ کبھی محبت کا مغالطہ تھا مگر بے وفائی دیکھی، بچی کے بچھڑنے
صدمہ ہوا، مگر اتنے عرصے کے بعد جب بچی ملی، اس کے دل میں بھی ٹھنڈک پڑی تو وہ پھر آ
ہوئی۔ اس کی خوشیوں کو برباد کرنے، اس کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے۔ اس کے ہونٹوں سے آہ نکل

کیسی طبیعت ہے؟

نعمان چونک گیا، حنا اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے جھکی کھڑی تھی۔

ٹھیک نہیں ہے۔

وہ کام ہو گیا؟

پورا نہیں۔

بیگم حق نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اے ہے وہ عورت چلی گئی، کیا لڑکی بھی گئی؟

جی نہیں۔

بیگم حق نے حیرت سے پوچھا۔

کیوں؟

حنا جلدی سے بولی۔

ہم نے روک لیا تھا۔

کاہے کو روک لیا، دنیا میں نرسوں کی کیا کمی ہے۔ سچ ہے مسز نعمان، وہ عورت تو بہت چٹاخ
پٹاخ تھی، کیسی بے باکی سے آکر بیٹھ گئی۔ اور لڑکی بھی ایسی ہی ہے۔

حنا کو بے نام سا دکھ ہوا۔ شعاع کی سادہ صورت اس کے سامنے آئی۔

نہیں مسز حق وہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔

رہنے بھی دیجئے، آپ بہت بھولی ہیں، جیسی ماں ہے بیٹی بھی ویسی ہی ہوگی۔ اور اللہ بچا
ان نرسوں سے ـــ حق صاحب کے ایک دوست کا قصہ ہے، بیچارہ بیمار پڑا تو اسی ط
نرس آئی تیمارداری کو، اچھا بیوی بچوں والا آدمی تھا، بیماری بڑھی اور مر گیا۔ اور جانتی ہیں ما
مرنے کے بعد کیا ہوا ـــ مرنے والا نرس سے خفیہ نکاح کر چکا تھا اور آدھی جائیداد اس
نام لکھوا گیا تھا۔

حنا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

توبہ توبہ مسز حق، آپ بھی کیسی بات کرتی ہیں، وہ تو عورتیں ہی کسی اور ٹائپ کی ہو
یہ تو بہت معصوم لڑکی ہے۔

اور معصوم لڑکیاں ہی رنگ دکھاتی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں اسے جانے دیں، کیونکہ
رکھا ہے۔

حنا نے پریشان ہو کر نعمان کی طرف دیکھا۔ وہ تو شکر ہے مسز حق یہ باتیں آہستہ آ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہی تھیں، ورنہ نعمان پر جانے کیا اثر ہوتا۔

نعمان آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

حق صاحب نے پوچھا۔

نعمان صاحب کیسی طبیعت ہے؟

ٹھیک ہوں ——— ذرا قریب آئیے۔

حق صاحب قریب ہوگئے۔ نعمان نے کہا۔

میں تنہائی میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

اچھا۔

حق صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا اور بولے۔

بھئی وہ آپ بیگم شریف کے ہاں جانے کو کہہ رہی تھیں۔ سہیل کے ساتھ چلی جایئے، کھانے کے وقت تک واپسی ہو جائے گی۔

بیگم حق نے کہا۔

ہاں، خوب یاد دلایا، آپ بھی تو چلئے۔

حق صاحب نے کہا۔

نہیں بھئی، میں تو نعمان صاحب کے ساتھ ذرا باتیں کروں گا، بھابی کو لے جایئے۔

حنا نے جلدی سے معذرت کی۔

نہیں بھابی مجھے تو معاف ہی رکھئے، میں تو ابھی باورچی خانے میں جاؤں گی، خانساماں منتظر ہوگا۔

بیگم حق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

چلتے ہو سہیل؟

جی چلئے۔

وہ کھڑا ہوگیا۔ بیگم حق نے لبنیٰ سے کہا۔

تم بھی چلو۔

اس کے بولنے سے پہلے حنا اور نعمان نے بیک وقت کہا۔

چلی جاؤ۔

وہ لوگ چلے گئے۔ حنا باورچی خانے میں چلی گئی، تنہائی ہی تنہائی تھی۔

فرمایئے۔

حق صاحب نے مسکرا کر کہا، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نعمان سہیل اور لبنیٰ کے بارے میں بات کرے گا۔

وہ دراصل حق صاحب بات وہ نہیں جس کی آپ کو توقع ہے۔

چلئے غیر متوقع بات ہی کریں۔

نعمان بھی مسکرا دیا۔ بات کرنے کے لئے تمہید باندھ ہی رہا تھا کہ شجاع دوا پلانے آگئی۔ دوا پلائی اور خاموشی سے چلی گئی۔ نعمان نے کہا۔

بھائی صاحب، اس لڑکی کو آپ نے دیکھا۔ میں آج بتاتا ہوں، یہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔ میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی تھی۔ اس کی ماں کو بھی آپ نے دیکھا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی اور بچی بے چاری ان دونوں پاٹوں میں پس کر رہ گئی۔ اس نے محنت مزدوری کر کے تعلیم حاصل کی، مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ اب دیکھئے، یہ ایک شریف اور خاندانی آدمی کی بیٹی نرس کے روپ میں کام کرتی ہے، میں اس کی نیکی اور شرافت کا قائل ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حق صاحب الجھ سے گئے تھے، نعمان نے پھر کہا۔

حق صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ لبنیٰ اور سہیل کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے منگنی ملتوی ہو گئی تھی۔

حق صاحب نے کہا۔

اوہ، تو یہ وہ لڑکی ہے؟

نعمان نے کہا۔

جی ہاں، اور جانتے ہیں یہ کیوں بے ہوش ہوئی تھی، اس لئے کہ سہیل اور شعاع ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

حق صاحب نے کہا۔

نہیں صاحب، ٹھہریئے ایسی کوئی بات میں نے بیگم سے سُنی تھی، جبھی صاحبزادے غائب ہو گئے تھے۔

جی ہاں، حق صاحب یہ لڑکی یعنی شعاع بے حد شریف، سگھڑ اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے، مگر دُکھی ہے۔ یہ کسی باپ کسی بھائی پر زور نہیں ڈال سکتی کہ اس کی شادی اس کی پسند سے ہو۔ لڑکیاں خاموشی کی زبان سے بات کرتی ہیں۔ میں ایک باپ ہوں۔ میں نے اس کی خاموشی کی زبان سمجھ لی ہے ں چاہتا ہوں کہ آپ لبنیٰ کی بجائے شعاع کو اپنی بہو بنا لیں۔ آپ کے بیٹے کی بھی یہی خواہش ہے۔ ہم لوگوں کو بچوں کی خواہشوں کا احترام کرنا چاہیے۔

حق صاحب نے کہا۔

وہ تو صحیح ہے صاحب، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں اس کے باپ کو نہیں جانتا، فیملی کو یں جانتا۔

ان نے کہا۔

ی تو جانتے ہیں، میں اس کا باپ بن کر آپ سے بات کرتا ہوں۔ میری آپ کی مدتوں ہے، میری زبان پر یقین کریں۔ اس کا باپ ایک خاندانی آدمی تھا اور بے حد شریف۔

ق صاحب نے کہا۔

ر صاحب آپ کی بیگم کیا سوچیں گی۔

پ بیگموں کے سوچنے کو جانے دیں۔ جناب میری ہر بات ماننے کو تیار ہیں۔ آپ بتایئے۔

حق صاحب نے کہا۔

پھر بھی میں تو اپنی بیگم سے بات کروں گا، ان کی رائے لینا تو ضروری ہے۔

نعمان نے کہا۔

ئے حق صاحب، اس گھر میں سب لوگ میری رائے لیتے ہیں، اس لئے کہ مردوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کی رائے بھی سب مانتے ہوں گے۔

حق صاحب ذرا گھبرائے۔

ہاں ہاں، کیوں نہیں، رائے سے مطلب تھا ذرا مشورہ کر لوں گا۔

نعمان نے کہا۔

نہیں، مجھ سے وعدہ کریں، آج دوستی کا امتحان ہے۔ نعمان نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ حق نے جلدی سے کہا۔

یری طرف سے وعدہ، مگر پکی بات میں بیگم کے مشورے کے بعد کروں گا۔ لڑکی مجھے بھی پسند ب سے بڑھ کر یہ کہ شادی سہیل کو کرنی ہے۔ اس کی پسند بھی ہے۔ مگر نعمان صاحب اس میں کچھ ہلے گا، آپ بیگم کی طبیعت سے تو واقف ہی ہیں، انہیں تو کندن میں سے کھوٹ ڈھونڈنے کی عادت ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمان نے کہا۔

شکریہ، بہت بہت شکریہ حق صاحب، مجھے تو آپ کی رضامندی کی ضرورت تھی۔

نعمان نے تشکر سے ان کا ہاتھ دبایا۔ باہر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ دونوں خاموش ہو گئے

بیگم حق نے اندر آ کر کہا۔

تو بے خواہ مخواہ ہی گئے، وہ تو سوات گئی ہوئی ہیں۔

نعمان اور حق صاحب مسکرا دیئے۔

شعاع بالکونی میں کھڑی سوچ رہی تھی۔

آخر میں کب تک اس طرح جگہ جگہ بھٹکتی پھروں گی؟ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اب مجھے صبر و شکر کر کے اس گھر سے چلے جانا چاہیے، لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گی جہاں غزالہ، میمونہ اور افتخار ہیں اور پھر اسی لمحے اس نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ وہ سیدھی سیاہ سڑک پر نگاہیں جمائے بالکونی کی دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ رات کا اندھیرا اترتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی سرعت سے، کیونکہ صبح اس کے تعاقب میں تھی۔ شعاع کو غزالہ، میمونہ اور افتخار کا خیال آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن اس کی اپنی ذات کی طرف مڑ گیا۔

آخر میں کیا ہوں؟

شاید راستے کا پتھر، جسے لوگ جس طرح اور جس طرف چاہیں لڑھکا دیں۔ چاہے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پتھر اپنی جگہ خود کو کتنا ہی بھاری کیوں نہ سمجھتا ہو، مگر لوگوں کی ٹھوکریں اسے ادھر سے اُدھر لڑھکاتی رہتی ہیں۔

سوچ کی رسی لمبی ہوتی گئی، اسے گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔ جب وہ خود کو عزم کی بھاری چٹان سمجھتی تھی، فیصلے کرتی اور ان پر عمل کرتی تھی، مگر ایک وقت آیا جب اسے معلوم ہوا کہ صرف فیصلے کرنا اور عمل کرنا ہی سب کچھ نہیں، حالات کی موافقت بھی ضروری ہے۔ حالات کی ہوا اس کے فیصلوں کے مخالف سمت چلتی رہی اور وہ اپنی مرضی سے نہیں، حالات کے بس میں ہو کر رہ گئی۔

ایک بار نہیں بار بار ——

گھر سے نکل کر کیسے اعتماد سے وہ سعدیہ کے گھر گئی۔ پے انگ گیسٹ بنی، پھر ہوسٹل گئی، مسز فاروقی کے ہاں رہی، مگر حالات نے، قسمت نے اسے کہیں چین سے نہ رہنے دیا۔ اپنی جگہ خود کو ٹھوس چٹان سمجھنے والی لڑکی معمولی پتھر کی طرح لڑھکتی رہی۔ اسے ہر طرف بھیانک کھائیاں ہی نظر آئیں۔ وہ ریزہ ریزہ تو نہ ہوئی، مگر اندر سے اس میں بال پڑ گئے تھے۔ اب وہ حوصلہ ہار چکی تھی، اس کے اندر وہ بات نہ رہی تھی۔

ایسے میں شعاع کو بہت سے ہمدرد چہرے یاد آ گئے۔

سعدیہ ——

اس کی پیاری سہیلی جس نے اس سے ملنے کی لاکھ کوشش کی مگر شعاع نے ملنے سے انکار کر دیا۔

مسز فاروقی ——

جو اسے بیٹی سمجھتی تھیں، مگر وقت آنے پر سگی ماں کے آگے وہ بے بس ہو گئیں۔

سہیل ——

زندگی کی راہ میں انوکھی شخصیت جسے وہ درخورِ اعتنا نہ سمجھتی تھی، مگر اب اسے چپکے چپکے یاد کر لیتی —— نعمان صاحب، ڈاکٹر زیدی

اور ——

بے شمار دھندلی دھندلی شکلیں، جو اس سے خلوص و محبت سے ملتی تھیں اور ایسے میں ایک چہرہ اور چمکا۔

لبنیٰ ——

بھولی بھالی، سادہ طبیعت لڑکی جو اس کی سخت اور روکھی طبیعت کے باوجود اس کو چاہتی تھی، مگر کیسے مختلف انداز تھے لوگوں کے۔ شعاع کو اس سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مگر لبنیٰ اب شعاع سے نفرت کرتی تھی۔ اول تو اس کی طرف دیکھتی ہی نہ تھی اور جو نظر پڑ جاتی تو ایک زہرخند ہوتا جو اس کی ساری شخصیت کو دھندلا دیتا تھا۔

سامنے سڑک پر کوئی رکشہ دھڑ دھڑ کرتا رکا، غالباً خراب ہو گیا تھا۔ ایک ساڑھی والی عورت نے خواہ مخواہ سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اُتر کر رکشہ کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ شعاع کا ذہن ایک بار پھر غزالہ کی جانب مڑ گیا۔ اسے خیال آیا کہ غزالہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ اگر مجھے لینے آئی تھی تو لئے بغیر کیوں چلی گئی۔ اسے کس طور سے سمجھایا گیا تھا اور وہ کیا شرائط تھیں، لیکن . . .

ہو سکتا ہے وہ دوبارہ آئے، مگر پھر بھی وہ مجھے لئے بغیر کیوں چلی گئی؟

یہ راز شعاع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کرتی رہی، لیکن یہاں اگر اس کی سوچ پر تالا سا پڑ گیا تھا اور اس تالے کو کوئی کنجی نہیں لگ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر ایک لمحے کو وہ یہ سوچتی کہ شکر ہے غزالہ سے جان بچی تو دوسرے لمحے یہ خیال آتا کہ وہ غزالہ بیگم ہے اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ کس لمحے وہ دوبارہ آجائے اور زخموں پر جمے ہوئے کھرنڈ اپنے تیز ناخنوں سے نوچ دے۔

اب تک یہی ہوا تھا۔

اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ جہاں بھی اسے امان ملی، جہاں بھی ذرا چین پڑا، غزالہ بیگم آن موجود ہوئیں۔

شعاع کا جی چاہتا تھا کہ وہ نعمان سے جا کر پوچھے کہ غزالہ کیا کہہ کر واپس گئی تھی اور ان کا کیا انداز تھا۔

شعاع نے جو اہم فیصلہ کیا تھا وہ ایک دم اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ اب وہ مزید کچھ سوچے بغیر تیز قدموں سے نعمان کے کمرے کی طرف چلی۔ کمرے کے دروازے پر وہ ایک لمحہ رکی۔

ممکن ہے اندر حنا بھی ہو اور حنا کے سامنے کچھ کہنا، پوچھنا اسے گوارہ نہ تھا۔

اس نے نرم ہاتھ سے معمولی سی دستک دی۔ نعمان کی آواز آئی۔

آجاؤ۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔ چونکہ اس کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے نعمان ذرا حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔ اس نے خود سے کہا۔

یہ میری بیٹی ہے۔

شعاع خاموش جا کر کھڑی ہو گئی۔

دادا کا تو غالباً ابھی وقت نہیں ہوا؟

شعاع نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نہ جانے کیوں وہ اس پروقار اور مشفق انسان کے سامنے

بے بس ہو جاتی تھی۔

کوئی بات ہے کیا؟

اب کی بار شعاع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تو کہو بیٹی، بولو۔

شعاع نے کچھ کہنا چاہا۔

اس کے ہونٹ ہلے، لرزے

اور بند ہو گئے۔

نعمان بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شعاع نے پھر کچھ بولنے کی کوشش کی زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی شفاف آنکھیں دھندلا نے لگیں۔ شفاف پانی کے قطرے اس کی نوکیلی پلکوں کے کناروں پر آ کر تھرتھرانے لگے۔

لرزنے لگے۔

جیسے وہ ان خوبصورت پلکوں کا ساتھ چھوڑنا نہ چاہتے ہوں، مگر پلکیں ہلیں۔

اور پھر دو چمکتے ہوئے موتی گرے اور اس کے صبیح رخساروں پر چمکیلی لکیر بناتے ہوئے دوپٹے میں غائب ہو گئے۔

نعمان کے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ اس کے دکھ میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا دل اسے بار بار کہہ رہا تھا کہ آگے بڑھو، اپنی بیٹی کو گلے لگا کر سارا راز افشا کر دو، اس سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ لو۔ اس کے بازو ہلے، ہاتھ اٹھے اور پھر پہلو میں گر گئے۔

نعمان ڈرتا تھا کہ بعض دفعہ خوشیاں بھی انسان کے لئے دکھ اور تکلیف کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور نعمان یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک خوشی حاصل کر کے بقیہ دن دکھ کی سولی پر لٹک کر گزارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کل —

بہت خوب، لیکن کیا تمہارا پاسپورٹ بن گیا، این او سی آ گیا۔ ٹکٹ کیا تمہاری سہیلی نے بھجوایا ہے۔

شعاع معصوم تھی، اپنی طرف سے تو اس نے بڑی بھاری بھرکم بات کہہ دی تھی مگر اب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیسی حماقت کی بات کہہ دی ہے، مگر اب تو کہہ چکی تھی نگاہیں جھکا کر خاموش رہی۔ نعمان نے پھر پوچھا۔

بیٹی، میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔

شعاع نے کہا۔

امریکہ سے تو اس کا خط آیا ہے، میں ابھی امریکہ جانے کی بات تو نہیں کر رہی تھی دراصل میں لاہور جا رہی ہوں۔

نعمان مسکرایا۔ دکھ بھری مسکراہٹ تھی۔

جاؤ بیٹی اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں تم سے پھر کسی وقت بات کروں گا۔۔۔۔۔ اور تم کہیں نہیں جاؤ گی۔

شعاع خاموشی سے باہر نکل آئی۔ نعمان نے پھر دھیرے سے کہا۔

تم اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔

نعمان نے جس طریقے سے مسٹر حق سے بات کی تھی اور جو بات کی تھی، وہ حق صاحب کے دل کو تو لگی تھی۔ انہوں نے نعمان سے وعدہ تو کر لیا تھا، مگر یہ بات بھی ان کے پیش نظر تھی کہ ایسے معاملات میں ان کی بیگم کا پلّہ بھاری رہتا ہے، کیونکہ شروع سے ہی بیگم حق ہر معاملہ خود طے

رتی تھیں، خواہ وہ گھر کا ہو یا باہر کا۔ اور حق صاحب یا تو دخل ہی نہیں دیتے تھے یا انہیں دخل کی اجازت ہی دی تھی۔ مگر آج وہ بیگم سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ اس وقت بیگم حق برآمدے میں تخت پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں، لیکن اخبار سے زیادہ اس کی نظریں حق صاحب کے پیچھے تھیں جو برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیسیوں چکر لگا چکے تھے اور ہر بار جب وہ بیگم کے پاس سے گزرتے تو ذرا رک کر ایک نگاہ ان پر ڈال لیتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ جب بیگم حق سے زیادہ برداشت نہ ہوا تو انہوں نے اخبار ایک طرف ڈالا اور میاں سے مخاطب ہو کر بولیں۔

میں کہتی ہوں آخر کب تک برآمدے کے فرش کو ناپیں گے، میرا تو سر دکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کو بیٹھ جائیں تو میں اخبار پڑھ لوں۔

حق صاحب نے بیگم کی بات سنی اور ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ عجیب و غریب انداز سے بیگم کو دیکھنا شروع کر دیا پھر بڑے بھاری لہجے میں بولے۔

بیگم مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

تو کہئے۔

بیگم حق نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔ حق صاحب خاموش رہے۔

بیگم حق نے پھر کہا۔

کیا کہہ رہے تھے آپ؟

حق صاحب بیگم کے پاس بیٹھ گئے، دل میں ڈر بھی رہے تھے مگر نعمان سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد تھا۔ اس لئے بولے۔

یہ بتاؤ تم میری بات سنو گی بھی؟

آپ کہنے والے تو بنیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھا یہ بتاؤ میں نے تمہیں کبھی کوئی تکلیف دی۔

بیگم حق نے اخبار پھر رکھ دیا اور جواباً بولیں۔

میں بھی نہیں۔

میں نے تمہیں کبھی کوئی دکھ دیا، رعب جمایا؟

بیگم حق کو غصہ آ گیا۔ بولیں۔

ارے تم رعب جما کر تو دیکھو، کیا میرے ماں باپ نہیں یا میں کسی ایسے ویسے خاندان کی ہوں۔ میرے رشتے کی خاطر تو تمہارے باپ کے تین جوڑی جوتے گھس گئے ہوں گے۔

حق صاحب گھبرا گئے، جلدی سے بولے۔

نہیں، بیگم آپ غلط سمجھ رہی ہیں، دراصل میں صحیح طور پر بات نہیں کر سکا۔

یہ کون سی نئی بات ہے، آپ کبھی بھی صحیح طور پر بات نہیں کر سکے، مگر یہ تو بتایئے یہ رعب یہ دکھ، یہ تکلیف کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ آج مجھ پر احسان کیوں جتایا جا رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ حق صاحب بیگم کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ملازم نے آ کر کہا

بیگم صاحبہ آپ کا ٹیلی فون آیا ہے

اسے ہے کس کا، ایک منٹ کو چین نہیں۔

وہ چپل میں پاؤں ڈال حق صاحب کی طرف دیکھے بغیر اندر چل دیں اور حق صاحب سر کھجاتے رہ گئے۔ اتنے میں لان کے دوسرے کونے میں آرام کرسی پر دراز سہیل انہیں نظر پڑا حق صاحب نے اخبار اٹھایا اور سہیل کے پاس جا بیٹھے۔ بارہا ان کے جی میں آئی کہ شعاع کے مسئلے پر براہ راست سہیل سے گفتگو کریں، مگر بیگم حق ٹیلی فون کر کے واپس آ گئی تھیں۔

غزالہ جب گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو افتخار اور نعیم برآمدے کے دھندلے بلب کی زرد روشنی میں بیٹھے تھے۔ افتخار نے نگاہ اُٹھا کر اسے گھورا اور بولا۔

کہاں سے آئی ہو اس وقت

آپ کے حکم کی تعمیل کرنے گئی تھی۔

اچھا، باتیں تو بہت بنانے لگی ہو، کیوں نہیں ہوئی تعمیل پھر؟

آپ اندر آئیں تو بتاؤں گی۔

یہیں بتا دو، نعیم کوئی غیر نہیں ہے۔

نعیم اُٹھ کھڑا ہوا۔

نہیں ماموں آپ باتیں کریں مجھے کام ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ افتخار اور غزالہ اسے جاتا دیکھتے رہے۔ غزالہ نے سوچا

کیسا تہذیب یافتہ لڑکا ہے، داماد بھی اچھا ملتا اور جائداد بھی۔ مگر نہیں اب ہم نعیم کی جائداد زیادہ روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک بار نہیں، جب جی چاہے۔

افتخار نے کرخت لہجے میں کہا۔

کیا سوچنے لگیں، محترمہ غزالہ بیگم۔

تلخ لہجے کے باوجود غزالہ نے مسکرا کر افتخار کی طرف دیکھا تو وہ حیران سا ہو گیا۔ آہستہ آواز میں بولا۔

کیا بات ہے بہت خوش ہو۔

رات کو بتاؤں گی۔

اچھا ٹھیک ہے۔

افتخار نے بڑے ضبط سے کام لیا مگر غزالہ کی بات میمونہ بیگم نے سن لی۔ اس کے دماغ میں فوراً کھد بد شروع ہو گئی۔

ہائے کیا طریقہ کروں جو بات سن سکوں۔

اور جب رات کو غزالہ بیگم نے افتخار سے باتیں شروع کیں تو میمونہ بیگم ان کے پلنگ کے پاس والی کھڑکی کے باہر کان لگائے کھڑی تھی۔

افتخار نے کہا

اب جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے۔

غزالہ مسکرائی، عجیب سی مسکراہٹ، ایسی مسکراہٹ جو چہرے کو حسن نہیں بخشتی، بلکہ کریہہ بنا دیتی ہے۔ دل کی مکاری چہرے پر لا سجاتی ہے۔

افتخار نے کہا۔

اب کچھ بولو بھی۔

غزالہ نے کہا۔

ایک بات بتائیے، کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ شجاع آ جائے اور ہم اس کی شادی نعیم کے ساتھ کر دیں۔

ہاں ——

اور اس شادی کے بعد نعیم کی جائداد وغیرہ آپ کے قابو میں آ جائے اور مزید یہ کہ نعیم آپ کو کاروبار کے لئے بھی پیسہ دے گا۔

ہاں، مگر تم یہ . . . .

غزالہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بولی۔

سب ملا کر کتنا پیسہ ہو جائے گا بھلا آپ کے پاس

افتخار نے بڑی ہوشیاری سے غزالہ کے مکان کا اندازہ لگایا اور بولا۔

یہی کوئی بیس تیس ہزار کی جائداد اور بیس ہزار روپیہ وغیرہ۔

کافی رقم ہے۔

ہاں، ہے تو۔

افتخار کو یہ باتیں مزہ دینے لگیں۔ سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا اور پلنگ پر بیٹھی غزالہ کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

کوئی خاص بات ہے کیا؟

ہاں بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

توجلدی کھونا، سوچ کیا رہی ہو۔

اگر اتنا روپیہ بغیر کسی ہیر پھیر کے آپ کو شجاع کے بدلے میں مل جائے تو۔۔۔؟

کیا بکواس ہے، کون ہے جو اس بے وقوف، بدتمیز لڑکی کے بدلے اتنا روپیہ دے گا۔

ہے کوئی۔

افتخار کو غصہ آگیا اور بولا۔

دیکھو غزالہ بیگم مجھ سے اپنی ماں جیسی مکاریاں نہ کیا کرو، بتاؤ شجاع کہاں ہے میرا خیال ہے تم نے اسے ڈھونڈا ہی نہیں اور مجھے باتوں میں بہلا رہی ہو۔

غزالہ ذرا بھی نہ ڈری اور بولی۔

یہ بتائیں شجاع چاہیے یا روپیہ، مجھے کل ہی جواب دینا ہے۔

بات تو پوری بتاؤ، یونہی بکے چلی جا رہی ہو۔

میمونہ بیگم نے کان بالکل کھڑکی سے چپکا دیئے۔ غزالہ بولی۔

شجاع ایک بہت امیر آدمی کے گھر میں ہے۔ اس آدمی نے اسے بیٹی بنا لیا ہے۔ پوزیشن یہ ہے کہ اگر ہم زبردستی کریں گے تو لڑکی اور روپیہ دونوں جائیں گے کیونکہ ممکن ہے شجاع آنے سے انکار کر دے، لیکن اگر ہم اس امیر آدمی سے معاملہ طے کریں تو وہ مُنہ مانگا روپیہ دینے کو تیار ہے۔

افتخار نے اسے شک کی نظروں سے گھورا۔

وہ کیوں؟

اس لئے کہ اس کی بیٹی جو شجاع کی ہم شکل تھی، بچھڑ گئی تھی، وہ آدمی بیمار ہو گیا۔ شجاع نرس بن کر اس کے ہاں گئی اور اس آدمی نے اسے بیٹی بنا لیا۔

لو! یونہی بیٹی بنا لیا۔

غزالہ نے کہا۔

آپ ان باتوں پر کیوں جاتے ہیں۔ میں نے جو بات آپ سے کہی ہے اس کا جواب دیں۔

کتنا روپیہ دے گا وہ شخص۔

منہ مانگا۔

اگر میں اس کی ساری دولت جائداد مانگ لوں تو۔۔۔؟

غزالہ نے ایک لمحے کو نعمان کا خیال کیا، اس کی باتیں، اس کا انداز پھر بڑے یقین سے بولی۔

"مجھے یقین ہے ہم جو کچھ مانگیں گے وہ دے گا۔"

واہ بھئی شجاع تو بہت قیمتی نکلی، اب تو سوچنا ہی پڑے گا۔

تو کب سوچیں گے، کل جواب دینا ہے۔

افتخار نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

غزالہ بیگم اب ہماری مرضی ہے جب جی چاہے جواب دیں، چیز ہماری ہے، قیمت ہم لگائیں گے اور انتظار کرے گا خریدنے والا۔

میمونہ بیگم سوچتی رہ گئی کہ بات کیا ہے، کون ہے وہ شخص۔ ایک دم اسے نعمان کا خیال آیا گر دل نے فوراً ہی کہا۔

ارے نعمان کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ وہ بیٹی کے بدلے لوگوں کو مُنہ مانگے روپے دے۔

پھر کون شخص ہے۔ وہ دبے پاؤں آکر رضائی میں گھس گئی اور ذہن ان گتھیوں کو سلجھانے میں لگ گیا۔

ناشتے کی میز پر حق صاحب نے سیمیں سے کہا۔

تم کب سے نہیں گئے نعمان صاحب کے ہاں۔

سہیل نے جواب دیا۔

آپ کے ساتھ ہی گیا تھا' اس کے بعد نہیں جا سکا۔

بیگم حق نے لقمہ دیا۔

تمہیں تو روز جانا چاہیے مزاج پرسی کے لئے' آخر کو وہ تمہارے ہونے والے سسر ہیں کیسی نیک بچی ہے بنتی ـــــ اس گھر میں آئے گی تو اُجالا ہو جائے گا۔

سہیل خاموشی سے چائے پیتا رہا اور حق صاحب بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دراصل وہ خود میں ہمت پیدا کر رہے تھے کہ شعاع کے بارے میں بیگم سے کہہ دیں مگر بسیار کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

بیگم نے کہا۔

آخر بات کیا ہے؟

کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔

تو پھر اتنا بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟

حق صاحب کا جی چاہا کہ کہہ دیں، مگر انہوں نے بیگم سے کچھ کہنے کی بجائے سہیل سے کہا۔

بیٹے تم نعمان صاحب کو دیکھنے نہیں گئے

نہیں ابا جی۔

آج ضرور جاؤ۔

بیگم حق نے کہا

میں تو کہتی ہوں روز جایا کرے۔

اور سہیل کے سامنے شعاع کا سراپا آ گیا۔

وہی بھولی بھالی لڑکی، وہی آنکھیں، وہی بال۔

سہیل نے کہا۔

جو حکم ابا جی

بیگم حق نے کہا۔

یہ ان کا نہیں میرا حکم ہے۔

سہیل نے کہا

جو حکم امی جی

شام کے ملگجی سائے سیاہ ہو رہے تھے۔ شعاع نعمان کو دوا کھلانے کے بعد بالکنی پر کھڑی دھیرے دھیرے سیاہ ہوتے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ آج کل اس کے دل پر ہر وقت ان کی بدلیاں چھائی رہتی تھیں کہ غزالہ اب آئی، اب آئی۔ سہیل نے بالکونی میں سفید دوپٹہ دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ شعاع وہاں کھڑی ہے۔ سہیل اندر آ گیا۔

اندر کوئی نہ تھا۔ شاید سب بازار گئے ہوئے تھے۔

وہ نعمان کے کمرے میں دبے پاؤں گزرتا ہوا شعاع کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

شعاع کچھ بڑبڑا رہی تھی، مگر الفاظ صاف سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد شعاع پھر بڑبڑائی۔

مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے' ورنہ غزالہ مجھے جینے نہ دے گی۔ اور پھر بنتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو بھی تو میرا یہاں رہنا پسند نہیں۔ میں کیا کروں۔ میں نے کب چاہا کہ سہیل کو اس سے چھینا
میں نے تو ہمیشہ دل پر جبر کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے سختی سے منع کیا۔ میں یہاں سے چلی جاؤں
یقیناً لبنیٰ سے اس کی شادی ہو جائے گی۔

نہیں نہیں اتنی جلدی نہیں، مجھے تھوڑی سی مہلت تو دو۔

شجاع نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ کس کی آواز تھی، یہ کون اس کی باتیں سن رہا تھا۔

سہیل ——

سہیل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اور ——

شجاع کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

سہیل نے کہا۔

شجاع ابھی اس گھر کو چھوڑنے کا وقت نہیں آیا۔

شجاع بوکھلا گئی۔

تم —— سہیل تم، تم کب آئے؟

سہیل نے کہا۔

بہت دیر پہلے۔

تو تم نے وہ سب باتیں —— ؟

ہاں، میں نے وہ سب باتیں سن لیں۔

اُف میرے خدایا، یہ سب کیا ہوا۔

سہیل نے کہا۔

اچھا ہی ہوا۔

اور پھر سہیل نے شجاع کی آنکھوں میں جھانکا

شجاع نے نظریں جھکا لیں۔ وہ سخت پریشان اور پشیمان تھی۔ آج تک اس نے جو راز
چھپائے رکھا، آج تک اس نے جو بھید کسی سے نہ کہا، آج وہ آشکار ہو گیا۔

سہیل نے شجاع کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔

شجاع، آج میں نے یہ ہاتھ پکڑ لیا ہے اور اسے کسی قیمت پر نہ چھوڑوں گا۔

شجاع کچھ نہ بولی، نہ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، البتہ دل سے دکھ کی بدلی اُٹھی
اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ نہ ہچکی، نہ سسکی، بس خاموش آنسو۔

سہیل نے جیب سے رومال نکال کر آنسو صاف کئے۔

چھی، اتنی بڑی ہو کر روتی ہو۔

شجاع، جواب یاس، ناامیدی اور مایوسی کی تصویر بن چکی تھی۔ سہیل کا یہ جملہ سن کر مسکرا دی۔
اور پہلی بار بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس نے محبت کی بھرپور نظر سہیل پر ڈالی۔

یہ بھیگا بھیگا سا چہرہ اور معصوم نظریں۔

سہیل کا دل دکھ سے بھر آیا۔ وہ شجاع کی زندگی کے چند پہلوؤں سے آگاہ تھا، کچھ تھوڑے سے
دکھ اسے معلوم تھے۔

سہیل نے کہا۔

شجاع، میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے پوچھا تھا کہ اپنی امی کو تمہاری امی کے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھیج دوں ۔ آج میں پھر وہی سوال کرتا ہوں۔

شعاع کا چہرہ جو چند منٹ پہلے تھوڑی دیر کو کھلا تھا پھر اُداس ہو گیا۔

بولو نا شعاع —— بولو اب مجھ میں انتظار کی تاب نہیں رہی۔ میں نے بہت دن صبر کیا بہت دن خود کو سمجھایا۔ مگر اب اسے نہیں سمجھا سکوں گا۔

شعاع نے کہا۔

میری امی؟

ہاں، اس دن تمہاری امی آئی تھیں نا۔

نہیں، میری کوئی امی نہیں ہے۔

مگر ——

ہاں، وہ عورت کہتی ہے، وہ میری امی ہے، مگر وہ میری امی نہیں ہو سکتی، میرے ذہن میں ماں کا جو تصور ہے، میرے ذہن میں ماں کا جو سراپا ہے، وہ تو ایک محبت، خلوص اور قربانی کا مجسمہ ہے، جو بیٹیوں کے سکھ خریدنے کی خاطر معلوم نہیں کیا کیا کر گزرتی ہیں اور جس خاتون کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ ماں نہیں ہو سکتی —— وہ کسی کی ماں نہیں ہو سکتی۔

سہیل نے کہا۔

شعاع، تم جذباتی ہو گئیں۔ میری بات توجہ اور غور سے سنو، میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں، زندگی کا ساتھی، اصل میں تو یہ دنیا کے رسم و رواج ہیں کسی کا رشتہ کسی سے مانگا جاتا ہے ورنہ مجھے صرف تمہاری رضامندی کی ضرورت ہے۔

شعاع نے کہا۔

سہیل اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم کیا کرو گے؟

میں اپنی امی کو کسی کے پاس بھیجوں گا جس سے وہ تمہیں مانگ لے۔

تم میری بات کا یقین کرتے ہو۔

ہاں۔

تو یقین کر لو کہ جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ نہیں ہو سکتا۔

تو کیا تم رضامند نہیں ہو۔

نہیں سہیل، یہ بات نہیں ہے، میں اگر رضامند ہو بھی جاؤں تو اس راہ میں بے حد دشواریاں ہیں

میں تمہارے ہاں کے لوگوں کو راضی کر لوں گا، یہ میرا ذمہ ہے۔

شعاع نے اسے پھر دیکھا۔

سہیل کتنا پیارا ہو گیا تھا۔

شعاع نے کہا۔

اگر تمہارے والدین راضی نہ ہوئے تو؟

سہیل نے مسکرا کر کہا۔

انہیں تم منا لینا۔

شعاع مسکرا دی۔

تو اس بات کا یقین کر لو کہ دونوں طرف سے کوئی راضی نہ ہو گا۔

تو میں بغاوت کر دوں گا۔

مگر میں لڑکی ہوں، میں تو بغاوت بھی نہیں کر سکتی۔

کیوں نہیں کر سکتی؟

شعاع نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔

سمجھانے کی ضرورت نہیں، بس تم ہاں کر دو۔

ان لوگوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور کار کے اندر سے حنا اور لبنیٰ اتریں۔

سہیل اور شعاع پریشان ہو گئے۔ سہیل جلدی سے پلٹا اور پھر دبے قدموں نعمان صاحب کے کمرے سے ہوتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔

سیڑھیاں اُتر کر وہ برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ حنا اور لبنیٰ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سہیل بوکھلایا ہوا سا تھا۔

حنا نے کہا

سہیل کیا بات ہے ؟

وہ ذرا میں انکل سے ملنے آیا تھا۔

مل لیے ؟

جی جی —— جی ہاں ——

تو جلدی کیا ہے، آؤ چائے پی کر جانا۔

جی اس وقت تو نہیں، پھر کبھی آؤں گا۔

اور سہیل جلدی سے باہر نکل گیا۔

سہیل نعمان کے ہاں گیا تو گھر میں کوئی نہ تھا۔ صرف شعاع بالکونی میں کھڑی تھی یا نعمان اپنے
رے میں آرام کر رہا تھا۔ سہیل دبے پاؤں شعاع کے پاس جا کھڑا ہوا۔ آج پہلی بار شعاع نے
الس سے بات کرنا گوارا کی تھی۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت تھی۔ مگر دونوں
ہانتے تھے کہ سہیل کے والدین اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔ سہیل بغاوت پر آمادہ تھا۔
گر شعاع کا کہنا تھا کہ میں تو لڑکی ہوں، میں بغاوت بھی نہیں کر سکتی۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کار
گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ حنا اور لبنیٰ اس میں سے اُتریں۔ سہیل جلدی سے پلٹا سیڑھیاں اترتے
یہاں حنا اور لبنیٰ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سہیل بوکھلایا ہوا تھا۔ حنا کے پوچھنے پر اس نے کہا۔

میں انکل سے مل کر آیا ہوں۔

اس کے بعد وہ تیزی سے باہر کی سمت لپکا۔ حنا اور لبنیٰ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہ گیئں اور وہ انہیں حیرت زدہ چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا۔ پھر حِنا نے لبنیٰ کی طرف اور لبنیٰ نے حِنا کی طرف دیکھا۔ لبنیٰ کی آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا۔ چہرے پر عجیب سا غبار چھایا تھا اور وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹ رہی تھی دھیرے دھیرے۔ اس کی دلی کیفیت کو حِنا نے بھی سمجھ لیا تھی اس لیے مسکرا کر بولی۔

عجیب لڑکا ہے، نہ سلام نہ دعا اور بھاگا یوں ہے جیسے اسے پکڑ کر باندھ ہی تو لیں گے۔ خیر کب تک بھاگے گا۔

حِنا نے شرارت بھری نظروں سے لبنیٰ کی طرف دیکھا مگر لبنیٰ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ حنا سمجھی وہ شرما رہی ہے۔ اس لئے دبا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

اچھا ٹھیک ہے بھئی۔ تم چلو میں آتی ہوں۔

لبنیٰ نے کھڑے کھڑے اوپر راہداری کی طرف نگاہ ڈالی۔ کمروں کے پردے ہلکی ہلکی ہوا میں مزے سے جھولا جھول رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دودھیا روشنی بکھیرتے بلب اسے نجانے کیوں زرد زرد دھندلے دھندلے لگ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اوپر چڑھنے لگی۔ حِنا نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر ڈرائیور سے شاپنگ کے پیکٹ پکڑنے لگی۔ وہ لبنیٰ کے جہیز کے لئے بے حد نفیس چیزیں خرید کر لائی تھی۔ حق صاحب اور بیگم حق کا بار بار آنا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ وہ لبنیٰ اور سہیل کے رشتے کو نئے سرے سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس بار حنا نے سوچا تھا کہ منگنی کرنے کی بجائے شادی ہی کر دی جائے۔ یوں بھی لبنیٰ ایم۔ اے کے امتحان سے فارغ تھی اور دوسری بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ گو حِنا نے اس سلسلے میں نعمان سے کوئی بات نہ کی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ نعمان کی بھی اس سلسلے میں وہی خواہش ہوگی جو اس کی ہے۔

ہمارے لئے کیا لائی ہیں؟

سلمان دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اترا۔ حِنا نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور بولی۔

اب تم اتنے چھوٹے نہیں ہو کہ ہر بات سمجھانی پڑے۔

کیا ہوا امی؟

اس نے تعجب سے ماں کی طرف دیکھا۔

حِنا نے کہا:

تمہیں معلوم ہے تمہارے ابّو کی طبیعت ٹھیک نہیں پھر اتنا شور کیوں مچاتے ہو۔

سوری امی۔

سلمان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ تو اپنی چیزوں کی خوشی میں بھاگا ہوا آیا تھا۔ حِنا کو پیار آیا، اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی:

میں تمہارے لئے بہت ساری چیزیں لائی ہوں مگر رات کے کھانے کے بعد دکھاؤں گی، پہلے تمہارے ابّو کو دکھا لوں۔

ٹھیک ہے۔

سلمان ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا نیچے چلا گیا۔ حِنا گہری محبت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

لبنیٰ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے اسی کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ حِنا نے پوچھا:

اپنے ابّو کے پاس گئی تھیں؟

ہوں۔

کیا کر رہے ہیں ؟

سو رہے ہیں۔

سو رہے ہیں ؟ مگر وہ ــــ خیر ــــ

دونوں نعمان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ واقعی سو رہا تھا۔ اندھیرا کمرہ اس بات کا شاہد تھا کہ اس سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ ورنہ ڈھلتی ہوئی شام کے باوجود وہاں اندھیرا نہ ہوتا۔ نعمان تو اذان سے پہلے ہی بتیاں جلانے کا کہہ دیا کرتا تھا۔ اندھیرے کمرے میں کھڑی حنا سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی سہیل نعمان سے ملنے آیا تھا ؟ پھر اس نے سوچا۔

ہو سکتا ہے وہ نعمان کو سوتا دیکھ کر واپس آ گیا ہو، مگر نہیں۔ اس نے غالباً یہ کہا تھا کہ میں الکل سے ل کر آ رہا ہوں۔ پھر وہ بوکھلایا ہوا بھی تو تھا۔ اگر سہیل نعمان سے نہیں ملا تو اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

حنا ان ہی خیالات میں گم دبی کھڑی تھی کہ لبنیٰ نے روشنی جلادی۔ بجلی کے بٹن کی ہلکی سی ٹِک نے جہاں حنا کو خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لیا وہیں نعمان نے بھی آنکھ کھول دی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت سویا ہے۔ آنکھیں مچمچاتا ہوا وہ مسکرا کر بولا :

ارے تم شاپنگ کر کے آ بھی گئیں۔

پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور تکیے کے سہارے بیٹھتا ہوا بولا :

کمال ہے، میں بہت سویا ہوں۔ اس وقت کی دوا بھی نہیں کھائی۔

حنا نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے سرکا دیئے۔ لبنیٰ صوفے پر بیٹھی اپنے ناخنوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ نعمان نے زور سے آنکھیں ملیں اور بولا :

کیا کیا خرید لائیں ؟ دیکھوں بھلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چائے پی لیجئے پھر اطمینان سے دکھاؤں گی۔

اچھا تو منگواؤ۔ میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں۔

نعمان غسلخانے میں چلا گیا تو حنا نے لبنیٰ سے کہا :

جاؤ بیٹی، چائے لگواؤ۔

ابو کی چائے بھجوا دوں ؟

نہیں، میں چاہتی ہوں وہ بھی ہمارے ساتھ چائے پئیں۔

لبنیٰ خاموشی سے چلی گئی۔ حنا کھڑکی میں کھڑی اندھیرے میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی رہی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر شعاع اندر آئی۔ حنا نے پلٹ کر گہری نظروں سے دیکھا۔ زرد سفید چہرہ آنکھیں جھکائے، سفید دوپٹے میں سر چھپائے وہ ٹوٹی پھوٹی سی مورت لگ رہی تھی۔ حنا کو اس پر ترس اور پھر پیار آ گیا۔ وہ شعاع کو دیکھتی رہی۔ شعاع نے دوا کی شیشی اٹھائی کیپسول نکالا اور تھرماس اُٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا۔ نعمان چونکہ موجود نہ تھا اس لئے آہستہ سے بولی :

نعمان صاحب نے شام کی دوا نہیں کھائی۔

کوئی بات نہیں، حنا نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔

دونوں طرف خاموشی تھی۔ آخر حنا نے کہا۔

شعاع ! تم سفید کپڑے نہ پہنا کرو۔

شعاع نے تعجب سے آنکھیں کھول کر حنا کو دیکھا۔ بہت دن پہلے یہی بات اس نے شعاع سے کہی تھی۔ مگر شعاع کے پاس تھے ہی سفید کپڑے، اس لئے وہ تب بھی خاموش رہی تھی اور اب بھی خاموش ہو گئی۔

حنا نے پھر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم لڑکی ہو، جوان لڑکی۔ یہی دن تو کھانے پہننے کے ہوتے ہیں۔ اور پھر سفید رنگ بڑی بڑی لوگوں کے لئے ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے گلابی ساڑھی لائی ہوں۔ پہنو گی نا؟

حنا نے بے اختیار ہو کر شعاع کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شعاع کے لئے ساڑھی نہیں لائی تھی۔ مگر اس کے پاس ایک گلابی ساڑھی رکھی تھی جو ایک بار نعمان نے لا کر دی تھی حنا کا ارادہ تھا کہ بنی کی شادی پر وہ گلابی ساڑھی پر گوٹے کا کام بنوائے گی مگر اس وقت اس کے دل میں شعاع کی ممتا نے اتنا زور مارا کہ وہ اپنے شوہر کا دیا ہوا تحفہ اسے دینے کو تیار ہو گئی۔ اس نے پھر پوچھا:

بولو، پہنو گی؟

شعاع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شروع میں جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو حنا اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد وہ توجہ وہ محبت کم ہو گئی۔ اتنے عرصے بعد پھر اتنے میٹھے بول سن کر شعاع کو تصنع کا احساس ہوا۔ اسے خیال ہوا کہ حنا اس پر ترس کھا رہی ہے۔ کیونکہ شعاع کی تقریباً ساری ساڑھیوں کے پلو شکستہ تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس پر ترس کھائے۔

نعمان غسل خانے سے آیا تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ حنا اتنی محبت سے شعاع سے باتیں کر رہی ہے۔ شعاع نے ہاتھ بڑھا کر دوا پیش کی۔ نعمان پلنگ پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

تم نے آج مجھے شام کی دوا نہیں دی۔

آپ سو رہے تھے۔

نعمان نے کیپسول کھا لیا، پھر حنا سے مخاطب ہوا:

چائے نہیں منگوائی -؟

نہیں، آپ باہر تو نکلا کریں ذرا۔ اٹھئے ہمارے ساتھ چائے پئیں آج۔

نعمان نے سستی بھری نظروں سے حنا کی طرف دیکھا اور بہت ہی سست لہجے میں بولا

نہیں بھئی جی نہیں چاہتا باہر نکلنے کو، بس تم چائے منگوا لو۔

اٹھئے بھی -! حنا نے بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

اگر شعاع اجازت دے دے تو چلتا ہوں۔

شعاع نے گھبرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ غلط موقعے پر کھڑی ہے اس لئے بڑی مشکل سے بولی:

جی — میں — میں جاتی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ اب حنا نے لہجے میں پیار بھر کر کہا:

ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ چائے پئیں۔ مدت ہی ہو گئی ہے ہمیں آپ کے ساتھ چائے پیئے ہوئے۔

نعمان نے کہا:

اچھا بھئی چلتا ہوں۔ مگر مجھے ذرا دوسرا کرتہ پاجامہ دو۔

حنا نے الماری میں سے دھلا ہوا کرتہ پاجامہ نکالا۔ پاجامے میں ازار بند پروتے ہوئے اس نے کہا:

سہیل سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟

نعمان گریبان کے بٹن کھول رہا تھا۔ ایک لمحے کو رکا اور بولا:

سہیل سے۔ کب؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ آیا ہو گا۔۔۔

سہیل آیا تھا۔ کب آیا تھا؟ یہاں تو نہیں آیا۔

اچھا — ؟

حنا نے ایک لمحے کو حیرت سے نعمان کی طرف دیکھا اور بولی:

مجھے تو سیڑھیوں پر ملا تھا کہہ رہا تھا کہ انکل سے مل کر آیا ہوں۔

تمہیں کب ملا تھا؟

آج جس وقت میں بازار سے آئی ہوں۔ لبنیٰ کے سامنے ہی تو ملا تھا۔

خوب تعجب ہے۔

اور ہم آئے تو آپ سو رہے تھے، روشنی بھی گل تھی۔

یکدم نعمان کی سمجھ میں بات آ گئی۔ قہقہہ لگا کر بولا:

ایسا لگتا ہے بیگم میں سٹھیا گیا ہوں۔ ہاں سہیل آیا تھا، تھوڑی دیر بیٹھا۔ مجھے نیند آ رہی تھی اس لئے جب وہ جانے کو اُٹھا تو میں نے کہا تھا کہ روشنی گل کر دو۔

کس لئے آیا تھا؟

طبیعت کا معلوم کرنے آیا ہو گا۔

آیا ہو گا سے کیا مطلب؟

بھئی بیگم، دراصل میں اس کے جانے کے بعد سو گیا تھا۔ اس لئے کچھ یاد نہیں۔ اب جا کر اتنا تو یاد آیا کہ وہ آیا تو تھا۔ کیا باتیں ہوئیں یہ بھی یاد آ جائے گا۔

مگر وہ اتنا بوکھلایا ہوا کیوں تھا۔ کیا کہہ دیا تھا آپ نے؟

بوکھلایا ہوا تھا؟ عجیب بچہ ہے، بوکھلایا بوکھلایا سا رہتا ہے۔ دراصل بیگم یہ عمر ہی ایسی

ہوتی ہے۔

حنا کو نعمان کی باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ وہ تو سرسری انداز سے پوچھے جا رہی تھی۔

نعمان کپڑے بدل کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ حنا نے کہا:

اب چلئے بھی۔ یہاں کیوں بیٹھ گئے؟

نعمان لیٹ گیا اور مسکرا کر بولا:

یہاں چائے لاؤ تو مزہ آئے گا۔

حنا بھی مسکرا دی۔ اس نے محبّت بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا جو اسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اس شرارتی کیفیت کے پیچھے ایک الجھن تھی جو حنا کی نظروں سے اوجھل تھی۔ اس الجھن کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا کر نعمان نے پھر کہا:

کیا دیکھ رہی ہیں بیگم۔ گرم گرم چائے پلوائیں۔

اچھا جناب۔

اور خود بھی میرے ساتھ پئیں۔

دوسری بار اچھا جناب۔

حنا مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کے باہر جاتے ہی نعمان کے چہرے کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ اس نے خود سے کہا۔

سہیل آیا تھا۔ کب آیا تھا اور کیوں؟

نعمان کو شجاع کا زرد چہرہ یاد آ گیا۔ اسے کچھ کچھ خیال ہوا کہ سہیل شجاع سے ملنے آیا ہو گا اس سے کیا باتیں ہوئیں۔ کہیں اس بے وقوف نے سہیل کو نا اُمید تو نہیں کر دیا۔

حنا چائے لائی تو نعمان آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ حنا نے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیابات ہے ؟

ذرا سر میں دھمک سی ہے

کچھ دیر پہلے کی شوخی اور شرارت کا دور دور پتہ نہ تھا۔ دونوں نے خاموشی سے چائے پی۔ نیچے ہال سے بچوں کے ہنسنے —— بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور وہ دونوں خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ اور سفید دوپٹہ سر پر ڈالے شعاع تنہا روح کی طرح بالکونی میں کھڑی تھی یہ بالکونی اس کے دکھوں اور آنسوؤں سے کسی حد تک واقف تھی۔ مگر شعاع سب سے بے نیاز نہ جانے دور جھکتے ہوئے آسمان کی وسعتوں سے کیا تلاش کر رہی تھی۔ شاید اپنے وجود کا مصرف یا اپنی تقدیر کا ستارہ۔

رات کو نعمان نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ سر درد کا بہانہ کر کے انکار کر دیا۔ کھانے کے بعد حنا شاپنگ کا سامان اٹھا لائی۔ اور ساتھ ہی اپنے بکس میں سے ایک گلابی ساڑھی بھی۔ نعمان بظاہر انہماک سے چیزیں دیکھتا رہا۔ مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا:

اتنی چیزیں خرید لائیں ؟

آخر بیٹی والی ہوں نا۔

کیا مطلب ؟

یہ لبنیٰ کے جہیز کے لئے ہیں۔

پہلے کوئی رشتہ تو ملے پھر جہیز تیار کر لینا۔

نعمان نے ایک ڈیکوریشن پیس اٹھاتے پلٹاتے ہوئے کہا۔

حنا اس وقت گلابی ساڑھی پکڑے ہوئے بڑی حیرت سے بولی:

کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ رشتہ ملنے سے کیا مطلب۔ رشتہ تو ہو چکا ہے سہیل کے ساتھ۔

ارے ہاں، ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ہاں سہیل۔ سہیل۔

اس نے سہیل کا نام زیر لب کئی بار دہرایا۔ حنا تعجب سے دیکھتی رہی۔ نعمان نے اس کی نظروں

ے بچتے ہوئے کہا:

یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں ؟

ساڑھی ہے۔

حنا نے بجھے دل سے کہا۔ اس کا دل نعمان کی کیفیت کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ نعمان نے حنا کا اترا

ہوا چہرہ دیکھا تو ذرا مسکرا کر بولے:

پنے لئے لائی ہو۔ دیکھوں ذرا۔

حنا نے ساڑھی آگے بڑھا دی۔ نعمان نے کہا:

اچھی ہے —— رنگ اچھا ہے۔

شعاع کے لئے لائی ہوں۔

کیا —— ؟

نعمان نے ساڑھی دبوچ لی۔ اس کے چہرے پر آتی ہوئی رنگت حنا سے پوشیدہ نہ رہی۔ نعمان

بار بار ساڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر بولا:

دے دو اسے بلا کر۔

پھر اسے اپنے خوشی سے کھنکتے لہجے کا خیال آیا۔ ایسی بے قابو خوشی، اس طرح ہر بات حنا پر

عیاں ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے ساڑھی ایک طرف ڈال دی اور بولا:

لاؤ دیکھیں اور کیا کیا خرید ڈالا ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ کو افتخار سے بات کیے کئی دن گذر گئے تھے۔ مگر افتخار نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا
آج کل وہ دفتر بھی نہیں جا رہا تھا۔ سارا سارا دن گھر میں — بیٹھا ہونٹوں میں بڑبڑاتا رہتا کبھی اخبار
کے حاشیے پر کچھ لکھتا رہتا۔ اٹھ کر جاتا تو کئی بار میمونہ بیگم نے اخبار اٹھا کر دیکھا۔ مگر ہندسے لکھے تھے
کبھی افتخار باہر کی دیوار کے پاس بیٹھا دیوار پر ہی ڈھیلے سے لکھتا رہتا۔ افتخار کی اس کیفیت کو نعیم
اور میمونہ بیگم نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ رہی غزالہ تو وہ صبح اُٹھ کر اسکول چلی جاتی اس کے
بعد جب بھی اس نے افتخار سے بات کرنے کی کوشش کی تو جواب نہ پایا۔ سو وہ خوش تھی کہ ہر وقت
کی نیلی پیلی آنکھوں اور گالیوں سے نجات ہوئی۔

سونے میں بھی وہ بڑبڑاتا رہتا:

پچیس ہزار — پچاس ہزار — ایک لاکھ — کوٹھی — کار — روپیہ

غزالہ یہ سنتی بھی تو کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگتی۔ اور دو ایک بار تو افتخار نے
بہت تنگ کیا۔ رات میں اٹھ اٹھ کر شور مچانے لگا:

چور — چور

تب غزالہ نے اسے جھنجوڑ ڈالا کہ کہاں ہے چور؟
جب سے افتخار کو معلوم ہوا تھا کہ شعاع کے بدلے روپیہ مل جائے گا۔ روپے کے تصور نے
اس کا چین چھین لیا تھا۔ مگر غزالہ بھی کسی سے کم نہ تھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ افتخار — بھی روپیہ
لگے ٹھیک ہے۔ پھر کار ہوگی، کوٹھی ہوگی۔ اس کی نظروں کے سامنے نعمان کی کوٹھی اور کار گھوم جاتی
اور جب بھی تصور کرتی، نعمان کی کوٹھی کے آراستہ کمرے اس کی نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتے ایک
یونہ بیگم تھیں جسے صرف اتنی فکر تھی کہ کسی سے معلوم ہو جائے کہ وہ دولت مند شخص کون ہے۔ یا کہیں
سے شعاع ہی مل جائے تاکہ اسے بتلایا جا سکے کہ افتخار اور غزالہ اسے بیچ رہے ہیں۔ نعیم اس چکر میں تھا
کہ ماموں جان کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔

پچیس ہزار نہیں پچاس ہزار۔
میمونہ بیگم جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر کن سوئیوں لینے کو گھومتیں، نعیم اپنے کمرے میں
عقدے حل کرتا۔ غزالہ تصورات میں خود کو سیٹھانی محسوس کرتی۔
رہا افتخار تو اس کی دیوانگی روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ اب تو میمونہ بیگم اسے دس سناتیں
مگر وہ جواب نہ دیتا۔

چیز ہماری ہے، قیمت ہم لگائیں گے۔

اور —

انتظار کرے گا خریدنے والا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تو اس کے پچاس ہزار لوں گا۔

پورے پچاس ہزار ایک پیسہ کم نہیں۔ نہیں نہیں میں پچاس ہزار میں اسے نہیں بیچوں گا
میں تو ایک لاکھ روپے میں بیچوں گا۔ پورے ایک لاکھ میں۔

نہیں ٹھہرو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک لاکھ کم ہوں۔ ہاں، یہ دام کم ہیں۔ مجھے ڈیڑھ لاکھ ملنے چاہییں۔ ہاں پورے ڈیڑھ لاکھ روپے۔

اور پیسے ملتے ہی میں کوٹھی خرید لوں گا۔

نہیں مکان ہی ٹھیک ہے۔ میں کار خرید لوں گا۔

خوب صورت سی کار۔

بالکل نئی۔ لمبی کار

اور ڈرائیور بھی رکھوں گا۔

اور پھر میں افتخار نہیں سیٹھ افتخار کہلاؤں گا۔

مگر ــــ

کہیں ایسا نہ ہو وہ خریدنے سے ہی انکار کر دے۔

کچھ یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنی خود سر، ضدی، بددماغ لڑکی کو کوئی کیوں خریدنے لگا۔

اور

اگر کوئی یوں ہی کہہ رہا ہو تو ــــ ؟

میں تو کہتا ہوں اس کے پچیس ہزار ہی مل جائیں۔

پچیس ہزار اس بدتمیز لڑکی کے . . . .

لیکن اس بات کا کیسے پتہ چلے کہ اس لڑکی کی صحیح قیمت کیا ہے۔ کہیں پچیس ہزار بھی میں ہاتھ سے دھو بیٹھوں۔

ٹھیک ہے جب وہ منہ مانگی قیمت دے رہا ہے تو میں منہ مانگی قیمت لوں گا۔

اور پھر روپیہ ــــ کوٹھی ــ اور ــــ

لمبی سی نئی کار

میمونہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی پاس سے گزریں۔ افتخار کو ہاتھ جھٹک جھٹک کر باتیں کرتے دیکھا تو ٹھٹک کر بولیں:

اے کیا بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے ؟

افتخار تو فرضی کار میں سوار تھا۔ جھڑک کر بولا:

ہٹ بڑھیا۔ گاڑی کے نیچے نہ آ جانا۔

میمونہ بیگم سیدھی نعیم کے کمرے میں پہنچیں اور بڑے طنز سے بولیں:

چلو صاحبزادے، اب یہاں سے بھاگو۔ تمہارے ماموں تو گئے عقل و ہوش سے۔

حق صاحب دونوں ہاتھ پیچھے باندھے نہایت تیزی کے ساتھ ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کبھی وہ لان میں رکھی بید کی کرسیوں پر جا بیٹھے اور ایک پل بعد اٹھ کر چلنا شروع کر دیتے۔ بیگم کافی دیر سے برآمدے میں بیٹھی یہ باتیں نوٹ کر رہی تھیں۔ آخر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور لان میں جا پہنچیں جہاں حق صاحب ان کی آمد سے بے خبر ٹہل رہے تھے۔

اے ہے بات کیا ہے ؟

بیگم حق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹہلتے ہوئے حق صاحب ایک لمحے کو رُکے، غور سے بیگم کی طرف دیکھا اور پھر اسی زور
شور سے ٹہلنے لگے۔

توبہ ہے، مَیں کیا پوچھ رہی ہوں۔

بیگم حق نے حق صاحب پر نظر جمانے کی کوشش کی مگر وہ تو گھڑی کے پنڈولم کی طرح
گھوم رہے تھے۔

یہاں آیئے!

بیگم حق نے غصے سے پھر کہا۔

مَیں کہتی ہوں یہاں آیئے اور بیٹھ کر بات کریں۔

حق صاحب آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ بیگم حق نے کہا:

اب کہئے کیا بات ہے۔ آپ کو ہر دوسرے دن یہ دورہ کیوں پڑنے لگا ہے؟

بیگم میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

کہئے۔

مَیں نے کبھی تم پر کوئی زیادتی کی ہے؟ بولو۔

کہتے جایئے:

مَیں سہیل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

سہیل کے بارے میں کیا بات کرنی ہے؟

میں اس کا باپ ہوں۔

حق صاحب نے اپنی بات کو وزنی بنانے کے لئے زور سے بید کی میز پر مکا مارا، بید ٹوٹ گئی
اور ان کا ہاتھ پھنس گیا۔ بیگم حق نے نہایت سلیقے سے آہستہ سے ان کا ہاتھ نکالا اور خلاف توقع

بڑی نرمی سے بولیں:

یہ بات نہ بھی کہیں تو حقیقت ہے۔

اف بیگم، یہ مذاق کا موقع نہیں ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں سہیل کا باپ ہوں لیکن آج تک
میں نے کبھی تمہاری باتوں اور تمہارے کاموں کو نہیں جھٹلایا۔ مگر آج میں اپنا حق مانگتا ہوں۔

اللہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ڈھنگ سے بات بتائیں بھی۔ آخر بات کیا ہے۔ میرا
دماغ خالتو نہیں۔

حق صاحب نے دیکھا، بیگم اب پٹڑی سے اترنے والی ہیں، جلدی سے بولے۔

میں سہیل کے رشتے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

سہیل کا رشتہ طے تو ہو چکا ہے۔

نہیں، وہ والا رشتہ نہیں۔ میں سہیل کی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بھی تو آپ کی پسند تھی۔

تھی ضرور، اب نہیں ہے۔ ایک بار بات ختم ہو گئی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں
کوئی مصلحت ہو۔

مصلحت کی بات پر بیگم حق موم ہو گئیں، بولیں:

پھر—— سب کو معلوم ہے کہ سہیل کی شادی کہاں ہو گی۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لڑکی میں نے دیکھ لی ہے بلکہ تم نے بھی۔ میں سہیل کی شادی
اس سے کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم حق نے دیکھی بھالی لڑکیوں کو یاد کرنے کی لاکھ کوشش کی۔ مگر سمجھ نہ پائیں۔ بولیں۔

اوں تو لبنیٰ اچھی لڑکی ہے۔ لوگ ہماری حیثیت کے ہیں۔ نعمان آپ کا دوست ہے لیکن پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی آپ دوسری لڑکی کا نام بتا ئیں ؟

تم نے نعمان کے گھر دیکھی ہوگی۔

حق صاحب اب بھی ڈر رہے تھے بیگم حق نے جھلا کر کہا۔

بتا کیوں نہیں دیتے۔ خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے۔

ارے بیگم وہ لڑکی ہے نا شعاع۔

کون شعاع ؟

وہ جو نعمان کے گھر میں رہتی ہے۔

بیگم حق بھڑک ...یں:

ارے وہ نرس۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والی۔ وہ دو ٹکے کی چھوکری۔ تم ...بہو بنانا چاہتے ہو، شرم کرو۔

حق صاحب نے ہمت کر کے بات کہہ دی تھی تو اب وہ پیچھے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، کہنے لگے :

ہاں وہی لڑکی، میں اسی سے سہیل کی شادی کروں گا۔

ناک چوٹی کاٹ کر باہر نکال دوں گی اس کی۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے پھٹکار اس کی صورت پر۔ یہ نرسیں۔ ارے ان کا کیا اعتبار جانے کہاں کہاں پھرتی ہیں۔ کان کھول کر سن لو آئندہ اس کا نام نہ لینا۔

بیگم آئندہ کیا۔ میں تو ابھی نام لیتا ہوں۔ میں جہاں چاہوں بیٹے کی شادی کر سکتا ہوں۔ کوئی زن مرید نہیں ہوں۔

بیگم حق کھڑی ہو گئیں۔ حق صاحب نے بڑے رعب سے کہا :

بیٹھ جاؤ بیگم اور میری بات سنو۔

بیگم حق بیٹھ گئیں اور بولیں۔

تم پر تو اس کی ماں ہی جادو کر گئی تھی۔ آیئے خاتون — بیٹھئے خاتون۔ ارے وہ چٹک مٹک کرنے والی عورتیں۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ کیسی گھنی بنتی ہے اور کرتوت دیکھو۔ ارے میرا بیٹا تو پھانسا ہی تھا اور اب شوہر کو پھسلا رہی ہے۔

کیا بکتی ہو — میں اس لڑکی کو بیٹی سمجھتا ہوں۔

ارے کس کی بیٹی۔ کیسی بیٹی ؟

اور اب اسے بہو بنا کر لاؤں گا۔

میں جوتے مار کر نکال دوں گی۔

تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔

میں ابھی نعمان کے گھر جا کر اسے جوتے مارتی ہوں۔

اگر گھر سے قدم نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

تو سن لو، سہیل کی شادی لبنیٰ سے ہوگی۔

نہیں، سہیل کی شادی شعاع سے ہوگی۔

کبھی نہیں۔

بیگم یہ اطلاع ہے مشورہ نہیں۔

دیکھوں گی کیسے ہوتی ہے شادی۔

دیکھ لینا۔

حق صاحب کی جھجک ایک بار کھلی تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ تو خواہ مخواہ ہی ساری عمر ڈرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے ہیں۔ بیگم حق غصے سے پھنکارتی اندر چلی گئیں اور حق صاحب جن کا دل اب ہلکا ہو گیا تھا بیٹھے سوچ و بچار کرتے رہے۔

اس دن کے بعد روزانہ ہی یہ چخ چخ ہونے لگی۔ حق صاحب کو اب ان باتوں میں مزا آنے لگا۔ جہاں تنہائی ہوئی انہوں نے سہیل کی شادی کا ذکر شروع کر دیا۔ بیگم حق غصے میں نرسوں کو سینکڑوں کوسنے اور گالیاں دیتیں اور آخر میں کہتیں: دیکھوں گی!

اب تو وہ خوب چڑاتے کہ تمہاری سمدھن بھی کافی تیز معلوم ہوتی ہے۔ تم میں تو خوب جھگڑا ہوا کرے گا۔ بیگم حق خوب غصہ کرتیں۔ ممکن ہے سہیل کو ان باتوں کی خبر نہ ہوتی۔ مگر ایک دن کھانے کی میز پر بیگم حق نے سہیل سے بڑی بے بسی سے شکایت کی۔

ارے بیٹا تم نے سنا یہ تمہارے والد صاحب تمہاری شادی اس نرس سے کرنا چاہتے ہیں۔ سٹھیا گئے ہیں۔ دماغ چل گیا ہے ان کا۔

کس نرس سے؟

سہیل چکرا گیا۔

ارے وہی نعمان صاحب کی نرس۔ نام بھی انوکھا ہے شعاع۔

سہیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔ اس کے بعد بیگم حق نے لاکھ زور مارا۔ مگر سہیل نے اس معاملے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ حق صاحب اس کی کیفیت سے واقف تھے۔ بیٹھے مسکراتے رہے اور بیگم حق پیچ و تاب کھاتی رہیں۔

سہیل تیار ہو کر گاڑی کی چابی سنبھالے باہر نکلا تو برآمدے میں حق صاحب اور بیگم حق بیٹھے تھے۔ بیگم حق نے کہا:

سہیل، کہاں جا رہے ہو؟

انکل کے ہاں۔

کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔

حق صاحب نے فوراً مداخلت کی۔

ضرورت کیوں نہیں۔ ضرور جاؤ بیٹا۔

یہ نہیں جائے گا

یہ ضرور جائے گا۔

نہیں بیٹا۔ تم وہاں نہ جایا کرو۔

میں چاہتا ہوں یہ روز جائے۔

مگر میں نہیں چاہتی۔

تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا مطلب؟

وہ میرا بیٹا ہے۔

جی — اور وہ میرا بھی بیٹا ہے۔

تم اسے برباد کر رہے ہو۔

اور تم اسے تباہ کر دو گی۔

جھگڑا لمبا ہوتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے مصروف تھے۔ اس لئے موقع پا کر سہیل کھسک گیا۔ اس کی غیر موجودگی کو حق صاحب نے پہلے محسوس کیا۔ اس لئے قہقہہ لگا کر بولے:

وہ تو چلا بھی گیا۔

ڈاکٹر زیدی آئے تھے۔

حنا نے آکر اطلاع دی۔ نعمان نے کہا:

بھیج دو۔

حنا انہیں پہنچا کر چلی گئی۔ ڈاکٹر زیدی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

کیسی طبیعت ہے نعمان صاحب؟

اچھا ہوں۔

ارے صاحب بیمار کب تھے۔

نعمان نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا:

اب تو بستر پر لیٹے لیٹے محسوس ہوتا ہے گویا صدیوں کا بیمار ہوں۔

تو اٹھ کر گھر میں چلا پھرا کریں۔

جی نہیں چاہتا۔

اجی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شعاع کیسی ہے؟

بلواؤں؟

ہاں۔ ذرا بلوایئے تو . . .

ساتھ کا کمرہ اسی کا ہے، ذرا خود ہی پکار لیں۔

ڈاکٹر زیدی اٹھ کر باہر گئے۔ وہیں حنا مل گئی۔ چپکے سے بولی۔ ڈاکٹر صاحب اب نعمان کیسے ہیں؟

اللہ کا فضل ہے بس انہیں ذرا چلنا پھرنا چاہیے۔ آپ لوگ چائے پی چکے؟

جی نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں انہیں چائے کی میز پر لاتا ہوں۔

بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔ میرے بچے بھی ان کے بنا ٹھیک طور پر کھاتے پیتے نہیں۔

حنا چائے کا انتظام کرنے چلی گئی نیچے۔ ڈاکٹر زیدی نے راہداری سے ہی آواز دی۔

بے بی! شعاع لپک کر باہر نکلی۔

ڈاکٹر — آپ کب آئے؟

ابھی آیا ہوں۔ اچھی تو ہو۔

شعاع نے سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر زیدی نے محسوس کیا، وہ پہلے سے زرد اور کمزور ہو گئی ہے

اس نے دل میں سوچا:

میں اسے تھوڑے دنوں کے لئے ساتھ لے جاؤں گا۔

پھر ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور سر کو زور سے ہلا کر بولا:

گندی بچی، اپنا خیال نہیں رکھتی، چلو ذرا میرے ساتھ۔

وہ اسے لئے ہوئے نعمان کے پاس آیا اور بولا:

نعمان صاحب، آپ نے ہماری بیٹی کو کمزور کر دیا۔ اب میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔

نعمان نے کہا۔ چلی جاؤ گی بیٹی۔

شعاع نے ڈاکٹر زیدی کو دیکھا۔ وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ پھر نعمان کو دیکھا۔ نعمان کو دیکھ کر اسے جو سکون ملتا تھا۔ وہ کہیں نہ ملتا تھا مگر کیا کہتی خاموش کھڑی رہی۔ ملازم نے آکر کہا:

چائے تیار ہے۔

ڈاکٹر زیدی اور نعمان اُٹھے۔ ڈاکٹر زیدی نے کہا:

آؤ بیٹی، تم بھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ——؟

چلو۔! نعمان نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا:

اور جب ان کے ساتھ شعاع چائے کی میز پر پہنچی تو حنا تو حیران ہی ہوئی مگر لبنیٰ جل کر رہ گئی۔ اٹھ کر جاتی تو بدتہذیبی تھی۔ ابھی یہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ سہیل آ گیا۔ نعمان خوش ہو گیا شعاع کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ رہا سہیل تو وہ ہنستا مسکراتا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ نعمان نے ہنس کر کہا

آؤ میاں آؤ۔ خوب موقعے پر آئے۔

سہیل نے پہلے شعاع اور پھر حِنا کی طرف دیکھا۔ بچے بھی آ گئے۔ خوب گہما گہمی کا احساس ہونے لگا۔ نعمان خوش تھا۔ وہ سہیل سے باتیں کرتا رہا۔ ڈاکٹر زیدی وقتاً فوقتاً شعاع سے باتیں کرتے رہے اس کی پلیٹ کھانے کی چیزوں سے بھرتے رہے۔ نعمان بھی مسکراتی نظر شعاع پر ڈالتا۔ حنا میزبانی کے فرائض بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ اس ماحول میں لبنیٰ نے خود کو فالتو چیز تصور کیا۔ وہ مسلسل سب کے چہروں سے ان کی دلی کیفیت نوٹ کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب نے اس کے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے اور اس سازش میں اس کا باپ بھی شریک ہے۔

اور یہ لڑکی جس نے میری خوشی لوٹ لی۔ اس نے نفرت کی گہری نگاہ شعاع پر ڈالی جس سے نعمان اس وقت کچھ کہہ رہا تھا۔

اور لبنیٰ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نعمان نے کہا: کیا بات ہے بیٹی؟

حنا نے پوچھا: لبنیٰ کیا بات ہے؟

ڈاکٹر زیدی بولے:

طبیعت تو ٹھیک ہے؟

سہیل نے کہا:

لبنیٰ ——!

لبنیٰ نے چیخ کر کہا:

تم سب لوگ سازشی ہو۔ تم سب مل کر سازش کر رہے ہو۔ جب سے یہ اس گھر میں آئی ہے میرے خلاف سازشوں کا جال پھیل گیا ہے۔

تم سب سازشی ہو —— میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چائے کی میز پر ڈاکٹر زیدی، نعمان، سہیل، حنا، لبنیٰ اور شعاع سبھی موجود تھے۔ چھوٹے بچے بھی آگئے تھے اور اتنے دنوں بعد باپ کو چائے کی میز پر دیکھ کر خوش اور کسی حد تک باادب بھی بیٹھے تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ حنا میزبانی کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ لبنیٰ نے اس فضا کو غائر نظروں سے دیکھا۔ ڈاکٹر زیدی شعاع سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھی کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر اس کی پلیٹ میں رکھ دیتے۔ نعمان سہیل سے مصروف گفتگو تھا، حنا مسکراتی، ہنستی گاہے بہ گاہے ڈاکٹر زیدی کی طرف متوجہ ہوئی، کبھی سہیل سے مخاطب ہوتی۔ سبھی مگن تھے، لبنیٰ کی طرف کسی کا دھیان نہ تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی فالتو چیز ہے۔ اس نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔ اسے یہ گمان ہوا جیسے وہ لوگ سازشی ہیں، سب اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے نعمان اس کا باپ

ماسازش میں شریک ہے۔ سب اس کی خوشیاں لوٹنا چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر شعاع اس لتا ہے۔ لبنیٰ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

'کیا بات ہے بیٹی؟

کیا ہوا؟

سبھی نے اس کی کیفیت پوچھی۔ تب لبنیٰ نے چلّا کر کہا:

تم سب لوگ سازشی ہو، تم لوگ میرے خلاف سازش کر رہے ہو۔

اس جملے کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مسکراتے چہرے بجھ گئے۔ حنا نے حیرت سے لبنیٰ ی دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اس نے تو اسے بہترین تربیت دی تھی۔ اس عمر میں تو بدتہذیب یاں بھی سمجھ دار ہو جاتی ہیں۔ پھر اسے کیا ہوا تھا۔ سہیل نے سر جھکا لیا، ہنستے مسکراتے چہرے بجھ ب جانتے تھے کہ اس جملے کے کیا معنی ہیں۔ ہر شخص پر جو بھی اثر ہوا ہو، مگر شعاع پر تو بجلی گر پڑی۔ سب اپنی اپنی جگہ خاموش تھے جیسے مجرم ہوں۔ لبنیٰ جذبات کی شدت سے کانپ تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر زیدی نے کہا:

لبنیٰ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تم بیٹھ جاؤ۔

وہ چیخی ——

میں بالکل ٹھیک ہوں۔

میں ابھی دوا دیتا ہوں، تم پرسکون ہو جاؤ گی۔

مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں، دوا اس لاڈلی کو کھلایئے۔

وہ تنتناتی اپنے کمرے کی طرف مڑی۔

حنا نے پکارا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے زیادہ سُننا شعاع کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وہ بڑی ہمت کرکے اُٹھی اور خود کو سنبھالتی ہوئی اوپر کی طرف چل دی۔ سب نے ہی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، مگر محض سہیل کے منہ سے نکلا۔

شعاع۔

خبر نہیں کسی نے یہ سُنا یا نہیں، البتہ حِنا نے بھی پکارا!

شعاع۔

شعاع نے اس آواز پر پلٹ کر دیکھا۔ اس کا سفید چہرہ اور دھندلی سی آنکھیں دیکھ کر حِنا نے کہا:

جاؤ بیٹی تم جا کر آرام کرو، میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آتی ہوں۔

یہ لب و لہجہ، یہ انداز کہاں سے حِنا کے دل میں آیا۔ اپنے کمرے میں پیچ و تاب کھاتی لبنیٰ نے یہ الفاظ سنے اور غصے میں بل کھانے لگی۔ نعمان کے دل کو ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سب پر ہی ان الفاظ نے خوشگوار اثر کیا۔

مگر شعاع۔

بے بس مجبور شعاع نے بہت رنگ دیکھے تھے۔ مہر و محبت کے اور اسے ہر پل نظر انداز کرنے کے، کبھی بے اندازہ بارش، کبھی تپتی دھوپ۔

وہ خاموشی سے اوپر چلی گئی۔ سہیل کا جی چاہتا تھا اس کے پیچھے جائے، اس کے دُکھے ہوئے دل پر ہمدردی کا مرہم رکھے۔

حِنا نے بچّوں سے کہا:

چلو اُٹھو چل کر پڑھو۔

بچے اُٹھے تو حِنا بھی معذرت چاہ کر ان کے ساتھ نکل گئی۔ اور برآمدے میں بیٹھ کر سوچنے لگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لبنیٰ کی حرکت سے وہ سخت شرمندہ تھی۔

رضا کے جانے کے بعد ڈاکٹر زیدی نے سہیل سے کہا:

میاں تم ذرا نعمان صاحب کے کمرے میں جا کر بیٹھو، میں ذرا ان سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

سہیل اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

مجھے اجازت دیجئے بہت دیر ہو گئی ہے۔

ممکن ہے ڈاکٹر زیدی اسے اجازت دے دیتے، مگر نعمان نے کہا:

نہیں مجھے تم سے بھی بات کرنی ہے، تم میرے کمرے میں انتظار کرو۔

"جی ___ بہتر"

اس کے جاتے ہی ڈاکٹر زیدی نے نعمان سے کہا:

نعمان صاحب، کیسے باپ ہیں آپ، کتنے خود غرض ___ صرف اپنی خاطر اپنی بیٹی کو پاس رکھ لیا، مگر اسے بیٹی کے حقوق بھی تو دیئے ہوتے۔ اس کی تباہ ہوتی ہوئی صحت دیکھ رہے ہیں۔ کیا بیٹی کو نظروں کے سامنے ہی رکھنا مقصود ہے؟ کیا اس کی ممی بنوا کر رکھیں گے؟ اگر اسے اس طرح ہی رکھنا ہے تو معاف کیجئے، میں اسے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ ایسے بزدل باپ کے پاس میں بچی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

نعمان نے زخمی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور بمشکل بولا۔

آپ بھی ___ آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے۔

ڈاکٹر نے پھر کہا، مگر اب ذرا لہجہ نرم تھا۔

نعمان صاحب، آپ یہ بات سب کو بتا کیوں نہیں دیتے، بیٹی کو بیٹی کہنا عیب تو نہیں، کس

سے ڈرتے ہیں آپ؟

نعمان نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک لیا۔

ڈاکٹر مجھے کسی کا کیا ڈر ہو سکتا ہے، مگر میں نے آپ کو ساری بات بتا دی تھی، شعاع اپنے ان دیکھے باپ سے نفرت کرتی ہے، شدید نفرت . . . . میں اس کو اپنی اصلیت بتا کر اس کی نفرت مول نہیں لے سکتا۔ ڈاکٹر میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اگر مجھے یہ یقین ہو کہ وہ مجھے باپ کی حیثیت سے قبول کرے گی، تو میں اس کی وجہ سے سب کچھ ٹھکرا سکتا ہوں۔

آپ کوشش تو کریں۔

کوشش، اس کوشش میں میں اسے گنوا دوں گا ڈاکٹر۔

اچھا، اس موضوع پر پھر بات ہو گی، اب مجھے اجازت دیجئے۔

ڈاکٹر زیدی اُٹھ کھڑا ہوا۔ نعمان نے کہا:

شعاع سے تو مل لیں۔

جی نہیں، میں اس معصوم بچی کا اس وقت سامنا نہیں کر سکتا۔

شعاع اپنی مخصوص جگہ پر بالکونی میں کھڑی تھی۔ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی، مگر جذبات تھے کہ گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی، مگر آج کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لق و دق صحرا میں جلتی ہوئی ریت ہے اور وہ ننگے پاؤں اس صحرا میں تنہا بھٹک رہی ہے۔ اسی لمحے اس نے سہیل کی آواز سنی۔

شعاع ___

سہیل بجائے نعمان کے کمرے میں بیٹھنے کے شعاع کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع نے پلٹ کر دیکھا۔

سہیل ——

شجاع ——

سہیل نے اس کے ٹھنڈے سفید ہاتھ تھام لئے۔ شجاع جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔

آپ کیوں آئے ہیں۔

سہیل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

کیا چلا جاؤں؟

ہاں۔

اس نے رُخ موڑ لیا۔ سہیل نے کہا۔

کیوں چلا جاؤں؟

اس لئے کہ آپ کا چلا جانا ہی بہتر ہے۔

اپنی زندگی حاصل کئے بغیر میں کس طرح چلا جاؤں۔

شجاع اس کی طرف پلٹی اور بولی۔

نہیں سہیل۔ تم نے جو اُمیدیں باندھی ہیں ان کو توڑ دو۔

مگر کیوں، تمہیں حاصل کرنا ہی تو میری زندگی ہے۔

تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے سہیل۔

وہ کیسی عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔

سہیل ہم تو ندی کے دو کنارے ہیں، ریل کی دو پٹریاں ہیں جو دور تک ساتھ چلتی ہیں

لیکن کبھی بھی آپس میں نہیں ملتیں۔

نہیں شجاع، تم بھول رہی ہو، ندی کے دونوں کناروں کے درمیان ندی بہتی ہے، ریل کی دونوں پٹریوں پر ریل چلتی ہے، ایک پٹری پر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو انسان جب مل جاتے ہیں تو مل کر زندگی کے کام انجام دیتے ہیں۔ ہر چیز میں ہر کام میں ان دونوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

مل کر نہیں دور دور رہ کر سہیل۔

کچھ بھی ہو، اب جب کہ یہ راز افشا ہو گیا ہے، جب یہ حقیقت سب پر آشکارہ ہو چکی ہے تو اب واپس جانے کا کوئی فائدہ نہیں، اور یوں بھی میں زندگی کے اس موڑ پر آ پہنچا ہوں جہاں جا کر سب چھوٹے چھوٹے راستے مل کر ایک ہی راستہ بن گئے ہیں۔ میں پلٹ نہیں سکتا شجاع، ورنہ بھٹک جاؤں گا —— میں بھٹکنا نہیں چاہتا۔ میں منزل پر پہنچنا چاہتا ہوں —— اور میری منزل تم ہو۔

شجاع نے کہا۔

میں کسی کی منزل کس طرح ہو سکتی ہوں، میں تو خود بھٹک رہی ہوں۔ میری تو اپنی کوئی منزل نہیں ہے۔

تم مجھے اپنی منزل بنا لو۔۔۔

نہیں —— یہ نہیں ہو سکتا، آپ کسی کی زندگی ہیں۔

اور میری زندگی تم ہو، اور شجاع تم چاہو تو مجھے زندگی دے دو اور تم چاہو تو۔۔۔۔۔

شجاع نے اس کی بات کاٹ دی۔

میں کسی کو کیا زندگی دے سکتی ہوں، میں تو خود زندگی سے بہت دور نکل آئی ہوں۔ اب تو میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لاش ہوں، زندہ لاش . . . .

زندگی سے خالی —— چلتی پھرتی لاش —— میں نے اب تک خود کو سنبھالے رکھا، ہر دا سے شکست کھانا نہیں چاہتی تھی۔

مگر —— میں نے شکست کھالی۔ اب میں خود کو —— ہاں اب میں خود کو قابلِ نفرین تصور کرتی ہوں۔ میں جہاں کہیں بھی گئی، سب کا سکون تباہ کیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے —— میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اب یہاں بھی نہیں رہوں گی۔

میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔

دُور بہت دُور —— ایسی جگہ جہاں کوئی مجھ سے ہمدردی کرنے والا نہ ہو۔ کوئی میرا دل دکھانے والا نہ ہو۔

وہ جیسے خود سے ہی باتیں کئے جا رہی تھی۔ سہیل نے اس کی عجیب سی کیفیت دیکھی تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

شعاع تم جہاں بھی جاؤ گی، میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا۔

سایہ —— ہاں سایہ، مگر سہیل اندھیرے میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے، وہ بھی تو روشنی کا ساتھی ہوتا ہے، سبھی روشنی کے ساتھی ہوتے ہیں اور میری زندگی میں اندھیرا ہے، گھپ اندھیرا —— اور دُور دُور تک روشنی کی کوئی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی۔

نہیں شعاع، تم مجھے آزمالو، میں تمہاری زندگی میں کرن بن کر چمکوں گا، میں تمہیں راستہ دکھاؤں گا۔ ہم دونوں مل کر ایک راستے کی طرف نکل جائیں گے۔

اس راستے کی طرف جو زندگی کی طرف جاتا ہے۔ جہاں اندھیرے نہیں روشنی ہی روشنی ہے تم ایک بار ہاں کہہ دو شعاع! پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں، مجھے آزماؤ تو سہی۔

اب کیا آزماؤں گی —— اب میں ان باتوں سے بہت دُور نکل آئی ہوں۔

وہ کیسے ٹھنڈے اور مایوس لہجے میں بول رہی تھی۔ سہیل کا دل کٹ رہا تھا، وہ تڑپ رہا تھا کہ کس طرح شعاع کو اپنی محبت کا یقین دلائے۔

شعاع۔

مگر شعاع نے کہا

نہیں سہیل تم یہاں سے چلے جاؤ، اپنی راہیں بدل لو۔

سہیل نے کہا

کیا میری تمام باتوں کا تمہارے پاس ایک ہی جواب ہے؟

ہاں۔

یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

ہاں۔

تو ٹھیک ہے، مجھے تم سے کچھ اور نہیں کہنا، خدا حافظ۔

سہیل نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی، ٹوٹی ہوئی آرزو کی دھندلاہٹ، یاس اور اُمید کی ملی جلی کیفیت جو چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

نہیں شعاع مجھے نہ جانے دو، مجھے روک لو، مگر شعاع نے کچھ نہ کہا۔

سہیل جانے کے لئے مڑا، دو قدم ہولے ہولے بڑھا، مگر شعاع پتھر کی طرح کھڑی تھی۔ سہیل نے پلٹ کر اسے پھر دیکھا۔ شعاع کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے قدم پکڑ کر روک لے، اسے کہہ دے کہ نہیں سہیل مت جاؤ، رُک جاؤ۔

پلٹ آؤ سہیل، کیونکہ میری زندگی بھی تم ہی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر پھر اسے ایک خیال آیا۔ ایک خیال نے اس کے قدم روک لیے سہیل رُک گیا تو اور شکلیں آئیں گی اور سکون لُٹے گا — اللہ —

یوں بھی تو سہیل کو لوٹ جانے پر اس نے خود ہی مجبور کیا تھا۔

اس نے خود ہی تو اس کی اُمیدیں توڑی تھیں۔

پھر — کس لئے اسے روکوں، دوبارہ جانے پر مجبور کرنے کے لئے۔

یا —

دوبارہ اُمیدیں توڑنے کے لئے۔

سہیل نے اُمید بھری نظروں سے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیڑھیاں اُترنے لگا۔

دھیرے دھیرے وہ اس کی نظروں سے، اس کی زندگی سے دُور ہونے لگا۔ رُک رُک کر وہ بڑھا اور پھر رُک رُک گیا، مگر شعاع نے نہ پکارا۔

میں یہ سوچ کر اس کے دَر سے اُٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی، منا لے گی مجھ کو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو
قدم ایسے انداز سے اُٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بُلا لے گی مجھ کو
مگر اس نے روکا — نہ مجھ کو منایا
نہ دامن ہی پکڑا — نہ مجھ کو بٹھایا

نہ آواز ہی دی — نہ واپس بُلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جُدا ہو گیا میں
یہاں تک کہ اس سے جُدا ہو گیا میں
یہاں تک کہ اس سے جُدا ہو گیا میں
جُدا ہو گیا میں
جُدا ہو گیا میں
جُدا ہو گیا میں

سہیل آنے کو تو آ گیا تھا، مگر اب پچھتا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا شعاع اسے روک لے گی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ شعاع کو حاصل نہیں کر سکتا۔

سہیل آخری سیڑھی اُتر کر نیچے آیا تو نعمان سامنے آ کھڑا ہوا۔

کہاں جا رہے ہو۔

سہیل نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس کی اُڑی ہوئی رنگت اور چلنے کا انداز دیکھ کر نعمان کچھ سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔

چلو میرے ساتھ اُوپر۔

میں اجازت چاہوں گا۔

اُوپر چلو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔

انکل، میں اب یہاں بالکل نہیں ٹھہرنا چاہتا۔

تم ابھی نہیں جا سکتے، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جانتا ہوں انکل، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔
نہیں سہیل تم نہیں جانتے . . . .
انکل پلیز، مجھے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔
اور سہیل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

نعمان اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ کتنا کمزور ہو گیا تھا۔ تمام بچے اس سے باغی ہو گئے اس کا کہنا نہیں سنتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ اس نے جو بساط بچھائی تھی، اس کے تمام مُہرے گئے تھے۔

سارے پیادے، سارے فیل آپ ہی آپ پٹے جا رہے تھے۔
نعمان کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا، وہ بازی ہار رہا تھا۔ اس ہار کو وہ کیسے جیت میں ان بگڑے ہوئے حالات کو کیسے سدھارے، کیسے درست کرے۔
نعمان کے دماغ میں بگولے سے چکر لگا رہے تھے، اس کا ذہن چکرانے لگا اور وہ ریلنگ کا سہارا لے کر سیڑھیوں پر ہی گر گیا۔ کافی دیر بعد جنا اندر آئی تو نعمان سیڑھیوں پر بے ہوش پڑا تھا۔ جنا نے تڑپ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور گھبرا کر نوکروں کو پکارنے لگی۔ اسی دوران اس کی نگاہ لبنیٰ کے بند دروازے پر پڑی اور اس کے دل سے آہ نکلی۔
لبنیٰ! تم نے اچھا نہیں کیا۔
سب نے مل کر نعمان کو اس کے بستر پر ڈالا۔ جنا نے روتے روتے ڈاکٹر زیدی کو ٹیلی فون کیا، وہ فوراً ہی آ گئے۔ شعاع کو اپنے کمرے میں یہ اطلاع ملی تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

ے سوچا۔
صاحب کو دل کی تکلیف ہے، لبنیٰ کو تو چاہئے ان کی دلجوئی کرے نہ کہ انہیں صدمہ پہنچائے

ے تو مجھ پر طنز کی تھی۔ نعمان صاحب نے اس بات کو کیوں اتنا محسوس کیا۔
لگو ہے تو زندہ ہوئے ہیں۔
رانی جلد حل ہونے والا نہیں تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے اسے بلوا بھیجا۔ نعمان کے کمرے میں جنا، تھے، مگر لبنیٰ نہ تھی۔ شعاع نے نعمان کا زرد چہرہ دیکھا تو بے اختیار اس پر رحم آ گیا۔
زیدی نے بڑے انہماک سے نعمان کا معائنہ کیا، پھر خاموشی سے اپنے بیگ سے انجکشن
اور شعاع سے کہا۔
انجکشن تیار کرو۔
شعاع کی غیر حالت دیکھ کر بولے۔
ہے ــــ میں خود کور کر لیتا ہوں، تم خود کو سنبھالو، تمہاری ڈیوٹی پھر بڑھ گئی ہے
بڑھ کر شعاع کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ڈاکٹر سے بولی۔
کیا ہوا ہے ڈاکٹر۔
ے خبر نہیں ہیں مسز نعمان، میں نے بہت پہلے کہا تھا نعمان صاحب کو سکون کی ضرورت ہے۔
ے سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔
ی کی بات نہیں، بس ان کے دل کو صدمہ پہنچا ہے، مناسب دیکھ بھال ہوئی تو جلدی اچھے
، لیکن اگر صورتِ حال آج جیسی رہی تو میں ضمانت نہیں دیتا۔
ڈاکٹر، آپ ایسی باتیں نہ کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حنا رونے لگی۔ ڈاکٹر نے اشارے سے سب نوکروں کو جانے کا حکم دیا۔ بچے بھی چلے گئے
زیدی نے گلوکوز کھول کر حنا اور شجاع کو بلایا۔ پھر حنا سے بولے۔

مسز نعمان میں شجاع کو نعمان صاحب کی وجہ سے چھوڑے جا رہا ہوں، ورنہ ابھی لے جاتا
یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، ورنہ میں اسے ابھی لے جاتا ہوں۔

حنا نے فوراً شجاع کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

نہیں ڈاکٹر، شجاع تو میری بچی ہے، اسے تو آپ مجھے ہی دے دیں۔ آپ کو شکایت کا موقع نہ ہو گا۔ میں بیٹی کو سمجھاؤں گی۔

بہتر ہے، آپ یہ دوائیں منگوالیں، اتنے میں میں شجاع کو اس کی ڈیوٹی سمجھاؤں۔

حنا نسخہ پکڑ کر باہر گئی۔ ڈاکٹر نے شجاع سے کہا۔

اچھی، گندی بچی، تم نے یہ کیا کیا، دنیا میں اس طرح جینا تو مشکل ہے۔ حالات کا مقابلہ کرنا ہے
نعمان صاحب کی بے خبری میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ ان کی یہ حالت صرف تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ
تمہیں بہت چاہتے ہیں، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ تم بھی نرس بن کر نہیں، بیٹی بن کر ان کی خدمت کرو
ان کے پاس بیٹھو، دل جوئی کرو، ہنسو مسکراؤ، وعدہ کرو، میری بات پر عمل کرو گی۔ وہ دکھی انسان
ہے بے بی۔

شجاع کا دل چاہا پوچھے۔

جب چاہے جانے کو ان کے اتنے بچے ہیں۔ تو مجھے اتنا کیوں چاہتے ہیں۔

مگر اس نے خود کو روک لیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ کرو گی نا۔

شجاع نے نعمان کے چہرے پر نظر ڈال کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

گڈ گرل۔ کبھی میں تمہیں اس کے دکھے دل کی کہانی سناؤں گا۔

گھر بھر افتخار کی عادتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ میمونہ بیگم اب تو کھلم کھلا اسے گالیاں دیتی۔ نعیم کو تو
انہوں نے گھر سے ہی بھگا دیا تھا۔

افتخار کی حالت اب پہلے سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ نوکری سے اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ سارا
سارا دن وہ بلند آواز سے روپے پیسوں کا حساب کرتا رہا۔ میلے کپڑے، بڑھی ہوئی داڑھی، پنسل ملتی تو دیواریں
زمین، کاغذ غرض جو چیز ملتی ان پر ہندسے لکھتا رہتا۔ پہلے تو ان ہندسوں میں کوئی ترتیب ہوتی تھی،
مگر اب تو وہ ایک لکھنے کے بعد اس کے ساتھ صفر ہی صفر لکھتا رہتا، حتیٰ کہ کاغذ کی حد ختم ہو جاتی۔ کوئلے
اور ڈھیلوں سے دیواریں کالی کرتا رہتا۔

غزالہ دن بھر تو اسکول میں سر کھپاتی اور رات کو افتخار کی وجہ سے سو نہ پاتی۔ وہ رات رات بھر
جاگتا۔ خالی الماری کی حفاظت کرتا۔ اب اگر غزالہ کبھی کہتی۔

اب سو جائیے۔

تو وہ چلّا کر کہتا۔

ہاں میں سو جاؤں اور چور میری دولت لوٹ لیں۔

ایک دن غزالہ نے عاجز آ کر کہا۔

کونسی دولت؟

افتخار نے الماری کھول کر دکھی اور کہا۔

دیکھو، یہ دولت۔

اور وہ کاغذ اٹھا کر اسے دکھانے لگا اور بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں پتہ ہے مَیں اب لاکھوں روپے کا مالک ہوں۔ اور روپے آنے دو، یہ سارے روپے جو الماری میں رکھے ہیں، میں تمہیں دے دوں گا۔

غزالہ نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

اُب سو جایئے۔

یہ ایک دن کی بات نہ تھی۔ اَب تو روز ہی وہ دولت کے قصے سناتا، میلے کپڑوں میں باہر نکل آتا، راہ چلتے میں ہاتھ ہلا ہلا کر حساب کتاب کرتا رہتا۔ لوگ اسے پاگل سمجھ کر ایک نظر دیکھتے۔ پھر پہلو بچا کر گزر جاتے۔

کسی خوبصورت کوٹھی کے سامنے جا کھڑا ہوتا، اور راہگیروں کو بلا بلا کر کہتا۔

دیکھو یہ میری کوٹھی ہے۔ آؤ آؤ اندر آؤ۔

سڑک پر پارک کی ہوئی کاروں میں جا گھستا اور ڈرائیور سے کہتا۔

جلدی چلو ڈنر پر جانا ہے، لوگ انتظار کرتے ہوں گے۔

کبھی کہتا۔

فلاں جگہ چلو —— فلاں ہوٹل میں چلو۔

ڈرائیور اسے دھکے دے دے کر کار سے نکالتے اور دیر تک گالیاں دیتا رہتا۔

شروع شروع میں تو غزالہ کچھ اس کا صحیح اندازہ نہ کر پائی تھی، مگر اب وہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔ دن بدن افتخار کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ دن بھر وہ مارا مارا پھرتا اور رات کو نہ اسے سونے دیتا نہ خود سوتا۔ اَب تو غزالہ کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا —— وہ سوچتی۔

کاش میں نے افتخار سے روپے کی بات نہ کی ہوتی۔

مگر دوسری صورت میں وہ اسے شجاع کو واپس لانے کے لیے تنگ کرتا اور اس کی ناکامی پر

...ااتا پیٹتا۔ اب کم از کم وہ مار پیٹ اور طعنوں سے تو بچی ہوئی ہے۔ مگر دوسری پریشانی کیا کم تھی ...ہاں آ کر افتخار کے پاگل پن پر افسوس کرنے اور علاج کروانے کا مشورہ دیتے۔ غزالہ سوچ ...لاؤ کیا کیا جائے۔

...اتوار کا دن تھا۔ وہ برآمدے میں کرسی پر نیم دراز بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ افتخار دیوار پر ...لے کچھ لکھ رہا تھا۔ اور غزالہ اس کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

...میں نے افتخار سے روپوں کا ذکر نہ کیا ہوتا۔ تو وہ اس حالت میں نہ ہوتا۔ نہ ہی اس کے چھوٹے ...اور کم ظرفی کا مجھے پتہ چلتا۔

...و بت کی طرح اسے دیکھ رہی تھی اور دل میں نفرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں جنہیں وہ دبا دیتی ...یں نعمان کا خیال اُبھرتا، آخر وہ بھی تو انسان ہے، آج لاکھوں کا مالک ہے، مگر وہی عاجزی

...الماری اس میں ہے . . . .

اتنے میں میمونہ بیگم نے قریب آ کر کہا۔

کیا سوچ رہی ہو؟

کچھ نہیں۔

دیکھیں اس موئے کی حرکتیں۔

غزالہ خاموش رہی، اسے میمونہ بیگم کی بات پسند نہ آئی۔ میمونہ بیگم نے پھر کہا۔

دیکھ لیا اپنا انتخاب، چھوٹا آدمی چھوٹا ہی رہتا ہے، کتنے بڑے بڑے سیٹھوں کے رشتے آئے ...نہیں یہ ہی ملا۔

دیکھ لو کمینے کے ہاتھ میں ایک دھیلا ابھی آیا نہیں اور یہ حالت ہے، اگر سچ مچ کچھ ہاتھ آتا، جانے کیا ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ یوں بھی بیزار تھی بولی۔

امّی، چپ رہو۔

چپ کیسے رہوں، مَیں تو تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ بیٹی کو کس کے ہاتھ بیچ رہی ہو۔ مَیں تمہارا شادی کرنا چاہتی تھی، تو تم مجھے لالچی کہا کرتی تھیں، اب بیٹی کو بیچ رہی ہو تو تمہیں کیا کہوں؟

غزالہ نے کہا۔

امّی، جاؤ تم یہاں سے۔

میمونہ بیگم دھرنا مار کر بیٹھ گئیں۔

چلی کیسے جاؤں۔ میں یہ ڈرامہ اتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں، خاموش کیسے رہوں۔

غزالہ نے کہا۔

اس ڈرامے کا سب سے اہم کردار تو امّی تم ہو۔ میرے گھر کی تباہی کی ذمہ دار بھی تم ہو، ورنہ آج میں اس کوٹھی، اس دولت کی مالک ہوتی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

تو اس کا تو دماغ خراب تھا، مگر تمہارا بھی ہوگیا۔ کوٹھی، کار، دولت . . . .

ہاں میرا سب کچھ تم نے تباہ کیا، میرا سب کچھ تم نے چھین لیا۔

ہاں ہاں، یہ موا کینہ بھی مَیں نے ڈھونڈا تھا، جوتوں سے بھی مَیں ہی پیٹتی ہوں تمہیں۔ اسے پاگل بھی میں نے ہی بنایا ہے، یہ موا سڑی کینہ بھی میری وجہ سے ہوا ہے۔

تب افتخار نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔

بڑی بی کچھ میرا ذکر ہو رہا ہے۔

میمونہ بیگم نے آنکھیں نکال کر کہا۔

کچھ اور کہو، ابھی تو بڑی بی کہا ہے۔

افتخار نے کہا۔

ذرا کار آ جانے دو، ذرا روپیہ آ جانے دو، پھر بہت کچھ کہوں گا۔ ابھی تو سودا ہوگا، لڑکی بکے گی، پیسے آئیں گے۔

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ غزالہ نے سر پکڑ لیا اور میمونہ بیگم غصے سے اندر چلی گئیں یہ فیصلہ کر کے۔

میں بھی کھوج لگا کر رہوں گا کہ شعاع کو کس کے ہاتھ بیچا جا رہا ہے۔ اگر فرض کیا اسے بیچنا ہی ہے تو اس روپے کی افتخار سے زیادہ حق دار تو میں ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حق صاحب نے سہیل کے کمرے میں آکر کہا۔

بیٹا تم کب سے نعمان صاحب کے گھر نہیں گئے۔

کئی دن ہو گئے۔

تمہیں معلوم ہے وہ سخت بیمار ہیں۔

اوہ ——

تمہیں جانا چاہئے۔

بیگم حق بھی کمرے میں آگئیں اور سہیل کے کچھ بولنے سے پہلے بولیں۔

تم روز جاتے ہو کیا کافی نہیں۔

مگر اسے بھی جانا چاہئے۔

اس کے جانے سے کیا وہ اچھے ہو جائیں گے۔

ممکن ہے۔

تم سٹھیا گئے ہو۔

تم بھی سٹھیا گئی ہو۔

ہاں ہاں تم تو یہی کہو گے۔

سہیل شام کو تیار رہنا میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔

کئی بار پوچھ چکے ہیں۔

لو اور سنو، انہیں کب سے اتنی محبت ہوئی۔

شروع سے ہی ہے۔

ہاں ہاں مطلبی جو ہوئے۔

مطلب کی کیا بات ہے۔

بیٹی کی شادی۔

بیگم تمہارا بھی تو مطلب ہے۔

میرا کیا مطلب ہے؟

بیٹے کے لئے باندی، ماما، دھوبن اور تمہارے لئے نوکرانی، ملازمہ۔

کیا فضول باتیں ہیں۔

باتیں تو میں ٹھیک ہی کرتا ہوں۔

کب سے ٹھیک کرنے لگے۔

میں تو ہمیشہ سے ٹھیک کرتا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو کیا میں غلط کرتی ہوں۔

بیگم بُرا نہ مناؤ تو میرے خیال میں تمہاری کوئی کل سیدھی نہیں۔

تم دونوں باپ بیٹا میرے خلاف ہو گئے ہو۔

یہی سمجھ لو۔

مگر یہ شادی لبنیٰ سے ہوگی۔

نہیں شعاع سے ہوگی۔

بیگم حق نے کہا، میں اپنے سہیل سے خود بات کروں گی۔

حق صاحب بولے، اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

کیوں سہیل! بیٹے تم کیا کہتے ہو۔

سہیل نے کہا۔ ابا جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

بیگم حق آگ کی طرح بھڑک اُٹھیں۔

کیا ٹھیک کہتے ہیں۔ اس نرس سے تمہاری شادی۔ میں ایسا قیامت تک نہ ہونے دوں گی تم دونوں باپ بیٹے کو گھر سے نکال دوں گی۔

حق صاحب نے کہا۔

شوق سے۔ ہم خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتے۔ تم اس پوری کوٹھی میں رہو ـــــ تنہا، اور دیواروں سے اپنا سر پھوڑو۔

سہیل کیا تم بھی چلے جاؤ گے۔

ہاں میرا سہیل میرے ساتھ جائے گا۔

میں اسے نہیں جانے دوں گی۔

ابھی تو تم خود ہی نکال رہی تھیں اور اب کہتی ہو نہیں جانے دوں گی۔

سہیل تم کہہ دو کہ تم ماں کو چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔

کیسے نہیں جائے گا۔ باپ کی بات مانے گا۔

ماں کا کہا مانے گا۔

یہ میرا بیٹا ہے۔

یہ میرا بیٹا ہے۔

سہیل تم بھی تو کچھ بولو۔

ابھی تو میں آپ دونوں کی لڑائی کا مزہ لے رہا ہوں۔

بیگم حق نے کہا۔

گویا تماشا ہو رہا ہے۔

سہیل نے کہا۔

تماشا نہیں تو کیا ہے۔ شادی مجھے کرنی ہے، عمر مجھے گزارنی ہے۔ میں اپنا اچھا بھلا خود جانتا ہوں۔ میں آپ دونوں کو بتا دوں کہ شادی میں اپنی مرضی سے کروں گا۔

بیگم حق نے کہا۔

تمہاری مرضی کی لڑکی لبنیٰ ہے۔

حق صاحب بولے۔

تمہاری مرضی کی لڑکی شعاع ہے۔

سہیل نے کہا۔

جب میں اسے شادی کر کے گھر لے آؤں گا تو آپ دونوں کو پتہ چل جائے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگم حق نے کہا۔

میرے بغیر—

حق صاحب نے کہا۔

آج کل امریکہ اور یورپ میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

حق صاحب اور بیگم حق جھگڑتے رہے۔ ماں کہتی تھی کہ میری پسند سے شادی ہوگی، باپ کہتا تھا میری پسند سے۔

حق صاحب اور بیگم حق کی مسلسل تکرار سے سہیل تنگ آکر بولا۔

جب میں اس سے شادی کرکے اسے گھر لے آؤں گا تو آپ دونوں کو میری مرضی کی لڑکی کا پتہ چل جائے گا۔

بیگم حق نے کہا۔

میرے بغیر؟

حق صاحب نے کہا۔

آج کل یورپ میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یورپ میں ہوتا ہوگا یہاں نہیں ہو سکتا۔

ولایتی پوڈر تھوپے جاتے ہیں، ولایتی لپ اسٹک لگائی جاتی ہے، شادی ولایتی طریقے سے نہیں ہو سکتی —— بھلا کیوں؟

میں اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔

اگر تم اپنی ضد پر قائم رہیں، تو بہت جلد تمہارے گھر میں بھی یہی ہو جائے گا۔

دیکھ لوں گی؟

دیکھ لینا۔

حق صاحب نے تو اخبار کی اوٹ کر لی اور بیگم حق بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ سہیل پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔

کتنے دن بیت گئے۔

سہیل نے باغیچے میں لگے لیموں کا سوکھا زرد پتہ مسلتے ہوئے سوچا۔

مگر شعاع میں تمہیں صحیح طور پر اب بھی نہیں سمجھ سکا۔ جب میں تمہیں سہارا دینے کو اپنانے کو تیار ہوں تو تم کیوں اس سہارے سے منہ موڑتی ہو۔ میں سمجھتا تھا میری بے لوث چاہت نے تمہارے دل کو پگھلا دیا ہے، مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ تم تو ویسی ہی پتھر دل ہو —— پتھر دل نہیں تم پتھر دل نہیں ہو۔ میں نے تو خود تمہارے نرم دل اور حساس ذہن کو محسوس کیا ہے، مگر میں تم سے کیسے پوچھوں کہ بتاؤ شعاع تمہیں کس چیز نے روک رکھا ہے، وہ کیا مجبوری ہے؟ کہیں —— کہیں ——؟

بجلی کی طرح اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اوہ، اتنے دنوں سے مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں اب سمجھا تمہیں کیا مجبوری ہے تمہیں کون منع کرتا ہے۔

کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس آ کھڑا ہوا۔

سہیل ——

سہیل نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

ابا جی، آپ یہاں کیسے؟

حق صاحب اس کے پاس پہنچ کر بیٹھ گئے۔

تم نے یہاں کب سے بسیرا شروع کر دیا؟

گھر میں آپ اور امی ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔

یوقوف وہ لڑائی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ وہ تو ایسے ہی —— اور پھر میں تو وہی کروں گا جو پاہتے ہو۔ تمہاری مرضی کی لڑکی سے بیاہ ہوگا۔

سہیل نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

ابا جی میں آج کل سخت پریشان ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو آپ دونوں کی نوک جھونک دبھ ہو جاتی ہے، کسی دوست کے ہاں نہیں جاتا کہ وہ دسیوں سوالات کرنے لگتے ہیں۔ زیں مجھ سے صحیح کام نہیں ہوتا۔ ایک یہ باغیچہ ہے اس لئے آ گیا تھا کہ اکیلا بیٹھوں گا مگر اندر ایک ماہ ہے، اس لئے باہر آ بیٹھا۔

حق صاحب کو وہ ایک معصوم بچہ لگا جو باپ سے مسلسل شکایتیں کر رہا ہو، مسکرا کر بولے۔

تم نعمان کے ہاں چلے جاتے۔

اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔

کیوں؟

نعمان انکل زبردستی اپنی بیٹی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیوقوف ہو تم ——— تمہیں کس نے کہا۔

ابا جی آپ کو خبر نہیں شعاع نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اب مجھے معلوم ہ
اسے اس بات پر کون مجبور کر رہا ہے۔

بھلا کون مجبور کر رہا ہے؟

انکل نعمان۔

تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔

جی نہیں۔ شعاع مجھ سے بار بار کہتی ہے، یمنیٰ سے شادی کر لو، انکل نعمان بار بار کہتے
تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ بتائیے ان باتوں کا کیا مطلب ہوا۔ شعاع کہتی ہے اب میں پ
سے چلی جاؤں گی، بتائیے ابا جی میں غلط کہتا ہوں۔

حق صاحب ہنس دیئے اور بولے۔

بالکل غلط کہتے ہو۔

سہیل خفا ہو گیا۔

جی ہاں، وہ آپ کے دوست جو ہوئے، مگر میں بالکل سچ کہتا ہوں۔

تم جھوٹ بولتے ہو۔

وہ کیسے؟

وہ ایسے کہ مجھ سے نعمان نے خود تمہارے اور شعاع کے رشتے کی بات کی تھی۔ تب ہی سے تو
میرا تمہاری امی سے جھگڑا چلتا ہے۔ نعمان میرے اور تمہارے ساتھ ہیں۔

سچ ابا جی؟

بالکل سچ، تم بہت نالائق ہو۔

ر......

اب کیا ہوا؟

انکل نعمان اگر سانحہ بھی دے رہے ہیں تو بھی بیکار ہے۔

سبحان اللہ آج کیا کھایا تم نے؟

ابا جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، شعاع صاف انکار کرتی ہے۔ انکل نعمان اس پر کیسے زور
یتے ہیں۔

حق صاحب پھر ہنس دیئے۔

وہ جذباتی لڑکی ہے، حالات ٹھیک ہونے دو، خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

سچ ———

بالکل سچ ——— تمہارے سچ جیسا نہیں، یہ بتاؤ نعمان کے ہاں کب سے نہیں گئے۔

کئی دن سے نہیں گیا۔

واقعی بہت نالائق ہو، وہ بہت بیمار ہے۔ آج شام کو ضرور جاؤ۔ بلکہ دونوں چلیں گے۔

نعمان کی طبیعت کہنے کو تو سنبھل گئی تھی۔ مگر جو گھاؤ اس کی روح پر لگا تھا وہ کسی طرح بھی
مل ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ شعاع نے خدمت گزاری میں انتہا کر دی تھی۔ جب تک نعمان کی
ت ذرا سنبھل نہ گئی وہ اس کے پاس سے نہ اٹھی۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر گزار دیں۔ جہانے
نے لاکھ مجبور کیا کہ میں جو موجود ہوں تم جا کر ذرا آرام کر لو، مگر شعاع نے انکار کر دیا۔ نہ
جانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک پل کو بھی سوئی تو خدا جانے کیا قیامت آ جائے گی
ے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے باپ ہی کی خدمت کر رہی ہے۔ دھان پان تو سدا کی تھی پھر غموں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشانیوں نے اس کی ذات کو مرکز بنا رکھا تھا مگر اس کی جو حالت نعمان کی بیماری کے دوران ہوا اسے دیکھ کر حنا کا جی ہول جاتا۔

اے اللہ! مجبور و بے کس لڑکی ہے اس کی حفاظت کرنا۔

وہ دعا کرتی۔ ہمدردی تو اسے شعاع سے تھی ہی مگر جب سے وہ دیکھ رہی تھی کہ سگی بیٹی کی جگہ وہ دن رات پریشانی میں ایک کئے دے رہی ہے، اسے قدرتی طور پر اس سے محبت ہو گئی تھی۔ شعاع سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہوتی تو حنا اسے محبت بھرے انداز سے دیکھا کرتی ایسے میں اس کی نگاہ بینا کے کمرے کی طرف اُٹھ جاتی جو ایک بار بھی نعمان کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ حنا نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کا ایک ہی جواب تھا۔

جب تک شعاع اس گھر میں موجود ہے میں ابّو کے پاس نہیں جاؤں گی۔

ظاہر ہے یہ بات ممکن نہ تھی اس لیے حنا خاموش ہو جاتی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ نعمان نے ایک بار بھی بینا کو بلانے کی فرمائش نہ کی، البتہ وہ حنا سے اس کے بارے میں پوچھ لیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر زیدی آئے ہوئے تھے۔ نعمان کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ وہ تکیوں کے سہارے پلنگ پر بیٹھا تھا، دُبلا دُبلا زرد چہرہ، حنا کا دل اسے دیکھ کر بھر بھر آ رہا تھا، مگر بظاہر بڑی خوش اخلاقی سے خاطر مدارت میں مصروف تھی۔ شعاع بھی ڈاکٹر زیدی کے پاس بیٹھی اپنے ناخنوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے حنا سے کہا۔

مسز نعمان، اب تو نعمان صاحب صحت یاب ہو چکے ہیں کچھ مٹھائی وغیرہ کھلایئے

حنا ہنس دی۔ بولی۔

کس کو کھلاؤں؟

پہلے نعمان صاحب کو اور پھر ہمیں . . . . کیوں بے بی؟

جی ـــــ بالکل۔

شعاع نے جواب دیا۔ نعمان شعاع کی طرف عجیب حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے یہ بات نوٹ کی اس لئے بولا۔

آپ اس طرح دوبارہ بیمار نہ ہو جاتے تو میں شعاع کو اپنے ساتھ ہی لے جانے والا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے میری بیماری نے اسے روکا ہے۔

نعمان نے پوچھا۔

ڈاکٹر زیدی بولا۔ جی ہاں بالکل۔

نعمان نے کہا۔

تو میں دعا کرتا ہوں میں بیمار ہی رہوں۔

حنا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اللہ نہ کرے، کیسی بُری بات کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے ہنس کر بات ٹالی۔

آپ اچھے ہو جائیں، شعاع یہیں موجود ہے، مگر بھئی وہ مٹھائی۔

سبھی ہنس دیئے۔ شعاع بھی چاہے زبردستی ہی ہنسی ہو، مگر اس مسکراہٹ نے اس کے زرد چہرے پر گلابی رنگ بھر دیا۔

حنا نے کہا، ذرا یہ اور چلنے پھرنے لگیں تو میلاد شریف کروں گی۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا، بھئی وہ تو خالص گھریلو زنانہ چیز ہے ہمارے مطلب کی بات کیجئے۔

بہتر ہے۔ میں سب کی دعوت کروں گی۔

ونڈرفل، کیوں بے بی؟ اور ہاں تم بھی اس دعوت میں مسز نعمان کا ہاتھ بٹانا۔ اچھا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گڈ گرل، اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔

شعاع کو بھی اٹھتے دیکھ کر بولے۔ وعدہ بھول گئیں۔

جی نہیں، یاد ہے۔

تو پھر یہیں بیٹھو۔

نعمان حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ کیا وعدہ ہے، اسے کیا خبر ہے۔

تمہیں چاہئے تھا ایک بار تو چلی جاتیں۔

کیوں چلی جاتی؟

لبنیٰ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تمہیں تو اپنے باپ سے اتنی محبت تھی۔

مگر ممی اب معلوم ہوا کہ میرے باپ کو مجھ سے محبت نہیں تھی۔

حنا نے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ تم تو بیوقوف ہو، تمہیں غلط فہمی ہے۔

امی سچ کہئے کبھی آپ نے ایسا بھی دیکھا، سنا کہ لوگ اپنی اولاد پر دوسروں کو ترجیح دیں ابو جی میرے مقابلے میں اس منحوس کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے جب تک وہ اس گھر میں ہے میں ابو جی کے پاس نہیں جاؤں گی۔

لبنیٰ، کیا پاگل پن ہے ذرا سوچو وہ بیمار ہیں۔

اور پھر حنا لبنیٰ کے پاس بیٹھ گئی اور محبت سے اس کے بال سہلانے لگی۔ مگر لبنیٰ نے ایک جھٹکے سے سر پیچھے ہٹا لیا اور بولی۔ آپ کو وہ کیوں اچھی لگتی ہے؟ آپ اس کو سینے سے لگاتی ہیں اس کے لئے ساڑھیاں خریدتی ہیں۔

کہاں ساڑھیاں خریدتی ہوں وہ تو پرانی ساڑھی تھی۔

بالکونی میں کھڑی شعاع کے دل پر چوٹ پڑی۔ برآمدے میں باتیں کرتی ہوئیں لبنیٰ اور [illegible] کو معلوم نہ تھا کہ ان کی ہر بات کی آواز اس بدنصیب کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ جو ابھی [illegible] صدمے سے سنبھلنے نہیں پاتی کہ اس پر دوسرا زخم لگتا ہے۔ شعاع نے سوچا۔

تو وہ پرانی ساڑھی تھی جو مجھ پر ترس کھا کر دی گئی ہے۔

اور برآمدے میں حنا کہہ رہی تھی۔

تمہارے ابو کی صحت یابی کی خوشی میں میں دعوت کر رہی ہوں، تمہیں اس میں شامل ہونا ہو گا۔

جب تک وہ اس گھر میں موجود ہے میں کسی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حنا نے اٹھتے اٹھتے کہا۔ تو سن لو، تمہارے ابو اسے کہیں نہیں جانے دیں گے، تمہیں اپنے باپ کی خوشی عزیز ہونی چاہئے۔

لبنیٰ نے منہ پھیر لیا۔

حنا اس کی بدلی ہوئی حالت پر دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی اندر آ گئی۔ شعاع کئی منٹ تک بالکونی میں کھڑی رہی۔ [illegible] نے سوچا۔

میرے [illegible] یہ [illegible] آزمائشوں کا دور ہے۔ میرا اس گھر کے کسی فرد سے کوئی رشتہ، کوئی ناطہ نہیں، پھر مجھے ان لوگوں کی محبت کیوں روکے ہوئے ہے۔ اف۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ یہ [illegible] نے [illegible] لبنیٰ تو مجھ سے نفرت کرتی ہی ہے مگر مسز نعمان کو میں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے اپنی پرانی ساڑھی کیا سوچ کر دی ہے۔ میں کوئی بھکارن ہوں۔

وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور الماری میں سے ساڑھی نکال کر دیکھنے لگی۔ [illegible] ساڑھی پھسلتی [illegible] ہاتھوں سے پھسل کر قدموں پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے گلابی پھولوں کا ڈھیر اس کے قدموں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر پڑا ہو۔ شعاع کا جی چاہا وہ اس ساڑھی کو پاؤں تلے مسل دے، مگر نہ جانے کس خیال سے اس نے پاؤں روک دیا۔ وہ ساڑھی اٹھا کر پھر دیکھنے لگی۔ مسز نعمان نے خود لبنیٰ سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی پرانی تھی مگر ساڑھی کا کپڑا بتا رہا تھا کہ وہ نئی ہے، بالکل نئی — شعاع بے سوچے سمجھے ساڑھی اٹھا کر نعمان کے کمرے میں آ گئی۔ نعمان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

کیا بات ہے بیٹی، تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

شعاع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ آہستہ سے بولی:

وہ ایک دن مسز نعمان نے مجھے یہ ساڑھی دی تھی۔

نعمان نے کہا۔ ہاں مجھے معلوم ہے، بازار سے لا کر اس نے مجھے دکھائی تھی۔

شعاع خاموش رہی، نعمان نے پوچھا۔ نہیں پسند آئی یہ ساڑھی، مجھے تو یہ رنگ بہت پسند ہے۔

شعاع نے کہا جی ہاں رنگ تو بہت اچھا ہے، مگر یہ ساڑھی . . . .

شعاع حنا اندر آتے ہوئے بولی۔

جی۔ شعاع کا جی چاہا ساڑھی چھپا دے، مگر حنا نے دیکھ لیا اور مسکرا کر بولی۔

ہوں، یہ کیا ہو رہا ہے۔

نعمان نے کہا۔ یہ مجھے بتانے آئی ہے کہ یہ ساڑھی اسے مسز نعمان نے دی ہے۔

حنا مسکرا کر بولی۔

پگلی تمہارا خیال تھا ہمیں خبر نہیں اور سنو بھئی شعاع تم مجھے مسز نعمان کیوں کہتی ہو، امی کہا کرو، جیسی ہیں بنی کی امی ویسی تمہاری۔

شعاع نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ ایسے موقع پر نعمان کا جی چاہتا تھا کہ شعاع جواب دے، خوب ہنسے بولے، مگر وہ تو جانے کو مڑی۔ حنا نے کہا۔

شعاع میری ایک بات سن لو۔ پرسوں رات کو نعمان صاحب کی صحت یابی کی خوشی میں سب کی دعوت ہے۔ تمہیں ڈاکٹر زیدی کی ہدایت یاد ہے۔

شعاع نے کہا۔ جی ہاں خوب یاد ہے۔

تو ایک ہدایت میری بھی ہے۔

شعاع نے کوئی جواب نہ دیا۔ حنا نے پھر کہا۔

وہ ہدایت یہ ہے کہ دعوت والے دن تم یہی ساڑھی پہنو گی

یہ ساڑھی؟

شعاع نے بے ساختہ نعمان کی طرف دیکھا، وہ اسے ملتجی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شعاع نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ کمرے میں داخل ہوئی تو کرسی پر بیٹھے افتخار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر گردن موڑ کر کاپی پر لکیریں کھینچنے لگا۔ غزالہ کی بڑی بیٹی نے بھوں بھوں روتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ امی، ابا اسی طرح میری کئی کاپیاں خراب کر چکے ہیں۔

غزالہ نے جھڑک کر کہا۔ تم سنبھال کر کیوں نہیں رکھتی ہو۔

گڈی روتے روتے بولی۔ میں تو سنبھال کر رکھتی ہوں مگر ابا بستے میں سے گھسیٹ لاتے ہیں اور اسکول میں مس ہماری پٹائی کرتی ہیں۔

غزالہ نے چلا کر کہا۔ تو میں کیا کروں۔ یہ ساری مصیبت میری جان کو ہی ہے۔

میمونہ بیگم نے گڈی کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے طنزیہ تیر چلایا۔

مصیبت بھی تو تمہاری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔

ی آپ کیوں میرا جی جلانے آجاتی ہیں۔

تم کیا کہ کسی کا جی جلاتی ہو

غزالہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میمونہ بیگم نے کہا

نکالو اس دیوانے کو گھر سے، سارے محلے میں تماشا بن گئے ہیں ہم۔

غزالہ نے کہا۔ آپ کو اس سے واسطہ۔

واسطہ ہے تو کہتی ہوں۔ میرا گھر پاگل خانہ نہیں، اس کو بھیجو پاگل خانے۔

غزالہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

آپ نے تو زندگیوں کو تماشا بنا رکھا ہے۔ ایک کو گھر سے نکالا، اب اسے نکالنے کے درپے ہیں۔ یاد رکھیں یہ مکان میرا ہے جو اس میں رہتے ہوئے مصیبت میں ہے، وہ نکل جائے۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ تمہارا مطلب ہے میں نکل جاؤں۔

غزالہ نے منہ پھیر کر کہا۔

میرا کوئی مطلب وطلب نہیں، اگر آپ کو یہاں تکلیف ہے تو بے شک چلی جائیں۔

میمونہ بیگم نے نواسی کو چھوڑا اور زور زور سے روتے ہوئے بولیں۔

ارے ایسا ظلم کسی نے دیکھا۔ شوہر چھوڑ گیا تو میں نے اسے سنبھالا، اور اب مجھے کہتی ہے گھر سے نکل جاؤ۔ ارے نوکروں کی طرح کام کیا۔ تمہارے بچوں کو پالا۔

غزالہ نے چڑ کر کہا۔

آپ سے کس نے کہا تھا یہاں آنے کو، میرا گھر برباد کر دیا اور اب بھی چین نہیں، مجھے طعنے دیتی ہیں تو سن لیں مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔

میمونہ بیگم نے جلدی سے آنسو پونچھے اور کمرے سے جاتی ہوئی بولیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا نام بھی میمونہ ہے۔ مَیں تو تمہیں اور سب کو اس گھر سے نکال دوں۔ کس میں ہمت ہے جو مکان کی ملکیت کا دعویٰ کرے گا۔ کھڑے کھڑے رسوا کر دوں گی۔ کسی اکڑ میں نہ رہنا سمجھیں

میمونہ بیگم کے جانے کے بعد غزالہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

الٰہی میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔

وہ بڑبڑائی۔ نگاہ اٹھا کر افتخار کی جانب دیکھا۔ وہ ہر کسی سے بے نیاز پنسل تھامے کچھ لکھ رہا تھا اور ساتھ ہی بڑبڑا رہا تھا۔

ڈیڑھ لاکھ کی کوٹھی ——— پچاس ہزار کی کار۔

یہ تو ہوئے دو لاکھ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف کس قدر خرچ ہو رہا ہے۔ اس گھر کے تو اخراجات ہی بڑھتے جا رہے ہیں —— خیر —— خیر ہم لڑکی کی قیمت اور زیادہ مانگیں گے —— تین لاکھ پانچ لاکھ —— سات لاکھ۔

غزالہ نے افتخار کے ہاتھ سے کاپی کھینچ کر دُور پھینکی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی کیفیت سے بے خبر افتخار کہہ رہا تھا۔

لو بھئی تم تو رونے لگیں۔ ایسا کرو میری کار تم لے لو، میں دوسری کار خرید لوں گا۔ ٹھیک ہے نا۔

غزالہ نے آنسو پونچھ لئے۔ اب وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کا ذہن بہت دُور جا رہا تھا۔ پھر اس نے افتخار کی طرف دیکھا اور بولی۔

آپ کو یہ پیسے مل کر رہیں گے۔ آپ قیمت نہیں لگا سکتے، مگر میں تو لگا سکتی ہوں۔

دروازے کے پیچھے کھڑی میمونہ بیگم نے سوچا۔

اب غزالہ باہر جائے تو میں اس کا پیچھا کروں گی۔ معلوم تو ہو یہ روپوں کا کیا قصہ ہے۔

ان دونوں سے بے نیاز، بلکہ ساری دنیا سے بے نیاز افتخار اب اخبار کے حاشیے پر

وں کا حساب لکھ رہا تھا۔

سُنو۔

شعاع نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ لبنیٰ نے اس کے چونکنے کا کوئی نوٹس نہ لیا اور بولی۔

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

شعاع نے سر جھکا کر کہا جی

لبنیٰ نے بالکونی سے باہر نگاہ ڈالی پھر پلٹ کر دیکھا۔ نعمان کے کمرے کی طرف لحظہ بھر دیکھا اور بولی۔

اپنے کمرے میں چلو، وہاں بات کروں گی۔

شعاع اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ لبنیٰ نے ایک نگاہ کمرے پر ڈالی اور بولی۔

ٹھیک ہے جہاں تمہیں اتنے عیش میسر ہوں تم وہاں سے کیوں جاؤ گی۔

شعاع اس اچانک حملے سے گھبرا کر بولی۔ جی

لبنیٰ نے کہا۔

یہ جی جی کیا لگا رکھی ہے۔ میں ٹھیک ہی تو کہتی ہوں۔ جگہ جگہ ٹھوکریں کھانے والی لڑکی کو اچانک اچھا گھر مل گیا، اچھا کھانا، اچھا پہننا، پھر اسے اور کیا چاہئے۔

وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر غضبناک شیرنی کی طرح بولتی رہی۔

تم نے میرے ماں باپ کا دل میری طرف سے پھیر دیا، انہیں میرے خلاف بھڑکاتی رہتی

مگر یہ نہ سمجھ لینا کہ اس میں تمہارا بھلا ہوگا۔ بیٹی تو ان کی میں ہی ہوں، کچھ بھی کر لو، میری جگہ نہیں

ے سکتیں، جس دن تمہاری سازش سب کو معلوم ہوئی میرے ابو خود تمہیں گھر سے نکال دیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجاع کا سر کچھ اور جھک گیا۔ لبنیٰ اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

میں نے تمہیں اپنی دوست سمجھا مگر تم نے مجھ سے دشمنی کی، پھر میرے ہی گھر آ کر میری ہی حیثیت چھینی، میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ تم نکل جاؤ اس گھر سے، تمہارا حق ہی کیا ہے یہاں، تم نے مجھ سے سہیل چھیننا چاہا، مگر میں ایسا نہ ہونے دوں گی۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں دھکے دے کر نکالوں تم خود ہی نکل جاؤ۔

لبنیٰ نے کمرے سے جاتے جاتے کہا۔

کل صبح میں تمہاری منحوس صورت اس گھر میں نہ دیکھوں۔ تم نے ہماری خوشیوں کو لوٹ لیا ہے، ہمارے ہنستے بستے گھر کو نظر لگا دی ہے۔ تمہارا کوئی گھر بار نہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ سن لو، اگر میں نے تمہیں کل اس گھر میں دیکھا تو ایک حشر برپا ہو جائے گا اور ہاں ابو کو اس بات کا علم نہ ہو، ورنہ نتائج تم جانتی ہو۔

آہ شجاع ——

معصوم بے بس شجاع، تیرے نصیب میں تو جانے اور کیا کیا دکھ ہیں۔ کیا تو اب بھی اتنی ہی باہمت ہے۔

یا ——

تیری ہمت ٹوٹ گئی ہے۔ تو بکھر گئی ہے شجاع۔

لرزتی کانپتی شجاع نے کرسی کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا اور بولی۔

نہیں میری ہمت کوئی نہیں توڑ سکتا۔

میں اتنی ہی باہمت ہوں۔ میں دکھوں کو شکست دوں گی۔ میں خود کو ٹوٹنے نہیں دوں گی۔

مگر نہیں ہے —— وہ کرسی میں گر کر رونے لگی۔ باہر گہرا اندھیرا سرعت سے غموں کی چادریں پھینکتا رہا اور وہ تنہا بیٹھی روتی رہی۔

وہ —— کہ جس کا دنیا میں سب کچھ تھا۔ ماں باپ بھی —— بہن بھائی بھی۔ اور سب سے بڑھ کر ایک محبت کرنے والا دل بھی۔ مگر وہ اس اندھیری رات کے سناٹے میں موم بتی کی طرح پگھلتی رہی۔ اور اس کے آنسو خشک کرنے والا کوئی نہ تھا۔

کوئی ایسا نہ تھا جو 'بیٹی' کہہ کر اسے اپنے سینے میں چھپا لیتا۔ لبنیٰ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ واقعی اس کا کوئی گھر بار نہیں تھا، پھر اس کا پرائے گھر پر حق ہی کیا تھا۔ شجاع نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روکیں۔ ایسے میں اس کے لبوں پر ایک ہی لفظ آیا۔

ابو ——

وہ خود حیران رہ گئی۔ لفظ ابو کے ساتھ ہی وہ نامکمل ہیولا جسے وہ بچپن سے ہی نامکمل اور دھندلا سا دیکھتی تھی۔ اب واضح ہو کر سامنے تھا، وہ حیرت زدہ سی بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن نے ابو کے ساتھ ہی نعمان کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔

بیٹی ——

ہیولا پکارا۔ اس نے ہاتھ بھی پھیلائے مگر شجاع نہ ہلی۔

نہیں یہ میرے نہیں، لبنیٰ کے ابو ہیں۔ میرے ابو تو خبر نہیں کہاں ہیں۔

ہیولا غائب ہو گیا۔

ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ روتی رہی۔ ابو، ابو پکارتی رہی۔

ابو کہاں ہیں، آپ آ جایئے ابو، اب آ جایئے۔

بند کمرے میں وہ ابو کو پکارتی رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات گزرتی رہی۔ شعاع عجیب تذبذب کے عالم میں تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ ایک تو لبنیٰ کی باتوں سے ہی ذہن اس قدر اُلجھ گیا تھا۔ ایسے میں مختلف خیالات آتے، تھوڑی دیر وہ سوچتی، غور بھی کرتی، پھر ایک جھٹکے کے ساتھ ان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اسے کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ دماغ کئی خیالات اور پریشانیوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔

وہ اس گھر میں رہ رہی تھی، اور وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اس گھر سے جانا نہیں چاہتی تھی، مگر وہاں رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ اس گھر میں کیسے رہ سکتی تھی جہاں لبنیٰ اسے اپنی خوشیوں کا قاتل سمجھتی تھی۔ ہر بات کا الزام اس پر دیتی تھی۔

وہ اس گھر سے کیسے چلی جائے جہاں نعمان اور حنا کی محبت تھی، ان کی شفقت بھری نظریں تھیں

مگر ———

دوسری طرف لبنیٰ کی قہر بھری نگاہیں اور طنز آمیز باتیں تھیں۔ اس نے بہت کچھ برداشت کیا تھا مگر اب برداشت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ خطا کسی کی بھی سہی، مجرم کوئی بھی سہی مگر فیصلہ اسی نے کرنا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا۔

رات کا آخری پہر بھی رخصت ہو رہا تھا، وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر جانے کو تیار تھی۔

اذان ہو رہی تھی، جب وہ اپنا بیگ سنبھال کر باہر نکلی۔ دبے دبے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی، پورے گھر میں سناٹا تھا، سب لوگ سو رہے تھے۔ نعمان کے کمرے کے بند دروازے کے پاس وہ چند لمحے رُکی، کیسا جی چاہتا تھا کہ اس شفیق انسان کی صورت ایک نظر دیکھ لے، جس میں اسے باپ کا عکس نظر آیا تھا، مگر ایسا ہونا ناممکن تھا۔ وہ ایک حسرت بھری نگاہ دروازے پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ سویرا اتنا تھا کہ اسے باہر جاتے ہوئے کسی نے بھی نہ دیکھا۔ چوکیدار بھی اس وقت

منہ دیوار کی طرف کئے وضو کر رہا تھا۔ اس لئے وہ آہستگی سے باہر نکل آئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پلٹ کر نعمان کی کوٹھی پر نظر ڈالی، اسے وہ معصوم سا زرد، بے بس چہرہ یاد آگیا، جو بیمار تھا اور جسے ایسے ہمدرد کی ضرورت تھی جو اس کے دل کی اتھاہ کو پا لیتا۔ شعاع کی نگاہ کوٹھی کی عمارت سے ہٹ کر سیاہ چمکتی ہوئی سڑک پر پڑی۔ جو زمین پر لیٹی اس کے قدم اپنے سینے پر لینے کو تیار تھی، دور تک جاتی سیاہ سڑک۔ اور شعاع مضبوط قدموں سے اس سیاہ سڑک کے سینے پر چل پڑی۔

نعمان نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ نہ جانے دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ نعمان نے سائڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ گولی نکال کر چوس لے، مگر گولی چوسنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔ شاید خواب دیکھا تھا۔ نعمان نے اُٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ صبح ہو چکی تھی، مگر شعاع ابھی تک نہیں آئی تھی۔ نعمان کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔

شعاع

مگر شعاع کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ نعمان نے پھر پکارا۔

شعاع ——— شعاع

مگر یہ سعی بھی رائیگاں گئی۔ نعمان گھبرا گیا۔ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ حنا آگئی جلدی سے بازو پکڑ کر بولی۔

کیا بات ہے، کہاں جا رہے ہو۔

نعمان نے سراسیمگی سے کہا۔

میں شعاع کو پکار رہا ہوں وہ جواب نہیں دیتی۔

اس سے پہلے کہ حنا اسے کچھ اور کہے، نعمان کمرے سے باہر نکل آیا، حنا اس کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔ شعاع کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ حنا نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بولی۔

شماع ـــــ

ایک منٹ کے انتظار کے بعد نعمان پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ غسل خانے کا کھلا دروازہ اور خالی کمرہ اپنے مکین کی غیر حاضری کی داستان سنا رہا تھا۔ میز پر لیٹر پیڈ رکھا تھا۔ جس کے صفحے صبح کی نرم ہواؤں میں ہولے ہولے پھڑپھڑا رہے تھے۔ نعمان کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ اسی لمحے حنا نے اس کے ہاتھ میں لیٹر پیڈ تھما دیا۔ لکھا تھا۔

"میرے محسن، اے شفیق انسان!

میں جا رہی ہوں ـــــ یہ لفظ لکھنا کتنا آسان ہے، لیکن جس مشکل سے میں یہاں سے جا رہی ہوں، وہ اگر بتا بھی دوں تو آپ سمجھ نہیں سکتے۔ بہرحال آپ سب کے سکون کی خاطر میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔

اے شفیق انسان کہ میں آپ کو کوئی اور نام نہیں دے سکتی۔ میری زندگی کی کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ میں نہیں جانتی میرا باپ کون تھا۔ میری ماں کو تو آپ نے دیکھ لیا ہے مگر آپ کو علم نہیں کہ اس گھر میں میری نانی بھی تھی، وہ مجھے منحوس کہتی تھی۔ شاید اسی نحوست کا نتیجہ ہے کہ میں کسی جگہ بھی سکون سے نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں خلوص و محبت کم نہیں۔ میرے حصے میں بھی یہ خلوص یہ محبت آئی۔ مگر یہ میرا منحوس وجود ہی تھا جس نے مجھے ان تمام چیزوں سے دُور کر دیا۔

یقین مانیں میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی، آپ کی اور آپ کی بیوی کی محبت اور شفقت مجھے روک رہی ہے مگر میں رُکنا نہیں چاہتی، اس لئے کہ یہ میرا حق نہیں اور یہ میری منزل بھی نہیں، آپ لوگوں کی محبت و شفقت کی حق دار آپ کی اولاد ہے۔

اور میری منزل . . . فی الحال میری کوئی منزل نہیں۔ بہت مدت بعد میں نے ایک ہنستے مسکراتے گھر کو دیکھا تھا، مگر شاید اس گھر کو میری نظر لگ گئی۔ اے شفیق انسان! میں نے اپنے باپ کو

آج تک نہیں دیکھا۔ وہ آپ کا ہم نام ضرور ہے مگر کاش وہ آپ جیسا شفیق باپ بھی ہوتا۔ کاش وہ گھر سے جاتے وقت مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا ہوتا یا پھر جاتے جاتے اپنی محبت کا کچھ حصہ ہی چھوڑ گیا ہوتا۔ آپ نے میری ماں کو دیکھا ہے، آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے ماں کو کیوں چھوڑ دیا یہ بات بڑی شرمناک ہے۔ میری ماں نے دوسری شادی کر رکھی ہے، وہ اسے کچھ بھی سمجھے مگر میں اپنے باپ کا مقام اسے نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے گھر چھوڑ دیا۔ آج اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے بہت دکھ اٹھائے، پرایا گھر پرایا ہی ہوتا ہے، مگر میرے لئے سب گھر پرائے ہیں، کیونکہ گھر تو ماں باپ سے ہوتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گھر تو باپ سے ہوتا ہے۔ میں نے گھر چھوڑا۔ محنت کی، مگر ہمت نہ ٹوٹنے دی۔ ہمت تو میری اب بھی نہیں ٹوٹی مگر اس گھر کو چھوڑنے کا صدمہ ضرور شدید ہے۔ اُمید ہے آپ میری اس حرکت کو معاف فرمائیں گے۔ اپنی اس گستاخی پر شرمندہ ہوں۔ امید ہے جلد ہی آپ مجھے فراموش کر دیں گے۔ مگر ـــ مگر میں شاید ساری عمر آپ لوگوں کو فراموش نہ کر سکوں۔ آپ لوگوں کی محبت ہمیشہ مشعل کی طرح میری راہوں میں جگمگاتی رہے گی۔ آپ لوگوں کا خلوص و محبت ایک مثال بن جائے گی۔

یہ ہے میری زندگی کی عجیب کہانی ـــــ اور یہ ہے میرے نصیبوں کا چکر جو مجھے کہیں بھی سکون سے نہیں رہنے دیتا اور نہ ہی رہنے دے گا۔ میں بھی آپ لوگوں کو اور آپ کے خلوص و محبت کو بھلا نہ سکوں گی۔

شماع"

غنیمت تھا کہ نعمان کرسی پر بیٹھا تھا، ورنہ وہ زمین پر گر جاتا۔ حنا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر نعمان کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح ساکت کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ حنا نے آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے لیٹر پیڈ پکڑ کر میز پر رکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لقمان ـــــ نعمان اُٹھئے اپنے کمرے میں چلئے۔

وہ خالی خالی نظروں سے حنا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا

حنا وہ چلی گئی ـــــ میری بچی چلی گئی۔ مجھے بیمار چھوڑ کر۔

اس کا بے بسی سے بھرپور لہجہ سن کر حنا اس کے الفاظ پہ غور نہ کر سکی۔ بولی۔

چلئے اپنے کمرے میں۔

نعمان نے پھر کہا۔ میری بچی میرے پاس کیوں نہیں آتی؟

حنا سمجھی کہ نعمان لبنیٰ کا پوچھ رہا ہے۔ کہنے لگی۔

کمرے میں چلیں، میں خود اسے لے کر آتی ہوں۔

وہ نہیں آئے گی۔

حنا نے کہا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے لے کر آؤں گی۔

نعمان خوش ہو گیا، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ وعدہ کرتی ہو ـــــ اسے لے کر آؤ گی۔

ہاں، وعدہ کرتی ہوں ـــــ اَب اُٹھیے۔

نعمان اٹھ کھڑا ہوا۔ حنا اسے کمرے سے باہر لے آئی۔ خالی کمرے میں شعاع کے خط کے صفحے پھڑپھڑاتے رہے۔

نعمان کو بستر پر لٹا کر حنا باہر نکلی تو اس نے خود کو بہت مطمئن محسوس کیا۔ ریلنگ پر کہنیاں ٹیک کر اس نے ہال میں نگاہ ڈالی۔ ابھی بچے ناشتے کے لئے تیار نہ ہوئے تھے۔ حنا نے سوچا۔ جب تک وہ یہاں تھی۔ میں نے کبھی اس کے جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مگر وہ خود ہی چلی گئی ہے تو اچھا ہے۔ دیکھو تو اس کے جاتے ہی نعمان کو لبنیٰ کا خیال آ گیا ـــــ واقعی جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی، جانے کیوں سب لوگ ایک دم بدل سے گئے تھے۔ لبنیٰ، نعمان اور سب سے بڑھ کر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے بھی تو بدل گئی تھی۔ کیسا لبنیٰ پر غصہ کرنے لگی تھی! اور پھر اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ساڑھی بھی لا کر دی تھی۔

اس خیال کے ساتھ ہی حنا کو یاد آیا کہ شعاع کے کمرے میں پلنگ پر نفاست سے تہہ کی ہوئی ساڑھی پڑی تھی۔ گویا شعاع اسے واپس کر گئی تھی۔ حنا کو تھوڑا سا افسوس ہوا۔

حنا نے لبنیٰ کو یہ خبر سنائی، لبنیٰ کو فخریہ مسکراتے دیکھ کر حنا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس بات کو جانتی تھی۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

لبنیٰ، کیا تمہیں اس کے جانے کی خبر تھی۔

نہیں۔ ۔ ۔ مگر میں اسے جانتی ہوں، وہ کہیں بھی ٹک کر نہیں رہ سکتی۔

اچھا۔

اور کیا کسی سے بھی پوچھ لیں، سعدیہ ہے، مسز فاروقی ہیں۔

چلو چھوڑو، ہاں جلدی سے ناشتہ کر لیں تمہارے ابو تمہیں یاد کر رہے ہیں۔

خیریت تو ہے۔

حنا مسکرا کر بولی۔ وہ تو تمہیں روز یاد کرتے ہیں، مگر تم ہی ان کے پاس نہیں جاتیں۔

لبنیٰ نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ اَب ضرور جاؤں گی۔

سچ بیٹی ـــــ

لبنیٰ نے خالی کپ میز پر رکھا اور بولی۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ چلیئے

لبنیٰ سے بھی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے حنا نعمان کے کمرے میں پہنچی اور بولی۔

اٹھئے ـــــ دیکھئے میں آپ کی بیٹی کو لے آئی۔

اچھا، کہاں ہے وہ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حنا نے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں مسکراتی ہوئی لبنیٰ کھڑی تھی۔ پھر بولی۔

دیکھئے وہ کھڑی ہے ــــ وہ ۰ ۰ ۰ ۰ ؟

نعمان کا مسکراتا چہرہ بجھ گیا۔ دونوں بازو نڈھال سے ہو کر گود میں گر گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ لبنیٰ اس کی کیفیت سے بے چین ہو کر بھاگ کر اس سے آ لپٹی۔ اور روتے ہوئے بولی۔

ابو مجھے معاف کر دیں۔

وہ روتی رہی بڑی دیر بعد نعمان نے مشکل سے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر لبنیٰ کے سیاہ بالوں پر جگمگانے لگے۔ نعمان کے دل نے پکار کر کہا۔

شعاع میری بچی کہاں ہو تم ــــ مگر اس کے ہونٹ خاموش تھے بالکل خاموش۔

ایک مریض کی حالت بہت خراب تھی۔ بے چارے ڈاکٹر زیدی کو ساری رات اس کے پاس خود موجود رہنا پڑا۔ صبح جب مریض کی حالت خطرے سے باہر ہوئی تو وہ سکون سے سو گیا تو ڈاکٹر زیدی اس کی طرف سے مطمئن ہوئے تو انہیں اپنا خیال بھی آیا۔ وہ تھک کر چور ہو چکے تھے گزشتہ شام کسی عزیز کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں وہ بہت بے چین رہے تھے۔ اور رات ایک مریض کی نذر ہوئی۔ انہوں نے ایک لمبی انگڑائی لی اور نرس سے کہا۔

تم اب اس کے پاس رہنا ضرورت ہوئی تو مجھے بلا لینا۔

نرس نے پوچھا

آپ گھر جائیں گے یا آفس میں موجود ہوں گے۔

ڈاکٹر زیدی نے چند لمحے سوچا پھر بولے۔

گھر جاؤں گا۔ تھوڑا آرام کروں گا ضرورت ہوئی تو فون کر دینا۔

جی اچھا۔

ڈاکٹر زیدی ضروری چیزیں لینے آفس میں داخل ہوئے تو ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کئے ...ا اتنی صبح کسی کو آفس میں دیکھ کر ڈاکٹر زیدی ذرا ٹھٹکے اور پھر اپنی کرسی کی طرف بڑھے تو وہ ...ا ہو گئی۔ ڈاکٹر زیدی جلدی سے اس کی طرف آئے۔

شعاع، کیا بات ہے بیٹی ؟ تم اور یہاں ؟

وہ زبردستی مسکرائی۔

کچھ نہیں، بس ایسے ہی آ گئی۔

مگر اس کا چہرہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ وہ جو کہا کرتی تھی کہ چہرے کو غموں کا اشتہار نہیں بنانا چاہئے ...و کہا کرتی تھی، غم تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ وہ جو کہا کرتی تھی کہ مصیبتوں کا مقابلہ حوصلہ مندی ...ے کرنا چاہئے۔ وہ جو کبھی ہمت نہ ہارنے کی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس وقت اپنی دلی کیفیت چھپانے ...ملا ناکام رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی بیٹھ گئے اور شعاع کو کھڑے دیکھ کر بولے۔

بیٹھو بیٹھو، جلدی بتاؤ، کیا ہوا ؟

پھر اس کے بیگ کو دیکھ کر بولے۔ یہ کیا ہے ؟

شعاع نے دھیمے لہجے میں کہا میں وہاں سے آ گئی ہوں ڈاکٹر۔

مگر کیوں ؟

میں وہاں نہیں رہ سکتی۔

کسی نے کچھ کہا ہے ؟

نہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھو بی بی، میں سچ بات سننا چاہتا ہوں۔ اگر بغیر وجہ کے آئی ہو، تو تمہیں واپس جانا ہوگا کوئی وجہ ہے تو مجھے بتانا ہوگی —— نعمان کو تمہارے آنے کی خبر ہے ؟

نہیں۔

اوہ —— چھپ کر آئی ہو۔

جی۔

بہت غلط، بہت ہی غلط حرکت ہے۔ جانتی ہو تمہارے اس طرح آنے سے کسی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

پہلی دفعہ شعاع نے سر اُٹھا کر بات کی۔ ڈاکٹر یہ پہیلیاں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مَیں وہاں سے آگئی ہوں۔ بس۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا —— اور بھی بولو۔

اور یہ کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ ان کے لئے کسی دوسری نرس کا . .

مَیں نعمان کو فون کرتا ہوں۔

شعاع کھڑی ہوگئی۔

ڈاکٹر مَیں آپ پر اعتماد کر کے یہاں آئی ہوں۔ مَیں نہیں چاہتی کہ ان لوگوں کو میری یہاں موجودگی کی خبر ہو، مَیں چاہتی ہوں آپ ان کو یہ بات نہ بتائیں۔

اس میں کوئی حرج ہے ؟

جی ہاں، بہت۔

مگر میں جھوٹ کیوں بولوں۔ کیوں چھپاؤں، مَیں ان سے یہ بھی تو کہہ سکتا ہوں، شعاع اب آپ کے ہاں نہیں آئے گی۔

شعاع گھبرا سی گئی تھی۔ بولی۔

اگر آپ ان لوگوں کو یا کسی کو بھی میرے یہاں ہونے کی خبر دیں گے تو ابھی بتا دیں، میں یہاں ہاں بھی جاؤں گی۔

ڈاکٹر زیدی بھونچکا رہ گیا۔

گر کہاں ؟

ڈاکٹر صاحب میرے نصیب گردش میں ہیں، کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی۔ مَیں زمانے بھر کی ٹھوکریں کھاؤں گی مگر اب میں کسی کو اپنا نہ سمجھوں گا۔ کسی میں بہن کا، ماں کا، باپ کا پیار تلاش ... اں گی۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ بیوقوف مت بنو، بیٹھو۔

ب میں اجازت چاہتی ہوں۔

ں کہتا ہوں بیٹھو۔

پہلے میری بات کا جواب دیں۔

ڈاکٹر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ڈاکٹر نے ریسور اُٹھایا۔ شعاع ... اسے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ہیلو۔

. . . . .

جی کیا۔ کیا فرمایا۔

کہاں گئی ؟ —— یہاں ؟ جی نہیں شعاع یہاں نہیں آئی۔

میں ایک گھنٹے تک آتا ہوں، ایک مریض کی حالت خراب ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوکے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں آتا ہوں۔ ڈاکٹر زیدی نے فون بند کر کے شعاع کی طرف دیکھا اور بولا۔

اُب تو تمہیں جواب نہیں چاہیے۔

شعاع نے سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر زیدی کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

چلو، میرے ساتھ گھر چلو۔

شعاع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

میرے گھر، ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں۔

نعمان شعاع کے جانے کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ وہ سوچوں کی دُنیا میں گم تھا۔ روپیہ ہے، پیسہ ہے، بیوی ہے، اولادیں ہیں، لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔

میرا سکون میری شعاع ہے۔ میری بیٹی۔ میری بدنصیب بیٹی۔

نعمان انہی خیالات میں غرق تھا کہ غزالہ نے دروازے پر آ کر کہا، مَیں اندر آ سکتی ہوں۔

تم پھر چلی آئی ہو، تم پھر آ گئی ہو میری زندگی میں زہر گھولنے کے لئے۔ نعمان نے کوئی جواب نہ دیا۔

غزالہ اندر آ گئی۔

مَیں رقم لینے آئی ہوں۔

رقم — بیٹی کا معاوضہ —— ؟ مگر شعاع تو یہاں نہیں ہے، وہ تو جا چکی ہے۔

غزالہ غصے سے بھر گئی۔

یہ نہیں ہو سکتا، یہ نہیں ہو سکتا، تم نے اسے چھپا دیا ہے۔ میں آج اسے لئے بغیر نہ جاؤں گی

نعمان سوچوں میں گھرا بیٹھا تھا کہ اتنے میں غزالہ آ گئی، بیٹی کا معاوضہ لینے کے لئے۔ نعمان نے اسے بتایا کہ شعاع اب یہاں نہیں ہے تو غزالہ نے غصے سے کہا۔

تم مجھے فریب دے رہے ہو، تم نے اسے چھپا لیا ہے تاکہ بیٹی کو روکنے کی قیمت نہ دینی پڑے۔

نعمان پہلے ہی بہت پریشان تھا، گھبرا کر بولا۔

مَیں نے اسے کہیں نہیں چھپایا۔

غزالہ اور غصیر ہو گئی۔

میں آج اس بات کا فیصلہ کر کے آئی ہوں کہ شعاع کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گی، مجھے روپے نہیں چاہیے، بس شعاع چاہیے۔

نعمان نے پھر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سچ کہہ رہا ہوں، شماع یہاں نہیں ہے۔

غزالہ چند لمحے اس کی سمت دیکھتی رہی پھر لفظ چبا چبا کر بولی۔

وہ یہاں نہیں ہے، میری بیٹی کو چھپا لیا اور کہتے ہیں وہ یہاں نہیں ہے، آپ نے میرے ساتھ ڈرامہ کھیلا، قدم قدم پر مجھے فریب دیئے، آپ نے میرا گھر برباد کیا، مجھے سدا کھلونا سمجھا اور اب بھی مجھ سے کھیل رہے ہیں۔ میری تباہی میں کیا اور کوئی کسر رہ گئی ہے۔ سوچا تھا کہ بیٹی نہ سہی روپیہ ہاتھ آئے گا تو اچھے دن گزریں گے، مگر آپ نے نہ روپیہ دینا چاہتے ہیں نہ بیٹی —— اب مجھے روپے نہیں شماع چاہئے، صرف شماع۔

نعمان نے کہا۔

غزالہ ان زخموں کو نہ چھیڑو، انہیں پھر سے ہرا نہ کرو، میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں ورنہ کیا تمہیں خبر نہیں کہ کس نے کس کو تباہ کیا، کیا تم نہیں جانتیں کہ کس نے کس کو کھلونا سمجھا، کس نے قدم قدم پر فریب دیئے، تم نے یا میں نے؟ وہ تو کچھ خدا کو ہی منظور تھا جو میں زندہ سلامت تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، ورنہ تم نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

غزالہ نے کہا۔

مجھے الزام دینے کی ضرورت نہیں، آپ کو کیا فرق پڑا۔ دولت ہے، گھر بار ہے، سکون ہے اور کیا چاہیئے۔

نعمان نے جواب دیا۔

ہاں کہنے کو تو میں شاید آرام اور سکون سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے سب کچھ میسّر ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا سکون میرے پاس نہیں، میرا سکون تو میری بیٹی ہے، جو اب یہاں نہیں ہے۔

غزالہ نے کہا

یہ باتیں کسی اور کو بتایئے گا، بیٹی کو تو نوکرانی بنا کر رکھا ہوا تھا اور سکون تلاش کرتے ہیں۔

نعمان جس بات کو بھولنا چاہتا تھا غزالہ اسے بار بار دہرا رہی تھی۔ کہنے لگا۔

تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ نوکرانی نہیں تھی۔ بیٹی باپ کی تیمارداری کرے تو نوکرانی نہیں ہو جاتی۔ میرے ساتھ پتہ نہیں کیا مجبوریاں تھیں اور اس طرح اسے رکھنے پر کیوں مجبور تھا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا۔

غزالہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اگر آپ بتا دیتے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے تو شاید آپ کی بیگم گھر چھوڑ کر چلی جاتی؟

نعمان نے کہا۔

مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔

تو حالات کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے، کیوں نہیں شماع کو اس کا اصل مقام دیتے۔

نعمان نے کہا۔

غزالہ تم اس بات سے لاعلم ہو کہ مصلحت کیا ہے، کچھ بات ہے ہی جو مجھے اپنی بیٹی خریدنا پڑ رہی ہے۔ کسی نے آج تک دنیا میں دیکھا کہ باپ ماں سے بیٹی خرید رہا ہے۔

غزالہ نے کہا۔

نہیں دیکھا تو لوگ اب دیکھ لیں گے، کیوں نہیں خریدتے، کیوں نہیں دام چکاتے؟

نعمان نے کہا

اس وقت تم جاؤ، میں اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں جونہی شماع ملی تمہیں پیسے بھی مل جائیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غزالہ نے کہا۔

مجھے تو رقم آج ہی چاہئے۔

نعمان نے کہا۔

مَیں تمہیں آج بھی رقم دے سکتا ہوں، مگر میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ آج میں اپنے آپ میں نہ
مجھے رقم دینے سے انکار نہیں۔ مگر اس کی رقم نہیں آئی۔ تمہیں ابھی اور انتظار کرنا پڑے گا۔

غزالہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے مگر اسی وقت نعمان نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

اب جاؤ وقت آنے پر تمہیں رقم مل جائے گی۔

نعمان کے لہجے میں عجیب سی سختی تھی، اس لئے غزالہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو، شجاع بھی نہ ملے اور رقم بھی ہاتھ سے جائے۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ سب کو بھول بھال کر نعمان کی شاندار کوٹھی اور اعلیٰ سامان دیکھ رہی تھی۔ اس وقت پگلا افتخار اور بچے اس کے ذہن سے کوسوں دُور تھے۔ اور وہ سوچوں میں غرق دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔

غزالہ کے گیٹ سے نکلتے ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت چوکیدار کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔

اے بھائی ذرا پانی تو پلوا دے۔

چوکیدار نے سر سے پاؤں تک میمونہ بیگم کی طرف دیکھا جو حیثیت سے ہرگز ایسی نظر نہ آتی تھی کہ چوکیداروں سے پانی مانگتی پھرے۔ پھر بھی وہ جا کر ٹھنڈا پانی لے آیا۔ میمونہ بیگم پانی پی ہی رہی تھی کہ لمبی سی سیاہ کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ میمونہ بیگم نے بچا ہوا پانی پھینکتے ہوئے گلاس چوکیدار کو لوٹا دیا۔ اور بولی۔

یہ کون لوگ ہیں۔

جی ؟

یہ کار میں کون تھا ؟

اپنی بیگم صاحبہ اور لبنیٰ بی بی۔

لبنیٰ بی بی ——— لبنیٰ بی بی ——— لبنیٰ بی بی

میمونہ بیگم کی سماعت سے یہ نام بجلی کی طرح ٹکرایا اور جلدی سے بولی۔

اے بھائی یہ کوٹھی کس کی ہے ؟

چوکیدار اکتا سا گیا تھا، اندر جاتے جاتے بولا۔

سیٹھ نعمان کی۔

ہوں تو یہ بات ہے۔ یہ ہے شجاع کا خریدار۔ مَیں بھی کہوں اس نک چڑھی لڑکی کو کون خریدے گا۔ مگر موئی غزالہ ہے بہت ہوشیار۔

میمونہ بیگم بہت خوش خوش گھر لوٹیں، مگر معلوم ہوا کہ غزالہ کہیں اور گئی ہے۔ گھر میں اُدھم مچاتے بچے تھے یا دیوانہ افتخار، جو بچوں میں لاکھوں روپے بانٹ رہا تھا۔ میمونہ بیگم نے اسے دیکھ کر کہا۔

لعنت۔

اور پھر اپنے کمرے سے پلنگ پر دراز ہو گئیں۔ لاکھوں روپے کے نوٹ ان کی آنکھوں کے سا
الٹ پلٹ ہونے لگے۔ مگر میمونہ بیگم نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہ کی۔ اسے خبر تھی کہ یہ ابھی خواب ہے۔ مگر جب حقیقت سامنے آئے گی تو افتخار ہی نہیں غزالہ بھی دیوانی ہوگی اور میں لاکھوں روپے کی مالک۔ یہ ہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

حق صاحب گھر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ بدحواس نوکر نے انہیں خبر دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب، بیگم صاحبہ غسل خانے میں گر پڑیں۔

حق صاحب پریشان ہو گئے۔ جلدی سے بولے۔

ارے ــــ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟

نوکر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

جی وہ تو ہوش میں ہی نہیں ہیں۔

حق صاحب جلدی سے اندر بھاگے۔ فضلو کی بیوی نے بیگم حق کو صوفے پر ہی لٹا رکھا تھا۔ خدا جانے غسل خانے سے کیسے لائی ہو گی۔ حق صاحب جلدی سے پکارے۔

بیگم بیگم!

فضلو کی بیوی نے روتے ہوئے کہا۔

جی بیگم کو تو ہوش ہی نہیں جب سے۔

حق صاحب گھبرا کر باہر دوڑے۔

ڈرائیور جلدی گاڑی ادھر لا کر لگاؤ، ہسپتال جانا ہے۔

ایک تو بیگم حق یوں بھی بھاری بدن کی تھیں، پھر بے ہوش آدمی کو سنبھالنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ حق صاحب نے انہیں اٹھا کر کار کی سیٹ پر لٹا تو دیا مگر پسینہ پسینہ ہو گئے۔ جاتے جاتے فضلو سے کہا۔

گھر کا خیال رکھنا اور سہیل آئے تو اسے زیدی کے ہسپتال بھیج دینا۔

ڈاکٹر زیدی نے بیگم حق کا تفصیلی معائنہ کیا۔ سر پر بھی چوٹ آئی تھی اور خطرہ تھا کہ ٹانگ کی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ اس کے لئے ایکسرے کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر زیدی کا خدشہ صحیح ثابت ہوا بیگم حق کی حالت خاصی خراب تھی۔ تقریباً کئی گھنٹے بعد انہیں ہوش آیا۔ اس وقت حواس باختہ

سہیل اندر داخل ہوا۔

امی ــــ

وہ ماں کی طرف جھکا۔ حق صاحب نے ماحول کی رنجیدگی اور سنجیدگی کو بدلنے کے لئے کہا۔

میاں صاحبزادے تمہاری امی بالکل ٹھیک ہے، گھبراؤ نہیں۔

سہیل نے کہا۔

واہ ابو مجھے امی سے بات تو کرنے دیں۔

حق صاحب مسکرا کر بولے۔

شوق سے بات کرو، میں نے تو تمہیں اس لئے ٹوکا ہے کہ کہیں فلمی ہیرو کی طرح تم ماں کا پاؤں پکڑ کر مکالمے نہ بولنا شروع کر دو کہ امی مجھے معاف کر دیں، آپ جو کہیں گی وہی کروں گا۔

ڈاکٹر زیدی ہنس کر بولے۔

کیا حرج ہے اگر ماں کے پاؤں پکڑ لیے تو۔

حق صاحب نے کہا۔

حرج تو ہے خصوصاً اس حالت میں کہ ماں کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو۔

سہیل چیخ اٹھا۔

امی کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔

حق صاحب گھبرائے۔

ارے آہستہ بولو بیٹے۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

بیگم صاحبہ اس وقت سو گئی ہیں، باقی باتیں میرے آفس میں چل کر کر لیں، ذرا چلئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی پی جائے۔

نرس کو بیگم حق کی خبرگیری کا کہہ کر ڈاکٹر زیدی ان سب کو لے کر اپنے آفس میں آگئے سہیل بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ پریشان تو حق صاحب بھی تھے، مگر کہنے لگے۔

حوصلہ کرو سہیل، وہ جلدی اچھی ہو جائیں گی۔

مگر ابو یہ بُرا ہوا۔ یہ سب ہوا کیسے؟

جب وہ اٹھیں گی تو معلوم کر لینا، مگر خدارا وہ والی حرکت نہ کرنا۔

کونسی والی؟

وہی معافی والی۔ تمہیں تو معلوم ہے اس سے لڑ لڑ کر میں اپنی انرجی خوب کھو بیٹھا ہوں اس کا صلہ یہ نہ ملے کہ بیٹا ماں کی باتوں میں آ جائے۔

سہیل مسکرا کر خاموش رہا۔ چائے آ گئی تھی، وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ حق صاحب دو دفعہ جا کر بیگم کو دیکھ کر آئے تھے —— وہ سو رہی تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

آپ لوگ گھبرائیں نہیں بھابی جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔

حق صاحب افسردگی سے بیٹھے تھے۔ بولے

ڈاکٹر صاحب اگر کوئی بیٹی ہوتی تو اس وقت ماں کی خبرگیری کرتی۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

پریشان کیوں ہوتے ہیں، میں انشاء اللہ ایسی نرس کا انتظام کروں گا جو آپ کو کمی محسوس نہ ہونے دے گی۔

شکریہ ڈاکٹر۔ نرس پھر بھی نرس ہی ہوتی ہے۔

تو سہیل میاں کی شادی کر دیں، بہو بھی تو بیٹی ...

حق صاحب نے کہا۔

مشورہ تو آپ کا اچھا ہے، مگر اس وقت شادی ذرا مشکل ہے۔

ڈاکٹر زیدی مسکرا کر رہ گئے۔ حق صاحب نے سہیل سے کہا۔

چلو بیٹا۔

سہیل خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ حق صاحب نے ڈاکٹر سے کہا۔

ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لیجئے گا۔

ضرور۔

سہیل جانے سے پہلے دیر تک ماں کے پاس کھڑا اسے غور سے دیکھتا رہا۔ مگر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر واپس آ گیا۔ حق صاحب اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہے تھے اس لئے خاموش رہے۔

شعاع سوچوں میں گم رسالہ پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کے پاؤں کی گردش رک جائے گی۔ مگر نہیں آج وہ پھر ایک اجنبی گھر میں بیٹھی تھی۔ کیا خبر کس وقت وہاں سے جانا پڑے۔ کہاں —— یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ کبھی نہیں جان پائی تھی۔ بس اسے تو یہ معلوم تھا کہ اسے جانا ہوتا ہے اور وہ چلی جاتی ہے۔

بڑی بڑی حیران آنکھیں پوری کھولے وہ سامنے آسمان کو تک رہی تھی، جہاں ابھی شام کی سیاہی معمولی سی پھیلی تھی۔ مگر ایک بے صبرا ستارہ ابھی سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا جانے کب تک وہ خیالوں میں محو رہتی کہ نوکر نے آ کر پکارا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بی بی جی ٹیلی فون ہے ڈاکٹر صاحب کا۔

شعاع بڑی بے دلی سے اٹھی اور فون ریسیو کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف اتنا کہا۔

ڈرائیور بھیج رہا ہوں فوراً ہسپتال پہنچ جاؤ۔

شعاع ابھی ٹیلی فون کے پاس سے ہٹی ہی تھی کہ معلوم ہوا ہسپتال سے ڈرائیور آیا ہے۔ شعاع نے نہ جانے کیا سوچ کر یونیفارم لفافے میں ڈال کر ساتھ لے لی اور ہاتھ سے اپنے بال درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچھ سوچ کر اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

بابا کوئی خاص بات ہے ہسپتال میں؟

جی خاص ہی ہوگا بے بی۔

مطلب ہے کوئی اور تو نہیں آیا ہوا ڈاکٹر صاحب کے پاس۔

جب میں آیا ہوں تو وہ اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔

جب تک ہسپتال پہنچ نہیں گئے، شعاع کا دل عجیب انداز سے دھڑکتا رہا۔ ممکن ہے لقمان صاحب آئے ہوں اور ڈاکٹر زیدی نے مجبور ہو کر میرا پتہ بتا دیا ہو۔ یا ہو سکتا ہے امی آئی ہوں، وہ تو مجھے زمین کی تہہ میں بھی ڈھونڈ نکالیں گی۔

ڈاکٹر زیدی واقعی تنہا بیٹھا تھا۔ شعاع کو دیکھ کر بولا۔

میں ڈر رہا تھا کہیں تم کچھ اور نہ سمجھ بیٹھو۔

شعاع خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

بیٹھو ضروری بات ہے۔

جی ——

شعاع بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر اٹھا اور بولا۔

آؤ میرے ساتھ۔

اور ڈاکٹر نے اسے لے جا کر سہیل کی امی کے پاس کھڑا کر دیا۔

شعاع نے دیکھا کہ پرائیویٹ کمرے کے ایک بیڈ پر بیگم حق بے ہوش پڑی ہیں، بیگم حق کو دیکھ کر شعاع کے دل میں کئی جذبے ابھرے، شعاع کے سامنے بیگم حق کا وہ چہرہ ابھرا جس میں شعاع کے لئے نفرت تھی، حقارت تھی اور پھر شعاع کے سامنے بیگم حق کا ایک جابر چہرہ ابھرا، ایک فاتح چہرہ سامنے آیا۔ اور شعاع کا جی چاہا کہ وہ ڈاکٹر زیدی سے کہہ دے کہ وہ اس خاتون کی تیمارداری نہیں کر سکتی۔

مگر ——

دوسرے ہی لمحے اس جذبے پر ایک اور جذبے نے قابو پا لیا۔ اور اس نے خود کو سمجھایا۔

نہیں نہیں میں ایک نرس ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں کسی سے نفرت نہ کروں، کسی سے بدلہ نہ لوں، نرس تو نام ہے نرمی کا، محبت کا، سب کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آنے کا۔ اپنے زخموں کو دبا کر دوسروں کے زخم صاف کرنے کا۔ زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کرنے کا —— پیپ بھرے زخموں کو ٹھیک کرنے کا نام نرس ہے۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کر سکتی، نفرت نرس کی سرشت میں داخل نہیں ہے۔ وہ اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ لائی۔

ڈاکٹر صاحب آپ اطمینان رکھیں، میں ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گی، مگر ایک ڈر ہے۔

کیا؟

لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میں یہاں ہوں۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے مگر اس کا بھی کوئی علاج سوچیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ؟

ڈاکٹر زیدی تھوڑی دیر کو سوچ میں ڈوب گئے۔

جب کوئی بیگم حق سے ملنے آئے گا۔ میں سب سے کہہ دوں گا کہ نرس کا انتظام نہیں ہو سکا، اس لئے اپنی ایک عزیز لڑکی کو بلایا ہے اور وہ لڑکی پردے کی سخت پابند ہے لہٰذا ملاقات کے اوقات میں کمرے میں نہیں رہے گی۔

ہاں یہ ممکن ہے۔ شجاع کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

لیکن بیگم حق نہ بتا دیں۔ ڈاکٹر زیدی نے تشویش کا اظہار کیا۔

شجاع نے کہا۔ بیگم حق مجھ سے اس قدر نفرت کرتی ہیں اور مجھے اس قدر حقیر چیز سمجھتی ہیں کہ جب یہ ہوش میں آئیں گی، تو مجھے یہاں رکھنا گوارا نہ کریں گی۔ ان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔

تو ٹھیک ہے۔

شجاع بیگم حق کی تیمارداری میں منہمک ہو گئی، دن رات ایک کر دیا، تیسرے دن پہلی بار بیگم حق نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

مَیں کہاں ہوں ؟

شجاع نے جلدی سے قریب جا کر کہا۔ آپ یہاں ہسپتال میں ہیں۔

کیوں ؟

آپ گر پڑی تھیں اور چوٹ آئی تھی۔

بیگم حق کو گرنے سے پہلے کا کچھ کچھ خیال آیا اور پوچھا۔

اور بیٹی تم کون ہو

نرس

بیگم حق نے کہا۔ تم نرس نہیں ہو، شجاع ہو۔

شجاع نے کہا۔ میں صرف نرس ہوں، نرس کا کوئی نام بھی ہو سکتا ہے۔ شیلا، نسیمہ، عرفانہ

شجاع ـــــ مگر وہ نام اس ہسپتال سے باہر کے نام ہیں۔ یہاں میں صرف ایک نرس

ہوں اور آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

بیگم حق کچھ دیر خاموش رہیں جیسے کچھ کہنے کے لئے مواد جمع کر رہی ہوں۔

بیٹی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔

کس بات کی شرمندگی ؟

اب تم یہ سب کچھ پوچھ کر مجھے اور شرمندہ نہ کرو، بہرحال مجھے معاف کر دو، میں

نے تمہیں غلط سمجھا۔

شجاع نے کہا، بیگم صاحبہ آپ آرام کریں۔ آپ کو زیادہ نہیں بولنا چاہئے۔

بیگم حق نے کہا۔ بیٹی میں ضرور بولوں گی اور پھر چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ لا کر کہا،

بیٹی میں تمہیں آج ایک راز کی بات بتاؤں۔ میرا بولنا آج تک کوئی بند نہ کرا سکا۔ نہ حق صاحب

نہ سہیل، تو بیٹی تم میرا بولنا کس طرح بند کرا سکو گی۔ مجھے بولنے دو، پھر میں تم سے پوچھ کر مشورہ

کر کے بولا کروں گی۔

شجاع نے سوچا۔ بیگم حق کے دماغ پر جو چوٹ آئی ہے اس کا اثر ہے جو اول فول

بک رہی ہیں۔ بہرحال انجکشن کا وقت ہو گیا تھا اور شجاع نے بیگم حق کو انجکشن لگا دیا۔ نیند کا

انجکشن ـــــ ابھی اسے آرام کی ضرورت تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام کے پانچ اور سات بجے کے درمیان کا وقت مریضوں سے ملاقات کا تھا اور پونے پانچ بجے ڈاکٹر زیدی آکر شعاع کو لے گئے۔

آؤ بے بی، جلدی سے آجاؤ، کہیں ایسا نہ ہو حق صاحب یا سہیل آجائیں اور شاید تمہارے پا . . . اور پھر ڈاکٹر زیدی جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرانے لگے۔

دونوں چلتے ہوئے ڈاکٹر زیدی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شعاع نے پوچھا۔

کون ڈاکٹر صاحب؟

میرا مطلب تھا کہ نعمان صاحب — آج کل وہ بہت پریشان ہیں۔

کیوں؟

ان کی بیٹی کھو گئی ہے۔

شعاع نے جلدی سے پوچھا۔ کیا لبنیٰ کھو گئی۔

وہ تمہیں بھی اپنی بیٹی ہی سمجھتے ہیں۔

شعاع نے کہا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب! یہ سچ ہے کہ وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں کتنی محبت، کتنا پیار اور لہجے میں کتنی نرمی۔

اور وہ کہتی رہی۔

بلکہ ڈاکٹر صاحب، سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہ اتنے ہی پیارے ہیں، میں ان سے اتنا ہی پیار کرتی ہوں، جتنا مجھے اپنے باپ سے ہو سکتا تھا — نہیں نہیں ڈاکٹر میں غلط کہہ گئی۔ میرا باپ تو اتنا شفیق نہیں ہو سکتا، میرا باپ مجھ سے اتنا پیار کبھی نہ کرتا تھا۔ وہ تو ظالم تھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ مظلوم بھی ہو سکتا ہے۔

شعاع نے کہا، ہاں مظلوم بھی ہو سکتا ہے، بلکہ مظلوم ہی ہوگا۔ ڈاکٹر آپ نے میری ماں کو نہیں

دیکھا۔ میری ماں کے ساتھ رہنے والا ہر شخص مظلوم ہے۔

اچھا خیر چھوڑو، بیگم حق کو ہوش آیا؟

جی ہاں، آیا تھا اور ہوش میں آتے ہی انہوں نے اول فول بکنا شروع کیا۔

کیا تمہیں کچھ برا بھلا کہا؟

شعاع نے مسکرا کر کہا۔ نہیں بلکہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم نرس نہیں ہو شعاع ہو اور مجھے معاف کر دو۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔

شعاع نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ پر میرا ایک ادھار ہے۔

کیا بے بی؟

آپ نے ایک شخص کی کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا۔

ہاں بیٹی، اس کا وقت بھی آنے والا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک پانچ بجے حق صاحب اور سہیل، بیگم حق کو دیکھنے آ گئے۔ بیگم حق پر اب تک انجکشن کا اثر تھا اور وہ ہوش میں نہ تھیں۔ سہیل نے آ کر آواز دی۔ امی۔ امی۔

حق صاحب نے بھی پیر کا انگوٹھا پکڑ کر کہا۔ بیگم حق نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔

شعاع، شعاع ـــــ بیٹی تم کہاں ہو، مجھے معاف کر دو۔

حق صاحب نے کہا، لو بیٹے، یہ تو الٹی گنگا بہنے لگی۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

بیگم حق نے کہا۔ شعاع بیٹی، تم کہاں ہو۔

حق صاحب نے کہا۔ اسے کسی مینٹل سرجن کو دکھانا پڑے گا۔

سہیل نے کہا۔ ابا جی، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ امی جی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

حق صاحب نے کہا۔ ایسا ناممکن ہے۔ سورج مشرق سے نکل سکتا ہے، ستارے رات کو نظر آ سکتے ہیں، مگر تمہاری امی۔ ۔ ۔

سہیل نے مسکرا کر کہا۔ ابا جی، سورج مشرق سے ہی نکلتا ہے اور ستارے بھی رات ہی میں نظر آتے ہیں۔

حق صاحب نے کہا۔ میں شاید کوئی الٹی بات کہہ گیا ہوں گا۔ بات یہ ہے سہیل میاں کہ اس کڑوی عورت کے ساتھ جس طرح میں نے نبھاہ کیا ہے وہ کچھ میرا ہی دل جانتا ہے اور اب تو شاید میرا بھی دماغ چل چلا ہے۔

بیگم حق نے کہا۔ شعاع! تم میرے پاس آتی کیوں نہیں ہو، مجھے معاف کر دو نا بیٹی پھر ذرا رک کر بولیں۔ اب میں تمہیں یہاں نہ رہنے دوں گی۔ گھر لے جاؤں گی، سہیل کی دلہن بنا کر۔

حق صاحب نے کہا۔ کاش، تم نے ہوش و حواس میں یہ بات کہی ہوتی۔ تو تمہارے بیٹے کی زندگی بن گئی ہوتی۔

بیگم حق اب پہلے سے زیادہ ہوش میں تھیں اور حق صاحب کا جملہ ان کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ بولیں۔ میں ہوش میں ہوں اور سچ کہہ رہی ہوں کہ میں اسے سہیل کی دلہن بنا کر رہوں گی۔

حق صاحب نے کہا۔ مگر وہ ہے کہاں ـــــ اس کی زندگی تو تم سب نے مل کر اس قد غذاب بنا دی تھی کہ اب اس کا پتہ ہی نہیں کہ کہاں ہے۔

بیگم حق نے کہا۔ کہاں سے کیا مطلب؟ وہ یہاں ہے، اسی ہسپتال میں، وہ نرس اور میری دیکھ بھال وہی کر رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل نے باپ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کیا یہ سچ ہے ابا جی۔

باپ نے کہا، تمہاری ماں نے آج تک سیدھی اور سچی بات کوئی نہیں کی، پھر یہ بات کس طرح سچ ہو سکتی ہے۔

بیگم حق نے غصے سے کہا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

حق صاحب نے کہا۔ سن رہے ہو سہیل۔

بیگم حق نے کہا۔ تم بھی سن لو اور تمہارا بیٹا بھی سن لے۔ میں سہیل کی شادی شجاع سے کروں گی، وہ یہاں ہے، نرس ہے اور ابھی میرے پاس تھی۔ میں غلط کہہ رہی ہوں تو ڈاکٹر سے پوچھ لو۔

دونوں باپ بیٹوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ بولے، دونوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، چلو اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

اور پھر دونوں ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

ڈاکٹر زیدی نے مسکرا کر دونوں کا استقبال کیا۔ دونوں خاموش بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔ آپ لوگ خاموش کیوں ہیں، بیگم حق تو اب ماشاءاللہ ہوش میں ہیں اور ٹھیک ہیں۔

حق صاحب نے کہا۔ نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں، بات کچھ اور ہے۔

کیا بات ہے؟

بات کچھ الجھی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی۔

آخر کچھ پتہ بھی تو چلے۔

حق صاحب نے سہیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں سہیل، کچھ بات سمجھ میں آتی ہے۔

سہیل نے کہا۔ ابا جی میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ بھئی مجھے بھی تو پتہ چلے کہ بات کیا ہے؟

حق صاحب نے کہا۔ بیگم صاحبہ بے ہوشی میں کہہ رہی تھیں۔ شجاع یہاں ہے اور اس کی نرس ہے، وہ شجاع ہے اور وہ شجاع سے معافی مانگ رہی تھیں۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ ان کے دماغ پر چوٹ کا اثر ہے۔

حق صاحب نے کہا۔ میں خود یہی کہہ رہا تھا۔

اور سہیل میاں کے چہرے پر جو ذرا سی خوشی کی لہر آئی تھی وہ واپس چلی گئی، جو امید بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی اور سہیل میاں کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ وہ واپس گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ سوچ، وہ اداسی مسز حق کی بیماری کی نہ تھی۔ اس لئے وہ بیگم حق کی بیماری تو بالکل ہی بھول گیا تھا اور اس کے ذہن میں، سوچوں میں کوئی لڑکی تھی، تو وہ شجاع تھی۔

حق صاحب ڈاکٹر زیدی سے باتیں کرتے رہے اور سہیل خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ وہ اداس اداس اور بوجھل بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وارڈ کے آخری کونے تک پہنچ گیا اور یک لخت ایک بجلی سی اس کی آنکھوں کے سامنے کوند ی۔ ایک کرن، ایک روشنی اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔

شجاع، تم اور یہاں؟

وہ پریشان ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے گھبرا کر کہا معاف کیجئے میں شجاع نہیں ہوں۔

تو پھر تم کون ہو؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی بھی نہیں۔

سہیل نے کہا۔ خیر آپ کوئی بھی ہوں، امی جان آپ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر چکی ہیں' لہٰذا آپ کو خوش ہو جانا چاہیے۔

جی جی —— میں نے کہا نا کہ میں شعاع نہیں ہوں۔

سہیل نے کہا۔ ہر چیز کا وقت ہوتا ہے' ہم نے دلوں پر بہت جبر کیا، مگر اب حالات ایسے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں رہی ہمارے جذبے سچے تھے۔

بیگم حق ہسپتال میں داخل تھیں اور شعاع نرس کے طور پر ان کی تیمارداری کر رہی تھی شعاع
کی تیمارداری، لگن اور محنت دیکھ کر بیگم حق کے نظریات بالکل تبدیل ہو چکے تھے۔ اور وہ شعاع
کو سہیل کی بیوی بنانے کا فیصلہ کر چکی تھیں، حق صاحب جو ساری عمر بیگم صاحبہ کے دبّو رہے
تھے، اب دبّو نہ رہے تھے۔ بلکہ جو ان کے جی میں آتا کہہ دیتے تھے اور اس کہنے میں ایک
عجیب سا لطف، ایک عجیب سی لذّت بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ موقع محل دیکھ کر کچھ
کہتے، پھر بیگم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے اور پھر دل ہی دل میں بچوں کی طر
بہت خوش ہوتے۔ ادھر بیگم حق کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ حق صاحب اب پہلے جیسے
نہیں رہے تھے۔ اب وہ بلاجھجک بیگم سے بعض باتیں کہہ دیتے تھے۔ اور بیگم حق کو اس کی پھلکی
میں، باتوں میں، ہنسی میں اڑا دینے میں مزا سا آنے لگا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگم حق معترض تھیں کہ ان کی تیمارداری شجاع کر رہی ہے، لیکن جب حق صاحب اور سہیل نے ڈاکٹر زیدی سے پوچھا۔ تو ڈاکٹر زیدی نے کہہ دیا کہ بیگم حق کے دماغ پر چوٹ کا اثر ہے۔ ڈاکٹر زیدی کا جواب سن کر سہیل پر قیامتیں گزر گئیں، لیکن جب سہیل بد دلی کے عالم میں باہر نکلا، تو وارڈ کے کونے پر اسے شجاع مل گئی۔

سہیل نے اسے روک لیا، مگر شجاع نے انکار کر دیا کہ وہ شجاع نہیں ہے، لیکن سہیل اس بات کو کیسے مان لیتا، اس حقیقت کو کیسے تسلیم کر لیتا، اس کے دل و دماغ کے ہر ہر گوشے میں ایک تصویر رہتی تھی۔

شجاع کی تصویر

اس کے کانوں میں ایک آواز بستی تھی۔

اس کے کان کیسے دھوکا دے سکتے تھے، اس کی آنکھیں کیسے فریب کھا سکتی تھیں۔

اور

پھر شجاع نے اپنی نظریں جھکا رکھی تھیں۔ اس میں تاب نہ تھی کہ سہیل کی نظروں کا مقابلہ کر سکے۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے، آنکھیں تو سچی ہیں۔ آنکھیں تو سچ ہی کہتی ہیں آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں ــــــ دنیا کی تمام محبتیں، چاہتیں، نفرتیں، کدورتیں، رنج و غم، غصہ سبھی کچھ آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں چھپایا جا سکتا۔

آنکھیں کسی بھی بھید، راز پر پردہ نہیں رہنے دیتیں، سبھی کچھ اُگل دیتی ہیں، سبھی کچھ کہہ دیتی ہیں۔

سہیل نے کہا۔

شجاع، اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، امی جان آپ کو بہو بنانے کا فیصلہ کر چکی ہیں اور یہ کہ ہمارے جذبے اتنے صادق، اتنے سچے تھے کہ ہم بچھڑ بچھڑ کر بھی مل گئے۔ قدرت

نے اس کا انتظام کر دیا کہ زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے سے مل جائیں، پھر آپ کو انکار کیوں ہے؟

شجاع نے کہا۔

سہیل صاحب، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں شجاع ہوں، مگر حالات نے مجھے جہاں لا کھڑا کیا ہے، اس میں سے کوئی راستہ زندگی کی طرف نہیں جاتا۔ میں تو اب راستے کا پتھر ہوں، ایک روڑا، سٹون، جسے جس نے چاہا، جس طرف چاہا لڑھکا دیا۔

سہیل نے کہا۔

شجاع، یہ نہ کہو، یہ غلط ہے، تم راستے کا پتھر نہیں ہو، تم ایک چٹان ہو، ایک پہاڑ ہو، جسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ تم اپنی جگہ اتنی بھاری ہو کہ ہر شخص کو چل کر تم تک آنا پڑتا ہے، تمہاری نیکیوں کا بدلہ یہ ہے کہ میری امی تمہیں بہو بنانے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔

"مگر لبنیٰ" ــــــ شجاع نے کہا۔ میں کسی کے ارمان کچل کر، کسی کی خواہشوں پر کوئی محل تو محل جھونپڑا بھی نہیں بنا سکتی سہیل، میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔ لبنیٰ ایک اچھی لڑکی ہے، خاندان بھی ہے اور پھر یہ بھی اگر آپ کو میری اصلیت کا پتہ چل جائے تو آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔

سہیل نے کہا۔

تم جو کچھ بھی ہو، میری ہو، میں آنکھیں بند کر کے تمہیں قبول کرنا چاہتا ہوں۔

شجاع نے کہا۔

میں آنکھیں بند نہیں کر سکتی، میں حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی۔ میری وجہ سے جو کچھ اب تک ہوا، اس پر میں نادم ہوں، پشیمان ہوں، میں اب اپنی غلطیوں کا اعادہ نہیں کروں گی۔

اور وہ کہتی رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے اس گھر کی' اس گھر کی ایک لڑکی کی خوشیاں چھین لیں میں نے ایک لڑکی کا دل توڑ دیا۔ میں خود کو کبھی معاف نہ کروں گی۔

سہیل نے کہا۔

"نہیں مس شجاع، صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ اگر لبنیٰ سے یہ شادی ہو جاتی اور یہ شادی ناکام ہو جاتی یا ہم دونوں کی زندگیاں ہی تلخ ہو جاتیں یا اس سے بڑی کوئی صورت پیش آجاتی تو کیا ہوتا؟ کیا وہ اچھا تھا یا یہ اچھا ہے؟

سہیل صاحب، کچھ بھی ہو آپ کو شادی لبنیٰ ہی سے کرنی ہوگی۔

چاہے اس کے بعد اسے طلاق ہو جائے؟

خدا نہ کرے۔

اور ایسا ہو گیا تو —

تو میں زندہ نہ رہوں گی۔

آپ کے مر جانے سے اس کی زندگی سنور جائے گی؟

آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں زندگی کی باتیں کرتا ہوں۔

اور میں ——؟

جو کچھ تم کہہ رہی ہو اسے کوئی عقل کوئی دماغ تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک طرح کا فرار ہے۔

فرار ہی سہی، لیکن میں کسی کے ارمانوں کا خون نہیں کر سکتی۔

یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟

ہاں آخری۔

حق صاحب اور سہیل، بیگم حق کے کمرے میں کھڑے تھے۔ سہیل کے چہرے پر ایک اداسی وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

بیگم حق نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

سہیل بیٹے، میں ٹھیک ہوتے ہی شجاع کا ہاتھ مانگ لوں گی۔

حق صاحب نے کہا۔ کس سے مانگو گی اس کا رشتہ؟

بیگم حق نے کہا۔ نعمان صاحب سے۔

حق صاحب نے کہا۔ تم لوگوں نے اسے اتنا تنگ کیا ہے، وہ ان کا گھر چھوڑ کر جا چکی ہے

بیگم حق نے کہا۔ اب وہ یہاں ہے۔

حق صاحب نے کہا۔ وہ یہاں نہیں ہے۔

میں کہتی ہوں وہ یہاں ہے۔

میں کہتا ہوں وہ یہاں نہیں ہے۔

تم جھوٹ بولتے ہو

میں سچ کہتا ہوں۔

کیا میرا دماغ چل گیا ہے۔

ہاں تمہارا دماغ چل گیا ہے۔

میں پاگل ہوں؟

مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

خدا کے لئے میری مان لو کہ وہ یہاں ہے۔

ڈاکٹر زیدی سے میں پوچھ آیا ہوں وہ یہاں نہیں ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر زبیدی کیا جانتا ہے؟

سبھی کچھ تم جانتی ہو۔

ہاں، میں جانتی ہوں۔

حق صاحب نے کہا۔

بات یہ ہے بیگم، کہ میں اب تک آپ ہی کی سنتا رہا اور ہر وہ بات کرتا رہا جو آپ نے چاہی۔ میں آپ کے سامنے موم کی ناک بنا رہا۔ آپ نے جس طرف جی چاہا موڑ دیا، لیکن اب میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ ایسے گھر میں نہیں رہوں گا جہاں میری کوئی نہ سنتا ہو۔

سہیل نے کہا۔

ابا جی، میں تو آپ کی ہی سنتا ہوں۔

بیگم حق نے دل پر جبر کر کے کہا۔

اور میں نے آپ کی کونسی بات ٹالی ہے۔

حق صاحب مسکرائے اور مسکرا کر سہیل کی طرف دیکھا اور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

تم دونوں نے میری کوئی بات نہیں ٹالی؟

بیگم حق نے نظریں جھکا کر کہا۔ میں یہی سمجھتی ہوں۔

حق صاحب نے کہا۔ تو پھر سہیل کی شادی لبنیٰ سے ہوگی۔

بیگم حق نے چلا کر کہا۔ یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہوسکتا۔

حق صاحب نے کہا۔ سہیل تم نے دیکھ لیا نا؟

سہیل نے کہا۔ جی ہاں ابا جی، میں تو بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔

بیگم حق نے کہا۔ دونوں باپ بیٹے ایک ہوگئے۔

حق صاحب نے کہا۔ جی ہاں ہوگئے۔

بیگم حق نے پوچھا۔ شادی لبنیٰ سے ہوگی۔

حق صاحب نے کہا۔ جی ہاں ہوگی۔

اور شجاع؟

اوّل تو یہاں شجاع ہے ہی نہیں، بالفرض وہ مل بھی جائے تو ہم نے نعمان صاحب کو زبان جو دے رکھی ہے۔

مجھے کسی کی زبان کی پرواہ نہیں۔

ہمیں تو ہے۔

ضرور ہوگی۔

میں مر جاؤں گی، مگر لبنیٰ سے شادی نہ ہونے دوں گی۔

پہلے تم یہی بات شجاع کے لئے کہتی تھیں۔

اس وقت میری عقل کو کچھ ہوگیا تھا۔

اور اب ___؟

اب بڈھے تُو سٹھیا گیا ہے۔

حق صاحب نے کہا۔ میں نے ایک پاگل عورت کے ساتھ بیس سال کاٹ لئے، اب میں ایک لمحہ بھی اس کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔

تو مجھے چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟

اس میں کیا شک ہے۔

کہاں جاؤ گے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدھر سینگ سمائے۔

بیگم حق نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

اچھا، مجھے معاف کر دو۔ میں باقی تمام عمر تمہاری غلام رہوں گی، مگر ایک شرط ہے۔

حق صاحب نے غصے سے پوچھا۔

خیر، خیر وہ بھی بتا دو۔

سہیل کی شادی شجاع سے ہوگی۔

حق صاحب نے سہیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ چلو بیگم کی بات مان لیتے ہیں کیوں سہیل میاں؟

جو حکم آپ کا!

میمونہ بیگم بہت دنوں سے پریشان سی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ڈرامہ کیا ہے۔ غزالہ جب کبھی باہر جاتی۔ میمونہ بیگم سائے کی طرح اس کے پیچھے جاتی۔ نوٹوں کی گڈیاں اس ہوا میں لہراتیں۔ لیکن جب غزالہ بیگم واپس آجاتی تو نوٹوں کی گڈیاں ہوا میں بکھرتی نظر آتیں۔ میمونہ بیگم کان لگا لگا کر باتیں سنتیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ٹہل لگاتیں، لیکن کسی طور یہ عقدہ، شجاع کا سودا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہوس زر نے اسے بے چین و بے کل کر رکھا تھا۔ مگر اس معاملے کی کوئی گرہ اس کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

ایک دن غزالہ نے میمونہ بیگم سے کہا۔ اماں، آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں۔

میمونہ بیگم پہلے تو غزالہ کے لہجے پر حیران ہوئیں۔ غزالہ تو بہت دنوں سے چڑچڑی بیگم ہو چکی تھیں، پھر یہ لہجے میں نرمی کیسی؟

میمونہ بیگم اس معاملے پر غور کر رہی تھیں کہ غزالہ نے پھر کہا۔

اماں، آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں؟

میمونہ بیگم نے اس موقع کو غنیمت جانا۔

تمہیں کیا ضرورت آن پڑی؟

اماں گھر میں پیسے بھی ختم اور راشن بھی، بچے پریشان ہیں، افتخار کا دماغ الٹ گیا ہے، اس نے دفتر جانا بند کر دیا ہے، تو تنخواہ کا کیا سوال ہے۔

میمونہ بیگم تھوڑی دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔ پیسے تو دے دوں مگر تم واپس کہاں سے کروگی؟

واپس

غزالہ کو ایک دھچکا سا لگا لیکن ضرورت ایسی تھی کہ اس بات کو پی جانا پڑا۔ غزالہ نے موقع اور ضرورت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے کہا۔

واپس کر دوں گی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کہاں سے واپس کروگی؟

غزالہ بیگم نے چڑ کر کہا۔ میں کچھ بیچ رہی ہوں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ ہاں یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیا بیچ رہی ہو؟

غزالہ نے چڑ کر کہا۔ میں خود کو بیچ رہی ہوں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ تمہیں اس بڑھاپے میں کون خریدار مل گیا۔

غزالہ بیگم نے کہا۔ اماں، آپ نے پیسے دینے ہیں تو دیں، ورنہ

میمونہ بیگم نے کہا۔ آہستہ، آرام سے، ایسی تیزی، تندی درست نہیں، آخر روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ حساب ماں بیٹی کا، بخشش سو ٹکے کی۔

غزالہ بیگم سے بچوں کا بلکنا نہ دیکھا جا رہا تھا۔ اس نے آخر کہہ ہی دیا۔

اماں، میں نے شجاع کا سودا کر لیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ بیگم نے گردن ہلا کر کہا۔ یوں کہو نا ـــــ کتنے میں ہوا ؟

رقم ابھی طے نہیں ہوئی۔

یہ کیسا سودا ہوا کہ رقم طے نہیں ہوئی۔

ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ بات میرے دل لگی نہیں ـــــ اور اگر تمہیں دام نہ طے کرنے آتے ہوں تو مجھے لے چلو۔

نہیں اماں نہیں، میں آپ کو نہیں لے جا سکتی۔

کیوں ؟

بات ہی ایسی ہے۔

تو پھر تمہارا سودا بھی ہو چکا

ہو یا نہ ہو، میں آپ کو اس کے پاس نہیں لے جا سکتی۔

میمونہ بیگم نے کہا۔ تو صاف بات یہ ہے کہ میں رقم بھی نہیں دے سکتی۔

غزالہ بیگم اب مجبور ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔

اماں، بات یہ ہے کہ دراصل شجاع نعمان صاحب کے پاس ہے اور جب میں نے اسے وہاں سے لانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر نعمان صاحب نے کہا کہ وہ ایک بڑی رقم دینے کو تیار ہیں، بشرطیکہ تم شجاع سے دستبردار ہو جاؤ۔ میں نے یہ سوچ کر حامی بھر لی کہ ایک تو اتنی بد دماغ لڑکی سے چھٹکارا مل رہا ہے، دوسرے باپ کے پاس رہے گی تو اس کی شادی کسی متمول جگہ ہو جائے گی اور ہم شادی اور جہیز کی مصیبت سے بچ جائیں گے۔

غزالہ بیگم یہ سب کہہ رہی تھیں اور میمونہ بیگم تصور ہی تصور میں اس کوٹھی میں جا پہنچی تھیں

جہاں چوکیدار نے بتایا تھا کہ یہ نعمان صاحب کی کوٹھی ہے اور کار میں سے اترنے والی لڑکی لبنیٰ ہے۔ میمونہ بیگم کے ذہن نے فوراً ایک بات سوچی کہ جب شجاع بیچی جا سکتی ہے جب شجاع کے دام آ سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ لبنیٰ کے کیوں نہیں ؟ شجاع بھی وہاں ہے اس کی رقم مل سکتی ہے تو لبنیٰ کے بھی دام کھرے کئے جائیں۔

غزالہ ـــــ

جی اماں ـــــ

ایک بات کہوں۔

کہئے ـــــ

پیسے تو میں دے دوں، مگر ایک بات ہے۔

کیا اماں ؟

شجاع کے ساتھ ساتھ لبنیٰ کے بھی پیسے وصول کرو۔

غزالہ بیگم نے اس انداز میں سوچا ہی نہ تھا۔ یہ ترکیب اس کی سمجھ میں ہی نہ آئی تھی۔ دل ہی دل میں اس نے میمونہ بیگم کی ترکیب کی داد دی۔ دل میں امید اور خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔

اچھا اماں۔

ایک شرط اور ہے ؟

وہ کیا ؟

رقم آدھی آدھی۔

غزالہ بیگم نے ایک منٹ تک غور کیا کہ لبنیٰ کی رقم اماں کو دے دی جائے تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقصان بالکل نہ ہوا۔ لہذا غزالہ بیگم نے ہاں کر دی اور تھوڑی دیر بعد میمونہ بیگم نے پانچ سو کے نوٹ لا کر غزالہ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اور اب اس نے بھی حساب اسی طرح شروع کر دیا جس طرح افتخار حساب لگا رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ افتخار اب گلیوں میں اور بازاروں میں نکل آیا تھا اور میمونہ بیگم گھر میں بچوں کی کاپیاں چھیننے بیٹھی تھیں حساب کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا تھا۔

نعمان صاحب بہت پریشان تھے اور یہ پریشانی اب حد سے بڑھ چلی تھی پہلے وہ جھوٹ

موٹ کے بیمار تھے، اب واقعی بیمار ہوتے جا رہے تھے پہلے ذہن پریشان تھا اب اس کا سارا

بوجھ دل پر آ چلا تھا اور نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اٹھتے بیٹھتے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دل بیٹھا جا

رہا ہو۔ ایک دن تو ان کی طبیعت کچھ حد سے گزر گئی، اور انہوں نے حنا اور لبنیٰ کو بلا کر کہا۔

اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے، مجھے تم لوگوں سے بعض ضروری باتیں کرنی ہیں۔

حنا نے محسوس کر لیا کہ نعمان صاحب کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ لبنیٰ بھی پریش

تھی۔ اس کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ حنا نے ہمت کی اور بھاگ کر ڈاکٹر زیدی کو فون کیا۔

ڈاکٹر زیدی نے ہدایت کی کہ انہیں فوراً ہسپتال لے آؤ۔ نعمان صاحب نہ نہ کرتے

مگر حنا اور لبنیٰ نے انہیں گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر زیدی کے ہسپتال لے گئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر زیدی نے نعمان صاحب کا معائنہ کیا۔ حالت خطرناک نہ تھی تشویشناک ضرور تھی زیدی صاحب نے انہیں فوراً ہسپتال میں داخل کر لیا۔ حنا اور لبنیٰ کو زبردستی گھر واپس بھیج دیا۔ حنا اور لبنیٰ نے بہتیرا چاہا کہ کسی طور ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت مل جائے مگر ڈاکٹر زیدی نے کہا۔

میں ڈاکٹر بھی ہوں اور نعمان صاحب کا بھائی بھی۔ مَیں نے آج تک یہ سوچ کر ان کا علاج نہیں کیا کہ میرے پیشنٹ ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ یہ میرے بھائی ہیں ـــــ بالکل سگے بھائی آپ لوگ اطمینان سے گھر چلے جائیں، میں اپنے بھائی کے ساتھ پورا وقت رہوں گا۔

حنا اور لبنیٰ بادل ناخواستہ گھر چلی گئیں اور ڈاکٹر زیدی سوچ میں ڈوب گئے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہئے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے کہ کسی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

ڈاکٹر صاحب، آپ تو خود بیمار ہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، شماع سامنے کھڑی تھی۔

نہیں بیٹی، مَیں ٹھیک ہوں۔

نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ پریشان ہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے تھوڑی دیر رک کر کہا۔

ہاں بے بی، مجھے ایک اُلجھن آن پڑی ہے۔

کیا ایسی کہ مجھ سے بھی چھپائی جائے؟

نہیں تم سے چھپانے کی تو نہیں۔

تو بات کیا ہے ـــــ؟

دراصل بیٹی، نعمان صاحب بیمار ہیں، انہیں پھر دل کا دورہ پڑا ہے۔

شماع پریشان ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب آپ مجھے فوراً ان کے پاس بھیج دیں۔

زیدی صاحب نے کہا۔ بیٹی مجھے تم سے یہی امید تھی، اب وہ یہاں اسی ہسپتال میں داخل ہیں۔

کس کمرے میں؟

کمرہ نمبر ۲۲۔

اور شماع نے ڈاکٹر کی اجازت اور ایما کو بھی ضروری سمجھا اور بھاگتی ہوئی کمرہ نمبر ۲۲ کی طرف چلی گئی۔

کمرہ نمبر ۲۲ میں نعمان صاحب لیٹے تھے۔ ڈاکٹر زیدی نے نعمان صاحب کی نقاہت اور گھبراہٹ کے پیش نظر اور کچھ نفسیاتی اثر ڈالنے کے لئے انہیں گلوکوس کی بوتل لگا دی تھی۔ شماع پر انہیں اس حالت میں دیکھ کر ایک بجلی سی گری۔ اس نے گھبرا کر اپنا سر نعمان کی چھاتی پر رکھ دیا۔

نعمان صاحب نے کہا۔ بیٹی تم پریشان نہ ہو، مَیں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔

شماع نے کہا۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟

نعمان نے کہا۔ بیٹی! سچ بات تو یہ ہے کہ یہ سب تمہارے چلے آنے کی وجہ سے ہو

کیا آپ کو مجھ سے بہت پیار ہے؟

ہاں، میں تمہیں لبنیٰ کی طرح چاہتا ہوں۔ میری بیٹی تم وہاں سے کیوں چلی آئی؟

شماع کی آنکھیں بھر آئیں اور آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ شماع نے اُمڈے ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنسو پی جانے کی کوشش کی، مگر پھر بھی ایک دو آنسو ایسے تھے جو باہر نکلنے کے لئے اس قدر بیتاب تھے کہ پلکوں کے باہر ڈھلک ہی پڑے۔

نعمان نے کہا۔ بیٹی تم رو رہی ہو ؟

نہیں تو۔

پھر یہ آنسو کیسے ؟

مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔

بیٹی، کیا یاد آگیا تھا ؟

مجھے آپ یاد آگئے تھے، مجھے اپنی ماں یاد آگئی تھی۔ میرے سامنے میری نانی کی فیملی کا اس کا سلوک تھا اور پھر مجھے اپنا باپ یاد آگیا —— میں ان سب لوگوں کو دیکھتی ہوں اور ان سب کا موازنہ آپ سے کرتی ہوں۔ آپ میرے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہیں، میں آپ کی محبت، آپ کے خلوص اور نیکیوں کا موازنہ ان سب سے کرتی ہوں کہ میرے دل میں ان کے لئے جو نفرت ہے، غصہ ہے اس میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

نعمان نے کہا۔ میں نے تمہاری ماں کو تو دیکھا ہے، مگر باپ کو نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارا باپ ایک اچھا آدمی ہو، تمہارے دل میں ان کے لئے جو نفرت ہے، غصہ ہے وہ بلاوجہ ہو۔

شعاع نے کہا۔ ہاں، ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ انہیں اگر بیٹی سے پیار ہوتا، انہیں اگر بیٹی کا خیال ہوتا، تو انہوں نے کبھی تو پلٹ کر خبر لی ہوتی۔

نعمان نے کہا۔ ہو سکتا ہے انہیں تمہاری خبر ہو، ہو سکتا ہے وہ تمہارے پاس آئے ہوں، ہو سکتا ہے تم سے ملے ہوں اور کسی وجہ سے اظہار نہ کر سکے ہوں، بتا نہ پائے ہوں۔

شعاع نے کہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

شعاع نعمان صاحب کی تیمارداری کر رہی تھی اور بیگم حق نے شور مچا رکھا تھا کہ شعاع کہاں ہے، شعاع کہاں ہے، شعاع کو بلاؤ۔

حق صاحب نے کہا۔ بیگم، تم ٹھیک ہو کر گھر چلو، پھر ہم اسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لائیں گے۔

بیگم حق نے حق صاحب کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے شور جاری رکھا۔

شعاع میرے پاس نہ ہوگی تو میں دوائی نہیں کھاؤں گی۔ میں انجکشن نہیں لگواؤں گی، میں بستر سے کود جاؤں گی۔

حق صاحب نے جھنجلا کر کہا۔ کود جاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں، تم تو انہونی باتیں کرتی ہو، ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہو —— میں کہتا ہوں، اب تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تمہارا دماغ سچ مچ چل گیا ہے۔

سہیل نے کہا۔ امی جی، آپ فکر نہ کریں، میں اسے لاتا ہوں۔

بیگم حق نے خوش ہو کر کہا۔ ہاں بیٹے، تم لاؤ، ان کو تو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔

حق صاحب نے کہا۔ مگر سہیل —— !

سہیل نے کہا۔ ابا جی، آپ میرے ساتھ تو آئیے۔

باہر جا کر جب سہیل نے حق صاحب کو بتایا کہ امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شعاع یہیں ہے تو حق صاحب بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ دراصل انہوں نے حق صاحب سے وعدہ کیا تھا اور اب وہ وعدہ ایفا ہوتا نظر آتا تھا۔

حق صاحب نے پوچھا۔ اس وقت وہ کہاں ہے ؟

سہیل نے کہا۔ آئیے اسے تلاش کرتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں باپ بیٹے ٹہلتے ہوئے، وارڈوں اور کمروں میں جھانکتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ ایک چکّر دو چکّر، مگر اب تک کہیں شجاع نظر نہیں آئی۔ حق صاحب اب مایوس ہو چلے تھے اور انہیں اب بیگم کے ساتھ ساتھ سہیل کے دماغ میں بھی کوئی خلل نظر آنے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ سہیل بھی محبت میں اندھا ہو رہا ہے۔ اور تصوّر کی دنیا بسائے جہاں کہیں جاتا ہے، شجاع کا ہیولہ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ حق صاحب کا جی چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ سہیل سے کہہ دیئے مگر بیٹے کی دل شکنی کے خیال سے انھوں نے چُپ رہنے ہی میں مصلحت جانی۔

البتہ وہ اس معاملے میں جتنا غور کرتے، جتنا سوچتے، اتنی ہی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا گھر ہی پاگل خانہ نہ بن جائے۔ اور وہ ان پاگلوں کے درمیان عقل و دانش رکھنے کے باوجود بھی دیوانے سمجھے جانے لگیں۔

حق صاحب اسی اُلجھن میں کھڑے تھے کہ اتنے میں ایک کار پاس آ کر رکی اور کار میں سے حنا اور لبنیٰ اتریں۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔

حنا اور لبنیٰ نے حق صاحب کو آداب کیا۔

حق صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

آپ لوگ یہاں کیسے ؟

لبنیٰ نے بتایا کہ لقمان صاحب پھر بیمار پڑ گئے تھے اور اب وہ یہاں اسی ہسپتال میں داخل ہیں۔

حق صاحب کے منہ سے فوراً نکلا۔ اسے ـــ کب اور کیسے ؟

پیشتر اس کے کہ لبنیٰ یا حنا جواب دیتیں لقمان کے کمرے سے شجاع نکلی۔

حق صاحب کی نظر شجاع پر پڑی تو خوشی سے پکار اُٹھے۔

شجاع ــــ وہ ہے شجاع۔

شجاع نے بھی سب کو دیکھا اور پریشان ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی جرم
پکڑی گئی ہو۔ وہ جلدی سے مڑی اور ایک وارڈ کے اندر گھس گئی۔

حق صاحب نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

وہ مل گئی ــــ وہ مل گئی۔

سہیل اور لبنیٰ اب تک خاموش کھڑے تھے۔ انھوں نے اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے
ف دیکھا ــــ دونوں کو ایک دوسرے کی آنکھیں خالی خالی نظر آئیں۔

شجاع کو دیکھ کر حنا کے دل کو ایک ڈھارس سی بندھی۔

مگر ـــــ

لبنیٰ کے دل میں لگی ہوئی آگ اب انتقام کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے دل ہی
ں سوچا۔

اچھا، تو یہ میاں ہے ـــــ اب اس کا کچھ اور کرنا ہی پڑے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک طرف تو بیگم حق ہسپتال میں پڑی تھیں اور دوسری طرف نعمان صاحب دل کی تکلیف لئے داخل تھے۔ ان دونوں کی تیمار دار شعاع تھی۔ دونوں شعاع سے تیمار داری چاہتے تھے۔ دونوں خواہش مند تھے کہ شعاع ہر وقت ان کے پاس رہے۔ حق صاحب کا خیال تھا کہ شعاع ہسپتال میں نہیں ہے، بلکہ بیگم کی زیادتیاں، ان کا سلوک، ان کا انداز اسے مجبور کر رہا تھا کہ اسے ہر نرس میں شعاع کا پرتو نظر آتا ہے ——— ہر مہربان چہرہ اسے شعاع کا چہرہ نظر آتا ہے۔

سہیل شعاع سے مل چکا تھا۔ اسے صرف اس حد تک اطمینان تھا کہ شعاع ہسپتال میں ہے، ورنہ اس کے دل کی بے کلی اور حالات نے اسے بے چین و بے کل کر رکھا تھا۔ جب باہر آ کر سہیل نے حق صاحب کو بتایا کہ شعاع ہسپتال میں ہے، تو دونوں باپ بیٹے اس کی تلاش میں چل نکلے اور کمروں میں جھانکی لگاتے پھر رہے تھے۔

کہ ———

اسی دوران حنا اور لبنیٰ راستے میں مل گئیں۔ حق صاحب یہ جان کر پریشان ہو گئے کہ نعمان صاحب ہسپتال میں داخل ہیں۔ یہ سب اسی عالم میں کھڑے تھے کہ شعاع نظر آ گئی۔

حق صاحب شعاع کو دیکھ کر کچھ ایسے خوش ہوئے کہ یہ بھول گئے کہ ان کا ایک عزیز دوست دیرینہ اور ایسا پیارا دوست، جس سے وعدے کی خاطر، جس وعدے کے ایفا نہ ہو جانے پر ...ں نے اس قدر ہنگامہ کیا، اس قدر ڈرامہ کیا ——— اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں ایک بستر پر بیمار پڑا ہے۔

شعاع کو دیکھتے ہی حق صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار چلا اٹھے۔

وہ مل گئی ——— وہ مل گئی۔

حنا اور لبنیٰ دونوں حق صاحب کی اس حرکت پر سخت حیران تھیں کہ حق صاحب نے کہا۔

چلو سبھی مل کر اسے ڈھونڈتے ہیں۔

لبنیٰ نے کہا۔ انکل ہماری کونسی وہ رشتے دار ہے جو آپ اتنے فکر مند ہیں؟

تب وہ چونکے اور واپس اپنے آپ میں آ گئے۔ انھوں نے لبنیٰ کے اس جملے کو، اس جملے کے اندر کے زہر کو محسوس کیا، اس نفرت کو محسوس کیا، انہیں اس عداوت کی وجہ بھی معلوم تھی، لیکن وہ اس کا کیا جواب دیتے۔ وہاں کھڑے کھڑے وہ شعاع کی مظلومیت اور بے گناہی کے کیا قصے چھیڑتے۔

سہیل یہ ساری صورتِ حال بھانپ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی وضاحت کرنی چاہی۔

دراصل بات یہ ہے کہ مس شعاع امی کی تیمار داری کر رہی تھیں اور انہوں نے کچھ اس قدر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگن کے ساتھ ان کی تیمار داری کی ہے کہ وہ کسی اور کو کمرے میں آنے ہی نہیں دے رہیں شعاع کو جب سے لقمان انکل کی بیماری کا پتہ چلا ہے وہ پریشان ہو کر ان کے پاس چلی آئیں اور ہم امی کے مجبور کرنے پر ان کی تلاش میں نکلے تھے۔ دراصل امی جان کی ضد اور پریشانی کی وجہ سے وہ شعاع کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

اور وہ کہتے رہے۔

اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آیئے ہمارے ساتھ چل کر امی جان کی کیفیت دیکھ لیجئے۔ تب آپ کو صداقت کا یقین آجائے گا۔

سہیل نے کچھ بات اس انداز سے کہی تھی کہ اپنے اندر وزن رکھتی تھی۔ حق صاحب نے بھی اس دلیل کو بھاری دیکھ کر اس کی تائید میں سر ہلا دیا کہ بات ایسی ہی ہے۔

لبنیٰ کو یہ جان کر اور بھی دُکھ ہوا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شعاع ایسی لڑکی ہے جس کی معصومیت اور سادگی کا سب پر جادو چل جاتا ہے۔ خود وہ اس کی محبت اور پیار کی اسیر رہ چکی تھی۔ بہرحال یہ چاروں لقمان صاحب کے کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر زیدی وہاں موجود تھے۔

حنا نے پوچھا۔ کیسے ہیں یہ؟

لبنیٰ نے پوچھا۔ ابا اب کیسے ہیں؟

ڈاکٹر زیدی نے سب کو اشارے سے خاموش کروا دیا اور کہا۔

ابھی ابھی نیند کا انجکشن دے کر سُلایا ہے۔

حنا نے پوچھا۔ اب حالت کیسی ہے؟

لبنیٰ نے اور کوئی سوال تو نہ کیا، لیکن وہ مجسم سوال تھی اور حالت جاننے کے لئے سخت بیتاب تھی، بے چین تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

گھبرانے کی ضرورت نہیں، ویسے دماغ پر گہرا صدمہ ہے اور اس کا اثر دل پر بھی ہے۔ ابھی کا ای۔ سی۔ جی ( ) ہو جائے، میں نے ہارٹ اسپیشلسٹ کو بلوایا ہے، خون معائنے کے لئے جا چکا ہے۔ بلڈ پریشر ذرا ہائی ہو گیا تھا، اسے کم کرنے کے لئے گولیاں دی جا چکی ہیں، اب آپ انہیں سونے دیں۔ دو گھنٹے بعد ہوش آ جائے گا تو ملاقات کراؤں گا۔

لقمان صاحب کے پاس سے ہوتے ہوئے یہ چاروں بیگم حق کے کمرے میں پہنچے تو بیگم حق آواز پا پہ چونکیں۔

آ گئی میری شعاع۔

حق صاحب نے کہا۔ جی ہاں آ گئی۔

اور پھر لبنیٰ کو لے جا کر سامنے کھڑا کر دیا۔

بیگم حق نے کہا۔

اے بڈھے، پہلے تو سمجھتا تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے، اب تیرے خیال میں میری بینائی جواب دے چکی ہے۔ کچھ تو ہوش کی بات کر۔

پھر وہ حنا کی طرف مخاطب ہوئیں۔

حنا اچھی تو ہو، لقمان صاحب کیسے ہیں؟

حنا نے کہا۔ وہ تو بیمار ہیں اور اسی ہسپتال میں داخل ہیں۔

ارے، کب سے ـــــ کیا ہوا؟

اس کے بعد حنا اور بیگم حق آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ اس پورے دوران بیگم حق نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ لبنیٰ کی طرف دیکھا اور نہ ہی اس پر کوئی نگاہ ڈالی۔ جسے لبنیٰ نے بُری طرح محسوس کیا۔ حق صاحب اور سہیل کو بھی یہ بات اچھی نہ لگی، کیونکہ اور کچھ نہ سہی یہ سب کچھ رواداری اور وضعداری کے تو منافی تھا۔

لبنیٰ نے محسوس کر لیا کہ یہاں بھی شعاع کا جادو چل چکا ہے اور وہ اَب خود کو بہت ہلکی محسوس کر رہی تھی۔ تنہا تنہا۔۔۔ لیکن اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا۔ اس کے دل میں جو انتقام کی آگ لگی تھی اب اس کی چنگاریاں پھوٹ چکی تھیں اور شعلے سے بلند ہونے لگے تھے۔ اور اس نے عزم ارادہ کر لیا تھا کہ ان شعلوں میں وہ سب کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

شعاع کو۔۔۔

سہیل کو۔۔۔

اور بیگم حق کو بھی۔

اور۔۔۔

پتہ نہیں کون کون آئے گا۔

کون کون جل جائے گا۔

"زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے"

سُرخ سُرخ اونچی اور شاندار عمارتوں کی اوٹ سے موسم سرما کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں

چاند کی کونسی تاریخ تھی۔ شاید تیرہویں یا چودھویں تھی۔

سردی کی ٹھنڈی راتوں میں۔

جب ساری دنیا سوتی ہے۔

شعاع باہر لان میں نکل آئی۔ وہ خود کو ایک کٹے ہوئے پتنگ کی طرح محسوس کر رہی تھ

جس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔

چلتے چلتے اس نے منڈیر پار کی، ایری کی باڑ سے آگے نکل گئی۔ سُرخ گلاب کے پودے کے پا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑی ایک اُدھ کھلے گلاب کے پھول کو دیکھتی رہی، وہاں سے نظر ہٹی تو یوکلپٹس کے پیڑ پہ جا پڑی وہاں سے نظر ہٹائی تو کیلے کے درختوں پہ چلی گئی۔ کیلے کے درختوں پہ گچھے لگے تھے، ہرے ہرے، اور کچھ اتنے پک گئے تھے کہ چاند کی کرنوں کی طرح سنہری ہو چلے تھے۔

خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور ہوا بھی اپنے ساتھ سخت سردی کی لہر لا رہی تھی، مگر شعاع کا دل۔

اس کا دل تو بجھ چکا تھا، جل چکا تھا۔

جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

ایک بار اُمید کی کوئی چنگاری نظر آتی۔

اور دوسرے لمحے وہ چنگاری بجھ جاتی۔

ہر طرف مایوسیوں کا ڈیرا تھا۔

وہ عالمِ بے خیالی میں چلتی ہوئی لان کے درمیان میں بنے ہوئے تالاب تک جا پہنچی۔ اس کا جی چاہا وہ منڈیر پہ بیٹھ جائے، لیکن اس کی نظریں تالاب کے پانی کے اندر گئیں، چاند کپکپا رہا تھا ہچکولے سے کھا رہا تھا۔ بالکل شعاع کی طرح، شعاع کی مانند۔

آج سے پہلے جب کبھی چاند سے اس کی آنکھ ملی، جی کا اُجالا جاگا تو اس کا کملایا ہوا دل بھی خوشی سے پھوٹ پڑتا، لیکن آج پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اسے چاند سے، اس کی چاندنی سے، اس کی شعاعوں سے ایک خوف سا آنے لگا تھا۔

وہ اسی عالم، اسی کیفیت میں، تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی اور فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہاں رُکے یا واپس اندر چلی جائے کہ

ایک سایہ اس کی طرف بڑھا۔

شعاع ——

سہیل —— تم اور یہاں ؟

تم اُداس ہو ؟

تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

تم خود کو دھوکا دے رہی ہو، بیکار کی کوشش کر رہی ہو، جذبات کی طوفانی ندی کے ریلے تم نہیں روک سکتیں۔

آپ یہاں سے چلے جائیے۔

تمہیں میری باتیں سننی ہوں گی۔

سہیل صاحب! میں آپ سے ایک بات پوچھتی ہوں، کیا آپ مجھے یہاں بھی نہ رہنے دیں گے ؟

سہیل نے کہا۔

شعاع! ایسا موسم، ایسا چاند اور ہم دونوں کے دلوں میں محبت کی شمع روشن، اور تم ایسی بے مزہ اور ناخوشگوار باتیں کر رہی ہو۔

شعاع نے کہا۔

سہیل! مجھے تم سے نفرت ہو چلی ہے، تم خود غرضی پہ آمادہ ہو۔ آپ کو اگر مجھ سے پیار ہے، آپ کے دل میں اگر میری محبت کی شمع روشن ہے تو جائیے اور لبنیٰ سے شادی کر لیجئے۔

سہیل نے کہا۔ یہ تم کہہ رہی ہو ؟

شعاع نے کہا۔ ہاں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی جذبات ہیں، کوئی شمع ہے، تو اپنے دل کو دفن کر لو، اُسے سُلا دو، اور لبنیٰ کے ہو جاؤ۔

اور محبت کی شمع کو کیا کروں ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی چاہے اسے روشن رکھو، جی چاہے اُسے بجھا دو۔

سہیل نے کہا۔

شمائلہ، میرے دل میں محبت کی جو شمع روشن ہے اُسے کوئی نہیں بجھا سکتا۔ لیکن مجھ سے تمہاری اداس آنکھیں، اداس چہرہ نہیں دیکھا جاتا، کیا تم چاہتی ہو، مَیں اپنے دل کی طرح آنکھیں بھی موند لوں اور تمہارے سُرخ و سپید چہرے، بھیگے ہونٹوں اور چمکتی دمکتی ہوئی آنکھوں کو اداس دیکھوں، چہرے کی پریشانیوں اور اداسیوں کو نظر انداز کر دوں۔

اور وہ بولتا ہی چلا گیا۔

سردی کی ٹھنڈی اور خنک راتوں میں کس کا جی چاہتا ہے کہ یوں باہر سردی میں نکل آئے، تاوقتیکہ اس کے اندر محبت کا الاؤ نہ جل رہا ہو۔

شمائلہ نے کہا۔

تو آج آپ اپنی محبت کی باقی داستان کہنے آئے ہیں۔ سہیل صاحب میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو میری شکل پسند آگئی ہے، آپ شاید میری شکل و صورت پہ ریجھ گئے ہیں۔ یہ چہرہ، یہ خوبصورتی، یہ رنگ و روپ تو دیرپا چیزیں نہیں ہیں، یہ تو بہت عارضی ہیں، اور اگر انسان صرف چہرے دیکھ کر، رنگ و روپ دیکھ کر یوں کسی کے پیچھے پڑ جائے تو پھر ہمارے ہاں کی قبول صورت لڑکیوں کا کیا بنے گا۔ بدصورت لڑکیاں کہاں جائیں گی؟

لان پر خاموش چاندنی اپنی شعاعیں بکھیر رہی تھی، ہر طرف خاموشی کا راج تھا ——— البتہ دُور کے کسی مکان میں ریکارڈ بج رہا تھا۔

آؤ اب لوٹ چلیں۔

خود کو بے رحم مقدر کے حوالے کر دیں۔
اتنی دور آکے بھی دنیا کا وہی منظر ہے۔
وہ غم دیدہ ستارے، وہی سہمی کلیاں
وہی دھرتی کا سلگتا ہوا سینہ وہی آگ
آسماں ہے کہ کوئی دامنِ نم دیدہ ہے۔
رات کی آنکھ سے ڈھلتا ہوا آنسو ہے کہ چاند
چاندنی ہے کہ فضاؤں نے کفن پہنا ہے۔
کس کے ماتم میں ہوا نوحہ کناں پھرتی ہے
آج ایسا نظر آتا ہے کہ کھو جائیں گے۔
موت کی دھند میں ہر اک چیز سحر ہونے تک
ٹمٹمانے لگی ہستی کے چراغوں کی لَو میں
آؤ اب لوٹ چلیں

شمائلہ نے کہا

جب میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے، پیار ہے تو اس کا اعتراف اس طرح کیجئے کہ لبنیٰ سے شادی کر لیجئے۔

سہیل نے کہا۔

تم نے میری زندگی میں آگ لگا دی ہے اور مَیں اب زندگی کی طرف نہیں موت کی طرف جا رہا ہوں۔ مَیں اس آگ میں جل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ تم مجھے چاہو یا نہ چاہو، پیار کرو یا نہ کرو، اور نہ ہی مجھے اب شادی کی تمنّا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاع نے کہا۔

تم شاید زیادہ ہی جذباتی ہو چلے ہو۔ اگر تم اعتراف ہی چاہتے ہو تو سن لو، میں اس کا اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے، لیکن میں اپنی خواہشوں کا اظہار نہیں کر سکتی اور نہ کرنا چاہتی ہوں

اور پھر ——

اپنے لئے تو سبھی زندہ رہتے ہیں۔ دوسروں کے لئے
زندہ رہنے کا اصل نام زندگی ہے۔

اور وہ کہتی رہی۔

میری آنکھوں میں دیکھو۔

اس چاند کو دیکھو۔

میری آنکھیں —— اس چاند کو دیکھنے کے لئے باہر نہیں آئیں۔

میں اس چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے یہاں نہیں آئی ہوں۔ میں اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے، اپنی محبت کو دبانے، اپنے دل کو سلانے کے لئے یہاں آئی ہوں۔

سہیل نے کہا۔

آخر تم چاہتی کیا ہو؟

بسنتی سے شادی۔

اور اگر میں یہ نہ کر سکوں۔

تو میں سمجھوں گی تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی۔

اور اگر شادی کر لوں اور نباہ نہ سکوں۔

تو بھی میں سمجھوں گی، محبت میں کہیں کمی رہ گئی تھی۔

تو یہ میرا امتحان ہے؟

محبت کا امتحان۔

فیل بھی تو ہو سکتا ہوں، رعایتی نمبروں پر پاس بھی۔

کیوں فرسٹ ڈویژن کیوں نہیں —— پوزیشن کیوں نہیں؟

اچھا، مس شعاع! اب آپ اندر چلی جائیں، میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی، میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گی، یہ سر تسلیم خم ہے۔

بیگم حق تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھیں۔ اس دوران شعاع نے ان کی تیمارداری میں، دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے جب بلایا، جس وقت چاہا شعاع کو حاضر پایا۔

ایک شام حق صاحب اور سہیل بیگم حق کو دیکھنے آئے۔ شعاع وہاں موجود نہیں تھی۔

سہیل نے کہا۔ امی جی خدا کا شکر ہے اب آپ ٹھیک ہیں۔

ہاں بیٹے، اللہ نے شفا دی ہے۔

حق صاحب نے کہا۔

اور شعاع کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولنا۔

بیگم حق کے چہرے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

وہ نرس! ارے میں تو بتانا ہی بھول گئی کہ وہ یہاں ہے۔

حق صاحب نے کہا۔

اور اس نے تمہاری بہت خدمت کی ہے۔

بیگم حق نے کہا۔ خیر خیر —— نرسوں کا اور کام کیا ہوتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حق صاحب نے کہا۔ بیگم کچھ ہوش میں تو ہو۔

تو کیا میں بے ہوش ہوں۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم بے ہوش ہی رہتیں۔

ہاں، آپ تو میری جان کے دشمن ہیں۔

دشمن تو نہیں ہوں، ہاں ایک بات ضرور ہے۔

وہ بھی کہہ ڈالو۔

میرے خیال میں تمہارا بے ہوش رہنا ہی ٹھیک تھا۔

کیوں —— ؟

کم از کم بے ہوشی میں تم ہوشمندی کی باتیں تو کرتی تھیں۔

بیگم حق نے سہیل سے پوچھا۔

سہیل، یہ تمہارے ابا کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

مگر ——

سہیل، وہ وہاں کہاں تھا، وہ دنیا سے، مافیہا سے دور خیالوں کی دنیا میں گم ایک شکست خوردہ انسان کی طرح، ایک ہارے ہوئے جواری کی مانند، ایک ایسے شخص کی طرح تھا جو اپنے ہاتھوں سب کچھ لٹا آیا ہو۔

ایک طرف محبت تھی۔

دوسری طرف وعدہ تھا۔

ایک طرف دل تھا۔

دوسری طرف دل کا دیا ہوا وعدہ۔

ایک طرف شعاع تھی۔

دوسری طرف لبنیٰ

کبھی دل خیالات پر چھا جاتا۔

اور کبھی خیالات دل پر چھا جاتے۔

کبھی وعدے متزلزل نظر آتے۔

لیکن وہ خود پر قابو پا لیتا۔

بیگم حق نے پھر کہا۔

سہیل، میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے ابا کیا کہہ رہے ہیں؟

زاں پیشتر کہ سہیل جواب دیتا۔ حق صاحب نے چڑ کر کہا۔

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں، کل تک تو شعاع تمہاری دلاری تھی اور تم اسے ہر قیمت پر بہو بنانے پر تلی ہوئی تھیں، آج یہ انقلاب کیسا؟ آج اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟

بیگم حق نے بہت حیران ہو کر کہا۔

میں اس نرس کو بہو بنانا چاہتی تھی؟

ہاں، اس نرس کو

ایسا نہیں ہو سکتا۔

ایسا ہوا ہے، اور یہاں تک ہوا ہے کہ تمہیں ایک لمحہ اس کے بغیر چین نہ تھا۔ تم کسی قیمت پر اسے اپنے پاس سے نہ جانے دیتی تھیں اور یونہی ذرا تمہاری صحت ٹھیک ہوئی، دماغ کی چوٹ کم ہوئی، اب وہی لڑکی تمہیں نرس اور صرف نرس نظر آنے لگی۔

اور وہ کہتے رہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیس سال کی زندگی میں میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا تھا کہ اب تم ٹھیک ہو چلی ہو، اب تمہیں عقل آ چلی ہے۔ تم اپنی غلطیوں پر، زیادتیوں پر نادم ہو، شرمندہ ہو ——— اور ان کا ازالہ کرنا چاہتی ہو مگر تیس سال کے بعد بھی تم ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلیں۔

بیگم حق نے کہا۔ ارے ہے تو میں اس نرس سے بیاہ دوں اپنے لال کو۔

حق صاحب نے کہا۔ نہیں، اس کے لئے تم کوہ قاف جاؤ، وہاں سے پری لے آؤ۔

بیگم حق نے کہا۔ ہماری لبنیٰ کیا پری سے کم ہے۔

حق صاحب چیخ پڑے۔

بند کرو یہ بکواس۔ میں نے جو عمر تمہارے ساتھ گزاری، اس پر نادم ہوں، شرمندہ ہوں اور آج ہی سہیل کی شادی شعاع سے کر کے رہوں گا۔ اب مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ پھر سہیل کی طرف متوجہ ہوئے۔

چلو بیٹے، میں اس پاگل عورت کے پاس ایک منٹ نہیں گزار سکتا۔

سہیل خاموشی سے کھڑا رہا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے باہر کھلتی ہوئی کھڑکی کے اس پار تکے جا رہا تھا۔

حق صاحب جھنجلا گئے۔

چلو سہیل۔

سہیل نے بہت کھوئے کھوئے اور اداس لہجے میں کہا۔

آباجی، امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

حق صاحب چیخ پڑے۔

پاگل، کمینے ——— تو بھی اپنی ماں پر گیا ہے، یہ اسی خون کی خرابی ہے، یہ خاندان ہی اچھا

تھا۔ اُف، میں تیس سال تک دھوکا کھاتا رہا۔ تیس سال تک اس ماں بیٹے کے چکر میں پڑا رہا ان پاگلوں میں زندگی گزارتا رہا ——— میں جا رہا ہوں یہاں سے، اسی وقت، اسی لئے مجھے اب تم دونوں سے نفرت ہے۔

یہ کہہ کر حق صاحب باہر نکل گئے۔

سہیل نے ایک بار انہیں پکارا۔ آباجی۔

حق صاحب چلتے ہی رہے، چلتے ہی رہے۔

سہیل نے پھر پکارا۔ آباجی۔

مگر حق صاحب تو کوئی آواز سننے کو تیار نہ تھے۔ کوئی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی، کسی آواز کی طرف ان کا دھیان نہ گیا۔ وہ تو بالکل ایسے ہی چلتے چلے جا رہے تھے جیسے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال لیا ہو۔

بیگم حق شاید زندگی میں پہلی بار پریشان ہوئیں۔

یہ کیا ہوا؟ اب کیا ہوگا؟ تمہارے آبا کہاں چلے گئے؟

اب بھلا سہیل کے پاس اس کا کیا جواب تھا، وہ کیا جواب دیتا۔

بیگم حق نے کہا۔

سہیل تمہیں انہیں روک لینا چاہئے تھا، کہیں وہ کچھ کر نہ گزریں۔

میمونہ بیگم کو جب سے اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ شعاع اور لبنیٰ کے بدلے ایک بی
ملنے والی ہے تو جہاں بروقت انکا دماغ حساب کتاب میں کھویا رہتا، وہاں ایک انقلاب
اور وہ انقلاب تھا غزالہ کے ساتھ اُن کا رویّہ۔ اب ایک تو وہ بروقت سائے کی طرح غزالہ کے

رہتی تھیں، دوسرے گفتگو میں نرمی بھی تھی اور کچھ پیار کا انداز بھی۔

غزالہ! تمہاری صحت گرتی جا رہی ہے۔

غزالہ! تمہیں اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں۔

غزالہ! تم اپنی صحت کی طرف سے لاپرواہ ہو۔

غزالہ نے کہا۔

امی! حالات آپ کے سامنے ہیں، کس طرح گھر کا گزارہ چل رہا ہے آپ تو جانتی ہیں۔

میمونہ بیگم نے کہا۔

یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ کچھ کرو۔

کیا کروں؟

یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو جاؤ اور نعمان سے رقم لے کر آؤ۔

ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔

حالات؟ میمونہ بیگم کی سمجھ میں غزالہ کا جواب نہ آیا۔ حالات سے کیا مطلب! اپنا مال، اپنی چیز ہے اور خریدار سے خریدنا چاہتا ہے۔ اسے اس کی ضرورت ہے، ہمیں رقم کی۔

مگر امی

اگر مگر کچھ نہیں ——— یا تو تم جاؤ ——— ورنہ پھر میں جاتی ہوں۔

بیگم حق نے تندرست ہوتے ہی اپنی کیچلی بدل لی تھی۔ اس سے پہلے وہ شجاع کے بغیر ایک پل زندہ نہ تھیں۔ اب ان کے نزدیک شجاع کی حیثیت ایک معمولی نرس سے زیادہ نہ تھا۔ حق صاحب اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور وہ ہسپتال سے چلے گئے کہ اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔ بیگم حق پریشان ہو گئی تھیں۔ میں نے بھی انہیں آوازیں دیں مگر انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

میمونہ بیگم کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی۔ اب اسے اٹھتے بیٹھتے غزالہ کی صحت کا خیال آنے لگا تھا مگر اس سب کے پیچھے بھی ایک غرض تھی کہ کسی طور شجاع اور بنٹی کے دام نعمان سے کھرے ہو جائیں، غزالہ بھی یہی چاہتی تھی، مگر وہ جانتی تھی کہ ہاتھ پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔

میمونہ نے دھمکی دی کہ اگر وہ نہیں جاتی تو میں چلی جاتی ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ادھر لبنیٰ کے دل میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ اس کی چنگاریاں اب پھوٹ چکی تھیں اور شعلے بلند ہونے لگے۔ وہ ان شعلوں میں شجاع سمیت سب کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی۔

شجاع ایک سرد رات میں لان میں نکل آئی تھی۔ سرما کی رات تھی اور چاندنی اپنے جوبن پر تھی۔

لیکن شجاع کا دل اداس تھا۔ وہ اسی اداسی کے عالم میں لان میں ٹہل رہی تھی کہ سہیل آ گیا، سہیل نے اسے بہتیرا اپنی محبت کا یقین دلایا مگر اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو لبنیٰ سے شادی کر لو، سہیل نے شجاع سے وعدہ کر لیا لیکن

اگلی ہی رات، جو شاید چاند کی چودھویں رات تھی یا پندرھویں، سہیل اسی لان میں نہایت بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اسے اپنے دھڑے متزلزل ہوتے نظر آ رہے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ شجاع کتنی سنگدل ہے کہ ایک غلط فیصلے پر اتنی سختی سے پابند ہے اور مجھے بھی پابند کر رہی ہے، کاش میں اس سے پوچھ سکتا کہ مجھے بھی وہ نسخہ بتا دے کہ اپنے پیاروں کو کس طرح بھلایا جاتا ہے۔ پیار کے جذبے کو کس طرح دبایا جاتا ہے، ذہن کو کس طرح قابو میں رکھا جاتا ہے۔

بے شمار باتیں تھیں جو اس نے کہنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔

خیالات کا ایک سمندر جو سہیل کو بے چین و بے کل کئے ہوئے تھا۔

اور ——

آج وہ اپنے آپ کو قافلے کا وہ مسافر سمجھ رہا تھا جس کا راستے میں سب کچھ لوٹ لیا گیا ہو۔

ہاں وہ اپنے آپ کو لٹا ہوا مسافر ہی تو سمجھ رہا تھا جس کی دنیا ویران ہو چکی تھی، امنگوں بھرا دل بجھ چکا تھا، راکھ ہو چکا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ

اس سے بھول ہو گئی۔

کہ اس نے شجاع کو کیوں چاہا۔ اچھے دنوں کے سپنے کیوں دیکھے۔

جب کہ ——

شجاع نے صرف ایک بار محبت کا اعتراف کیا۔

اور ——

وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ اس سے کچھ منوانا چاہتی تھی۔

وہ اس سے منوانا چاہتی تھی کہ وہ لبنیٰ سے شادی کرے۔

ہر طرف مایوسیوں کے ڈیرے تھے۔

لیکن سہیل کا دل اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر شجاع کے پاس جائے۔

ایک سعی اور ——

ایک آخری کوشش۔

اور اسے کہہ دے کہ وہ اپنے فیصلے پر ایک بار پھر نظر ثانی کرے۔

اس کا فیصلہ ——

ذہن کا فیصلہ نہیں۔

دل کا فیصلہ نہیں۔

جذبات کا فیصلہ ہے۔

اور جذبات میں کئے گئے فیصلوں پر بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔

جذبات کے فیصلے ہمیشہ غلط ہوتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیل حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا۔

لیکن ———

دل و دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

وہ اسے بھلا دینا چاہتا تھا لیکن ذہن تھا کہ ان کی شبیہیں بناتا چلا جاتا ہے۔

میں اسے دل سے نکال دینا چاہتا ہوں۔

مگر دل ہے کہ کسی اور کو یاد ہی نہیں رکھتا۔

حالات نے عجیب مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے۔

میں سوچتا کیا ہوں اور ہو کیا جاتا ہے۔

کل جب وہ مجھے یہاں ملی تو میں کتنے حوصلے، کتنے ولولے، کتنی آرزوؤں، تمناؤں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

اور ———

کتنی مایوسیاں، اداسیاں لئے ہوئے لوٹا۔

بوجھل بوجھل

جیسے کوئی خود اپنا جنازہ لئے جا رہا ہو۔

کل کی رات کتنی بھاری تھی کتنی بے چینی میں کٹی۔ پوری رات جاگتا رہا۔ کسی پل چین نہ تھا۔

تم میرے من میں پیت کی جوت لگانے کیوں چلی آئیں؟

میرے ذہن اور سوچوں پر تمہارا ہی غلبہ ہے

پیت تو نبھانے کے لئے کی جاتی ہے۔

اور اگلی صبح وہ سو کر جب اٹھا تو سب نے سوجی سوجی بوجھل بوجھل آنکھوں کا سبب پوچھا۔

کچھ لوگوں نے کیفیت درد پوچھی۔

ہم لوگوں نے برجستہ فسانے ہی سنائے۔

پر تم سے تو پوشیدہ نہیں اپنی حکایت۔

اس رشتہ دوری سے نکل آؤ تو اچھا ہے۔

پچھلی رات بے خوابی کا شکار رہا اور سوچتا رہا کہ خدا جانے میں کیا ہوں جو زمانے کے جور و ستم کا نشانہ اس انداز سے بنا ہوں۔

خدا جانے انسان ہوں یا پتھر

ریت ہوں یا گوشت پوست کا کوئی لوتھڑا

یا کوئی بت

نہیں نہیں

شاید میں وہ بچہ ہوں جو زندگی کے پلیٹ فارم پر اکیلا کھڑا ہے، یاس اور ناامیدی کو سینے سے لگائے۔ میں وہ بچہ ہوں جس کی سب گاڑیاں چھوٹ چکی ہیں، پلیٹ فارم کی تمام بتیاں بجھ چکی ہیں خوانچے والے اور قلی بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں اور میں تن تنہا اکیلا کھڑا ہوں۔

کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو
اب آگے ممکن ہے تم پر کوئی بات آئے
جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں فسانے کو

ہاں ہاں، یہ تمہارا حکم ہی تھا کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور میں نے سوچا بھی یہی تھا۔

میں نے عہد کیا تھا کہ

اب نہ ان کوچوں میں گھوموں گا پریشاں۔

لیکن میری سوچیں۔

میرے ارادوں۔

اور عہد پہ

دل کی ایک لہر آئی۔

اور جتنے نشان میں نے لگائے تھے۔

جو ارادے میں نے باندھے تھے۔

میں نے عہد کئے تھے۔

ان سب کو بہا کرلے گئی۔

اور

میں اس دل کے ہاتھوں کتنا خوار ہوا۔

حالانکہ میں نے اس دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر یہ کسی طور سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔

چاندنی رات دن کا اجالا بخش رہی تھی لیکن سہیل کا دل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لان کے درمیان میں بنے ہوئے تالاب کے کنارے بیٹھ گیا کہ اس نے پیچھے سے پاؤں کی چاپ سنی۔

سہیل نے پلٹ کر دیکھا۔

شعاع تم!

ہاں میں

کیوں آئی ہو؟

بس ایسے ہی آ گئی۔

سہیل نے کہا:

شاید تم یہ دیکھنے آئی ہو کہ جسے تم نے چاہ کر چھوڑ دیا، جسے تم نے دیوانہ بنا دیا ہے، اس پر کیا گزر رہی ہے، شاید یہی تمہاری خوشی تھی، شاید اسی میں تمہاری تسکین ہوگی۔

شعاع نے کہا:

سہیل صاحب! مجھے دکھ بھی ہے اور افسوس بھی کہ آپ مجھے غلط سمجھے، حالانکہ میں نے اس دن اعتراف کیا تھا کہ ہاں مجھے آپ سے محبت ہے اور آج میں پھر اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ہمیشہ آپ کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ چاہا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرے دل میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں۔ مگر میں آپ کو، آپ کی حیثیت کو جانتی ہوں اور خود کو بھی نہیں بھولی۔ انسان کو

اپنی حیثیت نہیں بھولنا چاہئے۔

سہیل نے کہا۔

یہ سب بیکار باتیں ہیں، اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے لوگ جو سایوں کے پیچھے بھاگتے ہیں ان کا

وہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہے۔

شعاع نے کہا:

سہیل! ایسی باتیں نہ کرو، آؤ میرے ساتھ آؤ۔

دونوں چلتے ہوئے وارڈ میں چلے گئے۔ وارڈ کے ساتھ ہی مریضوں کے لئے باورچی خانہ تھا

شعاع نے سہیل کو ایک سٹول نما چیز پر بٹھایا اور خود چولہا جلا کر کافی کا ایک کپ تیار کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرم گرم کافی کا کپ سہیل کے ہاتھوں میں تھا اور اس کے قریب ہی شجاع اپنا کپ لئے کھڑی تھی

شجاع نے کہا:

چینی کم ہو تو اور پیش کروں؟

سہیل نے کہا:

چینی تو ٹھیک ہے مگر یہ تم ہر دوسرے لمحے حیثیت کا ذکر کیا لے بیٹھتی ہو؟

شجاع نے کہا:

انسان کو خود کو بھولنا تو نہیں چاہئے۔

سہیل نے کہا:

تم کچھ بھی ہو، کیسی بھی ہو میری ہو۔

شجاع نے کہا:

وہ تو ہمارے اور آپ کے درمیان طے پا ہی چکا ہے کہ آپ کی شادی لبنیٰ سے ہوگی اس مسئلے کو دوبارہ نہ اٹھایئے۔ لیکن اپنے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ میں جب بہت چھوٹی سی تھی تو میری ماں کو طلاق ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ طلاق لی گئی یا دی گئی۔ ویسے حالات تو بھی بتاتے ہیں کہ طلاق خود میری ماں نے لی۔ میں نے آج تک اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی، اور اس نے بھی پلٹ کر نہ دیکھا کہ اس کی بیٹی کس حال میں ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس شخص پر بے پناہ غصہ آتا ہے۔ لیکن جب مجھے اپنی ماں اور نانی کا خیال آتا ہے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شخص بے پناہ مظلوم ہوگا۔ میری ماں اور نانی نے اس پر بے پناہ ظلم توڑے ہوں گے۔ اس کے بعد میری ماں نے دوسری شادی کر لی، ایک ایسے شخص سے جسے نہ بیٹھنے کی تمیز تھی، نہ کھانے کی، نہ بات کرنے کی۔ میں نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں جس طرح پرورش پائی، اس ماحول میں جس طرح گزارہ کیا،

جس طرح میری ذہنی نشوونما ہوئی جتنی تکلیفیں، اذیتیں میں نے زندگی میں اٹھائی ہیں، ان کے پیش نظر ایک تو میرے خیال میں میں صحیح الدماغ نہیں رہی۔ دوسرے ایسے بچے جو ماں باپ سے دور رہے ہوں ان کی عام ذہنی سطح درست نہیں ہوتی۔

اور وہ کہتی رہی:

اب تو میرے دل میں صرف ایک خواہش، ایک تمنا باقی ہے کہ کسی طرح مجھے میرا باپ مل جائے تو میں یا تو اس کے گلے لگ کر رو لوں، اور اپنے سارے دکھ درد بھول جاؤں یا پھر اس سے پوچھوں کہ میرا کیا قصور تھا جس کی اس قدر سزا دی گئی۔

اس نے کافی کا کپ رکھ دیا اور ایک لمحے کو رک کر کہنے لگی:

میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی باقی زندگی اسی ہسپتال میں انسانی خدمت کرنے میں گزار دوں گی۔ ویسے بھی ڈاکٹر زیدی بہت اچھے ہیں ان کا سلوک میرے ساتھ باپ کا سا ہے، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں، کوئی دکھ نہیں۔

سہیل یہ سب کچھ اطمینان سے سنتا رہا۔ جب شجاع یہ سب کہہ کر دل کا غبار اتار چکی تو

سہیل نے کہا:

تمہیں جو کچھ کہنا تھا، وہ تم کہہ چکی، حالات کا مجھے پورے طور نہ سہی بہت حد تک اندازہ تھا جو کہانی تم نے سنائی ہے اس کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ لڑکیاں تو پیدا ہی اس لئے ہوتی ہیں کہ پستی رہیں، ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہیں۔ ماں باپ کے ہاں سکون مل گیا تو شوہر صاحب کچھ عجیب سے ملے، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ لڑکیوں کو ساری عمر نظر انداز کئے رہتے ہیں ایک طرح کا بوجھ سمجھتے ہیں اور اکثر والدین اس بوجھ کو کسی بھی حالت میں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے، بھیڑ بکری کی طرح کسی کے ساتھ بھی ہنکانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ عمر بھر کے سود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس طرح کر دیتے ہیں، عمر بھر کے لئے لڑکیوں کو اس طرح گلے سے اتار پھینکتے ہیں جیسے وہ لڑکیاں نہ ہوں پرانے کپڑے، پرانے جوتے ہوں۔ اور پھر شوہر صاحب بھی یہی سمجھ کر لاتے ہیں کہ انہیں ایک باورچن، ایک خادمہ، ایک باندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سہیل نے کافی کا کپ خالی کر کے شجاع کے ہاتھ میں دے کر کہا:

مجھے لبنیٰ سے شادی کے لئے انکار نہیں، میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گا، لیکن ہم دونوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں، ذہنی ہم آہنگی نہیں، وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے اور میں نے ابھی اپنی زندگی کا ٹھیک سے آغاز نہیں کیا۔ میں پدرم سلطان بود کا قائل نہیں ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں سے محنت کرنا چاہتا ہوں، میں ملازمت کر کے بیوی کو کھلاؤں گا۔ میں اسے اپنے ماں باپ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں لبنیٰ کے اخراجات میں پورے نہ کر سکوں گا۔

شجاع نے کہا:

لقمان صاحب کی ایک ہی بیٹی ہے، ایک تو بے شمار جہیز ملے گا اور کیا عجب وہ اپنی مل میں کسی عہدے پر رکھ لیں۔

سہیل نے کہا:

لیکن سہیل کوئی بکاؤ مال نہیں، دوسرے جو شخص اپنے والدین کا احسان گوارہ نہ کرتا ہو، وہ بیوی کے والد کا احسان کہاں گوارہ کرے گا۔

اور سہیل کہتا رہا۔

میں روکھی سوکھی کھانا چاہتا ہوں۔ مگر اپنی کمائی کی، اور اگر چپڑی کھاؤں گا تو کما کر کھاؤں گا، میں خودداری کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

شجاع نے کہا:

مجھے آپ کے خیالات، احساسات کی قدر ہے اور میری خواہش ہے کہ ہمارے ملک کا ہر نوجوان اسی انداز میں سوچے اور۔۔۔

سہیل نے بات کاٹی۔

مس شجاع قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں، تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ تم یہاں بالکل مطمئن ہو اور تمہیں کوئی دکھ نہیں، کوئی تکلیف نہیں۔

شجاع نے کہا:

ہاں، میں یہاں خوش ہوں اور مطمئن بھی، مجھے یہاں کوئی دکھ تکلیف نہیں۔

سہیل نے پوچھا:

پھر تم ان سرد سرد راتوں میں، باہر لان میں کیوں گھومتی ہو؟

شجاع ایک لمحے کو پریشان ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کی چوری پکڑ لی گئی ہو مگر اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا۔

سہیل صاحب، مجھے چاندنی اچھی لگتی ہے اور صرف چاندنی کا لطف اٹھانے لان میں چلی جاتی ہوں۔

سہیل نے کہا:

تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتی ہو کہ دل کی بے چینی، بے کلی کھینچ کر تمہیں لان میں لے جاتی ہے۔

تم کب تک خود کو، مجھے دھوکا دیتی رہو گی۔

کب تک دھوکے دو گی مجھ کو؟

کب تک دھوکے کھاؤ گی ؟

شجاع نے بات کا رخ پلٹا۔

آپ کافی اور پئیں گے ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا میری بات کا یہی جواب ہے ؟

کچھ باتوں کا جواب نہ دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ میری باتیں جواب کے قابل نہیں ہیں یا ان کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہے

آپ جو بھی سمجھ لیں۔

کیا آپ کو میری محبت پر اعتبار نہیں ؟

کیوں نہیں۔

پھر آخر اصل بات کا بھی تو پتہ چلے ؟

شعاع نے کہا:

میں دوسروں کے دیئے بجھا کر اپنے روشن نہیں کر سکتی۔ میں کسی کی آرزوؤں، تمناؤں کو کچل کر اپنے سکھ نہیں خرید سکتی۔ میں تو شروع سے دکھوں کی عادی ہوں اور ویسے بھی میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ ساری عمر ڈاکٹر زیدی کے ساتھ انسانیت کی خدمت میں گزار دوں گی۔

غلط، بالکل غلط، میں نہیں مانتا۔

شعاع اور سہیل نے چونک کر باہر دیکھا تو ڈاکٹر زیدی دروازے پر کھڑے تھے۔

شعاع نے کہا:

آپ ؟

ہاں میں — میں ذرا نعمان صاحب کو دیکھنے آیا تھا کہ باورچی خانے کی بتی جلتی دیکھ کر یہاں آنکلا۔ میری اچھی شعاع۔ میری بیٹی۔ تمہیں اپنے سوچنے کا انداز بدلنے کی ضرورت ہے۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ماں باپ کے پاس تو ان کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہوتی ہے۔ ماں باپ کے پاس تو ایک امانت کے طور پر ہوتی ہیں اور بہرحال اس مہمان کو ایک نہ ایک دن

اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ امانت کی آدمی کب تک حفاظت کر سکتا ہے آخر ایک دن امانت واپس کرنی ہی ہوتی ہے۔

شعاع نے کہا:

ڈاکٹر صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ کی اپنے باپ کی طرح عزت کرتی ہوں اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ آپ مجھے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ جب بیٹی نہیں ہوں تو مہمان بھی نہیں ہوں امانت بھی نہیں ہوں۔ پھر مجھے آپ یہاں سے نکالنے، بھیجنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میں آپ کے ساتھ رہ کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

ہاں تم میرے پاس مہمان ہو، تم میرے پاس امانت ہو، تمہارا باپ میرا دوست ہے، دوست کی بیٹی اور اپنی بیٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

شعاع نے حیران ہو کر پوچھا:

میرا باپ اور آپ کا دوست ؟

ہاں میرا دوست، میری جان سے پیارا دوست۔

مگر وہ کون ہے ؟ کہاں ہے ؟

اس کا ابھی وقت نہیں۔

تو آپ اسے جانتے ہیں ؟

ہاں ——

آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے باپ سے ملنے کو بے تاب ہوں ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاں یہ بھی جانتا ہوں۔

پھر آپ نے جانتے بوجھتے اس بات کو کیوں چھپایا؟

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

شعاع! میں تمہارا مجرم ضرور ہوں مگر ہر بات کی کوئی مصلحت ہوتی ہے، ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے

شعاع نے کہا:

ڈاکٹر صاحب! آپ نے اس بات کو راز میں رکھ کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

مجھے اس کا اعتراف ہے، کئی بار میں نے کوشش کی کہ باپ بیٹی کو ملا دوں مگر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ حالات پر پردہ ہی رہے۔

شعاع نے پوچھا:

چاہے میں بھٹکتی پھروں؟

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

سہیل میاں تمہیں سیدھی راہ دکھائیں گے۔

شعاع نے کہا: سہیل صاحب کسی اور کی امانت ہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

میں بھی یہی سمجھتا ہوں مگر حالات کس وقت کیا ہو جائیں، کس وقت حالات کا پانسہ پلٹ جائے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شعاع نے کہا:

ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔

ہاں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

میں اس بات کا فیصلہ کر چکی ہوں کہ ان کی شادی لبنیٰ سے ہوگی۔

اور سہیل مان گیا ہے؟

ہاں سہیل بھی مجھ سے متفق ہیں۔

مگر تم دونوں کی گفتگو تو اس کے متضاد ہے۔

شعاع نے کہا: نہیں ڈاکٹر صاحب، فیصلہ اٹل ہے۔

کس کا فیصلہ؟

میرا فیصلہ۔

مگر بیٹے! اس فیصلے میں ہمیں بھی تو شامل کر لو۔

شعاع کے پاس بھلا اس کا کیا جواب تھا۔

اس بات کے امکانات بھی تھے کہ شعاع اس معاملے میں مزید اصرار کرتی کہ ڈاکٹر زیدی یہ کہہ کر وہاں سے چل دیئے۔ اچھے بچو! تم دونوں باتیں کرو۔

رات بارہ یا ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ حنا سونے کے لئے کھڑکیاں دروازے بند کرنے کے لئے اٹھی تو اس نے دیکھا کہ لبنیٰ کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ حنا کا خیال تھا کہ شای لبنیٰ کوئی کتاب پڑھ رہی ہو، مگر جب اس نے کمرے میں جا کر دیکھا تو لبنیٰ نہایت پریشانی ک عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

حنا نے پوچھا: لبنیٰ! کیا بات ہے؟

امی میرا دل گھبرا رہا ہے۔

کیوں، کیا بات ہوئی؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے ابّو یاد آ رہے ہیں۔

میری اچھی بیٹی! اب تو وہ صحت یاب ہیں فکر کی چنداں ضرورت نہیں۔

لبنیٰ نے کہا: میں جانتی ہوں، مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ابھی انہیں جا کر دیکھوں۔

حنا نے کہا: کل صبح ہی صبح چلیں گے۔

نہیں امّی! مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔

حنا نے ایک لمحے کو سوچا اور کہا: اچھا ابھی چلتے ہیں، میں ذرا کپڑے بدل لوں تم ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔

حنا نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور دونوں ماں بیٹیاں گاڑی میں ہسپتال پہنچ گئیں۔ حنا نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی گیٹ سے باہر ہی روک دے، تاکہ اندر جانے سے شور نہ ہو اور مریضوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

حنا اور لبنیٰ وارڈ کی طرف جا رہی تھیں کہ انہوں نے باورچی خانے میں لائٹ دیکھی اور پھر کچھ آوازیں ان کے کان میں پڑیں۔ آوازیں مدھم مدھم سی تھیں مگر ان آوازوں سے کان آشنا تھے

حنا اور لبنیٰ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں اور دونوں دبے پاؤں برآمدے میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں آوازیں اب صاف تھیں۔

یہ آوازیں شجاع اور سہیل کی تھیں۔

سہیل کہہ رہا تھا۔

شجاع: میں تمہارے حکم کی تعمیل میں لبنیٰ سے شادی تو کر لوں گا، لیکن تم مجھ پر ایک ایسا فیصلہ تھوپ رہی ہو جس سے نہ تم مطمئن ہو اور نہ میں۔ میرے دل کی حالت تو تم نے جاننے کی کوشش

ہی نہیں کی۔ لیکن اپنی بے چینیوں کو کوئی اور نام دینے سے پہلے ان پامال آرزوؤں کو دیکھو جن کی پرچھائیاں تمہاری پلکوں تلے لرزیدہ ہیں۔

شجاع نے کہا:

میں وہ تمام نقش پا، تمام نشان مٹا آئی ہوں سہیل صاحب! اب کوئی نشان نہیں، کوئی پرچھائیں نہیں اور اگر کوئی نشان باقی ہے تو صرف لبنیٰ ہے۔ وہ میری دوست بھی تھی اور غمخوار بھی اب اس کے دل میں میرے لئے جو نفرت ہے، وہ صرف آپ کی وجہ سے ہے، اور میں کسی قیمت پر یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ میں اس کے لئے، اس کی خوشیوں کے لئے خود کو بھی قربان کر سکتی ہوں۔

سہیل صاحب! وہ ایک ایسا گھرانہ ہے، جہاں کا ہر آدمی شفیق ہے۔ حنا ایک ایسی خاتون ہے جسے محبت اور مہربانی کا مجسمہ کہنا چاہئے اور نعمان صاحب اتنے اچھے، نیک آدمی ہیں کہ مجھے ان میں اپنے باپ کا پرتو نظر آتا ہے۔ انہیں پا کر میں اپنے باپ کو بھی بھول گئی ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس خاندان کی محبت، مہربانیاں، عنایتیں بھول جاؤں۔

سہیل نے کہا:

شجاع! خدا کے لئے اپنے فیصلے پر پھر سے غور کرو، تمہارا فیصلہ نظرثانی چاہتا ہے مجھے خود اس خاندان سے پیار ہے، میں ان سب لوگوں کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اور پھر میں تو تمہیں اس وقت سے چاہتا ہوں۔ جب تم نعمان صاحب کے گھر نہیں آئی تھیں۔

سہیل بولتا ہی چلا جا رہا تھا:

شجاع میرا دل نہ توڑو، میرا دل تو پہلے ہی شکستہ ہے، کرچی کرچی ہو چکا ہے۔ اب تو اس کی کرچیاں میرے دماغ میں چبھ رہی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے فیصلے کے سامنے سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھکا دوں، لیکن میں خود کو اس ایثار کے لئے تیار نہ کر سکا۔ کاش میری طرح میرا دل بھی تمہارا فیصلہ قبول کر سکتا اور میں اپنی زندگی کا رخ کسی اور شاہراہ کی طرف موڑ سکتا۔ تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے، آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔

شجاع نے کہا:

آپ کو کسی شاہراہ پر جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی شاہراہ موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر چل کر آپ زندگی کی صحیح منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ راستے میں کوئی موڑ نہیں کوئی چوک نہیں اور باقی رہی یہ تو میں آپ کو یقین دلا دوں کہ لبنیٰ کو پا کر آپ مجھے بھول جائیں گے جو باتیں آپ کہہ رہے ہیں یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدل جاتے ہیں اور گردش ایام ان مانوس اور شناسا چہروں پر گرد کی دبیز چادر ڈال دیتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شبیہیں پہلے دھندلا دیتی ہیں، پھر مٹ جاتی ہیں۔

شجاع! میں نے دل کو بہت سمجھایا، ذہن کو راضی کرنا چاہا کہ وہ تمہارے فیصلے کو مان لے۔ لیکن اگر دل کو قابو کرتا ہوں تو ذہن بھٹکنے لگتا ہے اور ذہن کو سنبھالتا ہوں تو دل بے قابو ہوا چلا جاتا ہے دونوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو خود بھٹک جاتا ہوں۔ اور دیوانوں کی مانند کپڑے پھاڑ کر صحرا میں بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے اور آج بھی میں اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس ذہن سے لڑ جھگڑ کر اس سردی میں لان میں گھوم رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ صبح تک گھومتا رہتا، اور کیا عجب صبح تک یہ ذہن، یہ دل زندہ بھی ہوتے یا نہیں۔ کیا عجب کہ صبح لان میں ایک اکڑی ہوئی لاش ملتی، تم نے یہاں لا کر کافی کا ایک گرم گرم کپ پلایا ہے تو اس دل میں ذرا حرارت ہے، منجمد ذہن ذرا کھل چلا ہے اور میں زندہ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں مجھے نہیں معلوم وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو حالات کے ساتھ خود کو بدل لیتے ہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے تو ایک ہی روپ قوس و قزح کی

کی طرح بکھرا ہوا ہے ـــــ جو ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے اور ابھر ابھر کر ڈوبتا ہے۔

اور وہ بولتا ہی چلا گیا۔

میری زندگی میں تو ایک ہی لمحہ خوشی کا آیا تھا۔ ہاں ایک ہی لمحہ۔

جب تم نے ایک بار اعتراف کیا تھا کہ ہاں تمہارے دل میں میری محبت ہے۔

مگر مجھے نہیں معلوم تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ یہ اعتراف۔

صرف اس لئے ہے کہ ـــــ

تم مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لبنیٰ کے حوالے کرنا چاہتی تھیں۔

اس اعتراف کے پیچھے بھی ایک غرض تھی۔

یہ اعتراف بھی کچھ مانگنے کے لئے، منوانے کے لئے کیا گیا تھا۔ میں پوچھتا ہوں اس اعتراف کا کیا فائدہ، اس سے بہتر تو یہ تھا کہ اعتراف ہی نہ کیا ہوتا ـــــ یہ تو ایسی ہی بات ہوتی جیسے بچے کو کوئی کھلونا دے کر بہلا دیا گیا ہو۔

ایک لمحے کی مسرت دے کر ایک پل کی خوشی دے کر۔

سب کچھ چھین لیا ہو، سب کچھ لوٹ لیا ہو۔

سہیل سچ کہہ رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات میں صداقت تھی اور پھر شجاع کو زندگی گزارنے کے لئے ایک سائبان کی بھی ضرورت تھی، اور سہیل سے اچھا سائبان اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ سہیل کو ایک ایسا سائبان سمجھتی تھی جس کے سائے تلے آنکھیں موند کر زندگی بسر کی جا سکتی تھی۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ سہیل سے کہہ دے کہ آپ کے بغیر تو میں خود کو ایک ایسی شکستہ کشتی کی مانند سمجھتی ہوں جس کا پتوار بیچ بھنور میں ڈوب گیا ہو اور کنارے کا دور دور تک پتہ نہ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پالیا۔

سہیل صاحب! محبت خود غرضی کا نام نہیں، قربانی کا نام ہے۔ اگر کسی میں قربانی کا جذبہ نہ ہو تو میں اس دل کو محبت سے خالی سمجھتی ہوں —— اب تو میری زندگی کی ایک ہی خواہش ہے، ایک ہی تمنا ہے کہ میں لبنیٰ کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بناؤں۔

تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟

سہیل صاحب! فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا ہے اور آپ مان بھی گئے ہیں، درحقیقت آج کی گفتگو نوز اینڈ تھی۔ میرے خیال میں ہمیں آج اس باب کو ختم کر دینا چاہیے۔

سہیل نے کہا:

تم اگر اپنی ہٹ پر اسی طرح قائم ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ایک کوشش اور کر دیکھوں، ایک بار اور ناکام ہو لوں۔

شجاع نے کہا:

نہیں سہیل صاحب! میں اسی کو کامیابی سمجھتی ہوں، میں ساری عمر آپ دونوں کی زندگی کی کامیابی کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔

شجاع اور سہیل کی گفتگو سن کر حنا نے لبنیٰ کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ پوچھ رہی ہوں کہ سناؤ لبنیٰ! تم کیا کہتی ہو؟ جس شجاع سے تم اس قدر نفرت کرتی رہی ہو، جس شجاع کی شکل سے تم بیزار ہو، تم نے اس کا روپ دیکھ لیا؟ حنا نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا، آنکھوں سے سوال کیا تھا۔

لیکن ——

لبنیٰ کی یہ حالت تھی کہ اتنی سردی کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے عرق آلود تھی۔

اور

اس کے دل کی نفرتیں، کدورتیں، انتقامی جذبے اس پسینے میں بہے جا رہے تھے۔

بیگم حق نے تندرست ہوتے ہی شجاع کو ایک معمولی نرس کہنا شروع کر دیا تھا، جب کہ بیماری کے دوران وہ ایک پل بھی اس کے بغیر زندہ نہ تھیں۔ حق صاحب ناراض ہو کر ہسپتال سے چلے گئے تھے کہ وہ گھر سے چلے جائیں گے۔ میمونہ بیگم کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی۔ اب اسے اٹھتے بیٹھتے غزالہ کی صحت کا خیال رہنے لگا۔ مگر اس کے پیچھے بھی ایک غرض تھی کہ کسی طور نعمان سے شجاع اور لبنیٰ کے دام کھرے ہو جائیں۔ ادھر لبنیٰ کے دل میں انتقام کی آگ جل رہی تھی اور وہ اس آگ میں سب کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتی تھیں۔ نعمان صاحب اب تک ہسپتال میں تھے۔

ایک رات لبنیٰ کا دل گھبرایا، اس کے دل میں نعمان صاحب کی طرف سے عجیب عجیب سے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور اس نے حنا کو مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے تاکہ وہ ابو کو دیکھ آئے، جب یہ دونوں ماں بیٹیاں ہسپتال پہنچیں تو باورچی خانے سے آتی ہوئی آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں۔ یہ آوازیں سہیل اور شجاع کی تھیں۔ شجاع نے سہیل کو قائل کر دیا اور وعدہ لے لیا کہ وہ لبنیٰ سے شادی کرے گا۔ حنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لبنیٰ سے پوچھا کہ وہ جس شجاع سے نفرت کرتی ہے اس کا اصل روپ دیکھ لیا، تو لبنیٰ اتنی پشیمان ہوئی کہ سردی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی اور اس کے انتقامی جذبے پسینے میں بہہ گئے۔

حق صاحب کے جاتے ہی بیگم حق بہت پریشان ہوئیں اور ڈاکٹر زیدی کے منع کرنے کے باوجود ڈسچارج لے کر گھر چلی گئیں۔

بیگم حق جب گھر پہنچیں تو کمرے میں ہر چیز کو الٹ پلٹ پایا۔ کپڑے کچھ پلنگ پر بکھرے پڑے تھے، کچھ فرش پر تھے، کپڑوں کی الماری کھلی تھی اور اس میں سے حق صاحب کے کپڑے غائب تھے۔ نوکر نے بتایا کہ حق صاحب نہایت غصے میں تھے۔ کسی سے بات نہیں کی، پہلے چیزیں ادھر ادھر پھینکتے رہے پھر ایک اٹیچی کیس میں کپڑے بھرے اور اٹیچی کیس لے کر باہر نکل گئے، میں پیچھے گیا۔ میں نے اٹیچی کیس لینے کی کوشش کی مگر انہوں نے ڈانٹ دیا اور خود اٹیچی کیس لیے ہوئے چلے گئے۔

بیگم حق نے پوچھا:

مگر گئے کہاں؟

بیگم صاحبہ! یہ مجھے پتہ نہیں، ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ادھر چلے گئے۔

بیگم حق نے پریشان ہو کر کہا:

سہیل! اب کیا ہوگا؟ تمہارے ابا کو کہاں تلاش کروں، ہائے میں تو انہیں سیدھا سمجھتی تھی۔

سہیل نے چڑ کر کہا:

تو کیا وہ ٹیڑھے ہیں؟

سیدھے ہوتے تو گھر سے چلے جاتے۔

نہیں تو موم کی ناک بنے رہتے کہ جدھر آپ کا جی چاہتا موڑ لیں۔

تو کیا اس نرس سے بیاہ کروں تیرا؟

مجھے تو خیر شادی ہی نہیں کرنی

شادی تو تیرا باپ بھی کرے گا۔

پہلے آپ انہیں تلاش تو کریں۔

تم دونوں باپ بیٹوں نے میری زندگی تباہ کر دی۔

میرا خیال کچھ اور ہے۔

کیا خیال ہے تمہارا؟

کہ زندگی ابا کی تباہ ہوئی ہے۔

لڑکے اولاد بھی باپ کی طرف دار نکلی۔ یہ نہیں کہتا کہ ماں کی زندگی تباہ ہوئی ہے۔

آپ کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ہاں ہاں کہہ دو کہ میں ظالم ہوں۔

سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا، جواب بھی کیا دیتا۔ اس کی تو دنیا ہی لٹ چکی تھی، اس نے جب کنارے کی آس کی منجدھار میں پہنچ گیا۔ قربانی کے نام پر شعاع نے اس کی زندگی کی قربانی لے لی تھی۔ اب تو وہ اپنے آپ کو ایک تماشائی سمجھ رہا تھا، بلکہ تماشا بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے گھر میں ہونے والے ڈرامے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اس کا خیال تک نہیں تھا کہ اس سے بے پناہ محبت کرنے والا باپ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے یا اس کی ماں پریشان ہے۔

بیگم حق نے ذرا نرم لہجے میں کہا:

سہیل! اپنے ابا کو کہیں تلاش کرو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر امی میں کہاں جاؤں، جب کہ مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ گئے کہاں ہیں؟

کسی سے پوچھو، شاید پتہ چل جائے۔

امی! فرض کریں کہ وہ مل جاتے ہیں؟

تو انہیں گھر لے آؤ۔

اور گھر میں پھر وہی ڈرامے ہوں۔

نہیں سہیل! اب میں ان سے کبھی نہیں لڑوں گی، جو وہ کہیں گے وہی کروں گی۔

ایک بار پہلے بھی تو آپ نے یہ بات کہی تھی۔

ہاں، مگر میری عقل ماری گئی تھی۔ اب میں انہیں ناراض نہ کروں گی۔

سہیل نے کہا:

اچھا میں انہیں تلاش کرنے جاتا ہوں۔

اور سہیل نہایت بددلی سے باہر نکل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کس سمت جائے کہاں تلاش کرے، آخر ابا کہاں جا سکتے ہیں۔ اس شہر میں تو ہمارا کوئی عزیز نہیں ہے، پھر وہ گئے تو کہاں گئے؟

وہ جتنا اس مسئلے پر سوچتا، اس کا ذہن الجھتا ہی چلا جاتا، یہاں تک کہ سوچتے سوچتے اسے چکر سا آگیا، اس نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل میٹرو میں گرم گرم چائے کا کپ پیئے، شاید اس سے ذہن کا بوجھ ذرا ہلکا ہو، لیکن جب وہ اندر گھسا تو اس نے دیکھا کہ کونے کی میز پر حق صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔

سہیل جلدی سے ان کے پاس پہنچا۔

ابا جی! السلام علیکم۔

حق صاحب نے چونک کر کہا۔

تم — تم یہاں بھی آگئے۔

ابا جی! گھر چلیے۔

میرا کوئی گھر نہیں۔

امی سخت پریشان ہیں

میں کسی کو نہیں جانتا۔ تمہیں چائے پینی ہو یا کھانا کھانا ہو تو بیٹھو، ورنہ سیدھی طرح چلے جاؤ۔

سہیل باتھ روم کے بہانے سے اٹھا اور گھر پر فون کر کے بیگم حق کو صورت حال بتائی اور فوراً آنے کا کہہ کر خود آکر حق صاحب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بیگم حق ہانپتی کانپتی آپہنچیں۔

میں پوچھتی ہوں اس عمر میں ناراض ہوتے اچھے لگتے ہو؟

سہیل! یہ کون خاتون ہیں؟

بیگم حق نے کہا:

میں خاتون نہیں ہوں، آپ کی بیگم ہوں، جس نے اپنی ساری جوانی، عمر کے تیس سال آپ کے ساتھ گزارے ہیں۔

خاتون! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں آپ کو نہیں جانتا۔

اور اس لڑکے کے باپ ہونے سے بھی انکار کرتے ہو؟

میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے

میں آپ کو لئے بغیر نہ جاؤں گی۔

ہوں — جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے گود میں اٹھا کر لے جائیں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیل تم ہی انہیں سمجھاؤ، میں ہار گئی ہوں، ان سے کہہ دو کہ ایک دفعہ یہ گھر چلے چلیں، اس کے بعد جو یہ کہیں گے، کر دوں گی، ان کی مرضی کے بغیر گھر میں ایک پتہ نہیں ہل سکے گا۔

حق صاحب نے بے یقینی کے عالم میں کہا:

یقین نہیں آتا۔

بس ایک بار یقین کریں۔

سہیل نے کہا: ہاں آبا! ایک بار مان لیں ورنہ اگر پھر کوئی بات ناگوار گزرے تو آپ دوبارہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔

حق صاحب نے خوش ہو کر کہا:

ہاں یہ تو ٹھیک ہے

پھر انہوں نے بیگم سے کہا:

نعمان صاحب کے ہاں چلنا ہوگا۔

جی ———

اور جو میں کہوں کرنا ہوگا، کہنا ہوگا۔

جی ———

اور یہ تینوں خوش خوش گھر چلے آئے۔

نعمان صاحب ٹھیک ہو کر ہسپتال سے رخصت ہو کر گھر چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر زیدی اپنے کمرے میں بیٹھے ذاتی خط لکھ رہے تھے کہ انہوں نے کسی کی آہٹ سنی اور چونک کر دیکھا۔ سامنے شعاع کھڑی تھی۔

کچھ بجھی بجھی سی۔

پریشان پریشان سی۔

ڈاکٹر زیدی نے پوچھا:

شعاع! کیا بات ہے؟

شعاع نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے، ہونٹ ہلے اور کچھ کہے بغیر بند ہو گئے، البتہ آنکھوں سے دو موتی نکلے اور رخساروں پر بہنے لگے۔

ڈاکٹر زیدی نے پریشان ہو کر کہا:

بیٹی! کیا بات ہے؟

شعاع نے کہا:

کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب۔

پھر یہ آنسو کیسے؟

ایسے ہی ڈاکٹر صاحب۔

اچھا اچھا بیٹھو، اور بتاؤ کہ بات کیا ہے، ہماری بیٹی کیوں پریشان ہے؟

شعاع نے بہت ہمت کر کے پوچھا:

اس دن آپ نے کہا تھا کہ میرے پاپا آپ کے دوست ہیں؟

ہاں ہاں کہا تھا۔

کیا یہ سچ ہے؟

بالکل سچ۔

کیا وہ یہاں کبھی آئے ہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاں بہت دفعہ۔

کیا میں نے انہیں دیکھا ہے؟

ہاں ہاں کیوں نہیں۔

کیا میں ان سے مل چکی ہوں؟

ہاں مل چکی ہو۔

کیا انہیں معلوم تھا کہ میں ان کی بیٹی ہوں؟

ہاں معلوم تھا۔

تو پھر انہوں نے بھی نہ بتایا؟

بیٹی! میں نے کہا تھا نا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

وقت وقت ——— کیسا وقت؟

ڈاکٹر زیدی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

میری اچھی بیٹی! میں نے کئی بار سوچا کہ اپنے اس دوست کی کہانی تم سے کہہ دوں مگر میں کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی دراصل کئی وجہیں تھیں کہ تم باپ بیٹی کی پہلی ملاقات عجیب رنگ میں ہوئی اور جب اس شخص کو پتہ چلا کہ وہ بدنصیب تمہارا باپ ہے تو اس وقت سے لے کر آج تک سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ ضرور رہا، مگر وہ ڈرتا ہے کہ ایک تو تم خوددار لڑکی ہو، دوسرے تم نے زمانے کی تلخیوں کا مقابلہ کیا ہے، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے لئے تمہارے دل میں نفرت بیٹھ گئی ہو، اور وہ تم پر یہ راز افشا کر کے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دے، اب جو تمہیں دیکھ لیتا ہے اس سے بھی جائے۔

ڈاکٹر زیدی نے شعاع کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا۔

مس شعاع! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تمہارا باپ اتنے سالوں کے بعد تمہارے سامنے آتا تو

تم ان سے کس طرح ملتیں؟

میں ——— میں ——— شعاع کچھ کہتے کہتے رک گئی اور ایک دم سوچ میں ڈوب گئی۔

میں بڑھ کر ان کے سینے سے لگ جاتی۔

نہیں نہیں! میں ان سے بات بھی نہ کرتی۔

نہیں نہیں! میں ان سے پوچھتی کہ کس بات کی سزا آپ نے مجھے دی ہے۔ جو اتنے دنوں تک میری خبر بھی نہ لی۔

میں ان سے کہتی

میں ان سے کہتی

ڈاکٹر زیدی نے پھر اپنا سوال دہرایا

ہاں بیٹی! تم ان سے کس طرح ملتیں؟

شعاع نے بہت نقاہت بھری آواز میں کہا:

ڈاکٹر صاحب! میں اس کا فیصلہ نہیں کر پائی۔

ڈاکٹر زیدی بولے:

ٹھیک ——— ٹھیک ——— میں اور وہ دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ کسی اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

انتظار ———

انتظار ———

نہیں ڈاکٹر صاحب! میں انتظار نہیں کر سکتی۔ میں ان سے ملنے کو انہیں دیکھنے کو سخت بیتاب ہوں

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھا تو جاؤ تیار ہو کر آؤ۔

بہت ہی دھڑکتے دل اور پریشان خیالوں کے ساتھ خوشبوں کے ہجوم کے درمیان دل میں آرزوئیں لئے وہ اپنے کمرے میں گئی اور تیار ہو کر ڈاکٹر زیدی کے پاس آ گئی۔ ڈاکٹر زیدی نے کار نکالی اور بیٹی کو باپ سے ملانے، باپ کے پاس پہنچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

کار چل رہی تھی لیکن شعاع کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کار کھڑی ہو، اس کا دل حسرت سے لبریز تھا۔ بے پناہ خواہشات کے ہجوم میں گھری وہ اپنے باپ کو دیکھنے جا رہی تھی، اس کا جی چاہا کہ وہ ڈاکٹر زیدی سے کہہ دے کہ وہ کار اور تیز چلائیں۔ تاکہ یہ طویل سڑک سمٹ کر ایک نقطہ بن جائے اور سارے فاصلے پل کے پل میں سمٹ آئیں اور وہ فاصلے کو یکدم عبور کرلے۔

میمونہ بیگم نے اس آس پر غزالہ کو پیسے دیئے تھے کہ جب وہ نعمان سے شعاع کی رقم وصول کرے تو اس کے ساتھ ہی لبنیٰ کے روپے بھی لے اور میمونہ بیگم کی اصل رقم کے ساتھ منافع بھی لے مگر غزالہ کے سرد رویے سے پتہ چل رہا تھا کہ نفع تو نفع میمونہ بیگم کی اصل رقم بھی ڈوب جائے گی۔

ایک دن میمونہ بیگم نے فیصلہ صادر کر دیا کہ اسے اپنی رقم آج ہی چاہئے۔

غزالہ بیگم نے کہا:

امی! کچھ دن اور ٹھہر جائیں۔

میمونہ بیگم نے کہا:

واہ تم بھی اس کی طرفداری کرنے لگیں۔ میں کہتی ہوں ہماری چیز ہے، ہمارا مال ہے، اسے ان لڑکیوں کی ضرورت ہے اور ہمیں رقم کی۔ پھر ہمیں ہماری رقم ملنی چاہئے اور اگر تم نہیں جانا چاہتی تو میں جا رہی ہوں۔

غزالہ نے کہا:

امی، سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں گی۔

کھیل — کیسا کھیل۔ تو کیا کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے؟

پھر اس نے شک کی نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ تم آج کل پھر فارغ ہو اور نعمان سے چکر شروع کر لیا ہو!

غزالہ نے تنک کر کہا:

امی! کبھی کوئی بات کہنے سے پہلے اس پر غور بھی کر لیا کریں۔

میمونہ بیگم نے کہا:

کیوں میں نے کونسی بری بات کہہ دی۔ پہلے ایک کیا، اسے چھوڑا، پھر دوسرا کیا اور اسے پاگل کر کے چلتا کیا اب۔

بس بس امی! بہت ہو چکا۔ اب آپ نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

مثلاً کیا کرو گی میرا؟

غزالہ نے کہا:

آپ کا تو کچھ نہیں کر سکتی لیکن اپنا سر ضرور پھوڑ لوں گی۔

میمونہ بیگم نے کہا:

اچھا تو تم اپنا سر پھوڑو، میں ذرا نعمان سے رقم لے کر آتی ہوں۔

امی! آپ گئیں تو اچھا نہ ہوگا۔

کیوں اچھا نہ ہوگا؟

وہ آپ کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں دے گا۔

اور تمہیں دے دے گا؟

ہاں میں طریقے سے وصول کر لوں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوانی کے نذر پہ ؟

امی آج تک میں نے بہت صبر کیا، مگر آپ کیسی ماں ہیں، ماں کا کیسا روپ ہیں، ماں ہیں یا ماں کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ؟

میمونہ بیگم نے کہا:

ڈائلاگ اچھے بولتی ہو، فلم میں بھرتی ہو جاؤ۔

غزالہ بیگم نے کہا:

بشرطیکہ آپ اس میں ماں کا کردار ادا کریں۔

زیادہ باتیں نہ بناؤ اور سیدھی طرح چل کر رقم وصول کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

غزالہ تنگ آ کر چلنے کو تیار ہو گئی۔ میمونہ بیگم نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا مگر غزالہ نے سختی سے انکار کر دیا تو وہ اس شرط پر راضی ہو گئیں کہ اچھا مجھے گیٹ کے باہر چھوڑ دینا۔

لبنیٰ نے آ کر نعمان صاحب کو بتایا کہ ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔ نعمان نے اندر بلایا اور غزالہ کو دیکھ کر ان کے بیمار چہرے کی زرد رنگت اور بھی زرد ہو گئی۔

نعمان اٹھ کر بیٹھ گئے۔

کیوں آئی ہو؟

شجاع کی رقم لینے۔

نعمان نے سخت لہجے میں کہا:

بولو غزالہ کتنی رقم چاہئے۔ میں آج اس بات کو ختم کر دینا چاہتا ہوں، مگر ایک بات سن لو کہ آج کے بعد شجاع کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے گا۔ آج کے بعد تم کبھی نہ کہو گی کہ تم اس کی

ماں ہو۔

ٹھیک ہے دس ہزار میں یہ سودا ہوتا ہے، لیکن لبنیٰ بھی تو آپ کے پاس ہے، دس ہزار اس کے بھی ہوں گے۔

نعمان صاحب غصے سے بھر گئے۔

غزالہ، تم اس حد تک گھٹیا پن پر اتر آؤ گی۔ یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ خبردار اگر تم نے لبنیٰ کا نام بھی لیا۔

یہ کہہ کر نعمان صاحب اٹھے اور انہوں نے الماری سے دس ہزار کے نوٹ لا کر غزالہ کے ہاتھ میں دے دیئے۔

ڈاکٹر زیدی کی گاڑی نعمان صاحب کے بنگلے کے گیٹ کے اندر گئی تو شجاع نے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں کیوں آئے ہیں، پہلے مجھے میرے پاپا کے پاس لے کر چلیں۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا:

ابھی چلتے ہیں ذرا نعمان صاحب کو دیکھتے چلیں۔

ڈاکٹر زیدی پریشان تھے کہ وہ کس طرح ان کا تعارف کرائیں۔

کہ

دروازے پر ان کے کانوں میں آوازیں آئیں۔

نعمان صاحب کہہ رہے تھے۔

غزالہ یہ لو دس ہزار روپے اور یہاں سے چلی جاؤ، بالکل اسی طرح جس طرح تم میری زندگی سے چلی گئی تھیں۔ آج میں نے زندگی کا آخری ادھار چکا دیا ہے۔ اب تمہارا شجاع سے کوئی رشتہ

کوئی واسطہ نہیں ہے، تم اس کی قیمت وصول کر چکی ہو

خاتون کی آواز ابھری:

مگر میں لبنیٰ کی رقم لئے بغیر نہ جاؤں گی، ایک بیٹی خرید رہے ہیں تو دوسری کے دام کیوں نہیں دیتے؟

شعاع نے ڈاکٹر زیدی کی طرف دیکھا اور جلدی سے اندر چلی گئی اور غزالہ کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ کر بولی:

امی حضور! میری قیمت وصول کرنے کا شکریہ۔ اب میں عاقل اور بالغ ہوں، اس روپے کی خود حفاظت کر سکتی ہوں۔

پھر اس نے وہ رقم نعمان صاحب کو جا کر دے دی۔

شعاع کو خریدنے کا شکریہ، مگر شعاع بکاؤ چیز نہیں ہے۔ وہ جہاں اور جس کے پاس رہنا چاہے، رہے گی۔

پھر وہ غزالہ سے مخاطب ہوئی۔

امی حضور! اب آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔ فضول وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افتخار صاحب سے جو آپ کی امیدیں ہیں، انہیں جا کر سنبھالیں تاکہ کل ملاں ان سے دم عرے کئے جا سکیں۔

غزالہ کی حالت عجیب تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

اس پر سکتے کا سا عالم تھا۔

شعاع نے ڈاکٹر زیدی سے کہا:

ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے نہ صرف یہ کہ باپ سے ملا دیا بلکہ ماں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھی ــــ آپ چلئے میں یہاں ایک منٹ نہیں رک سکتی۔

شعاع نے یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہ کیا تھا کہ لبنیٰ نے آکر شعاع کو گلے لگا لیا۔

شعاع! میں تمہیں یہاں سے نہ جانے دوں گی، تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، اور میں نے خود بھی تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔

شعاع بھلا کیا جواب دیتی۔ وہ خاموش تھی کہ اس نے دیکھا کہ پیار سے حنا اس کا سر تھپک رہی تھی۔

ہاں بیٹی! اپنی بہن کو معاف کر دو، غلطیاں چھوٹوں سے نہیں بڑوں سے بھی ہو جاتی ہیں۔

پھر اس نے نعمان صاحب سے کہا:

آج تک میں نے آپ کی ہر بات مانی، میں سمجھتی تھی کہ آپ ایک نرم دل انسان ہیں مگر میری پیاری بیٹی شعاع کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا ہے وہ کوئی سخت دل انسان بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے آج آپ نے بہت تکلیف پہنچائی ہے اور میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔

اتنے میں حق صاحب بیگم حق اور سہیل کو لئے اندر داخل ہوئے۔

نہیں بھابی! آپ ہمارے بھائی صاحب سے ناراض نہیں ہو سکتیں، جب ہماری اور تمہاری بیگم کی تیس سال کے بعد صلح ہو سکتی ہے تو آپ کو ناراض ہونے کا کیا حق ہے۔

بیگم حق نے کہا:

ایسے میں بھی جب کہ ہم سہیل اور لبنیٰ کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے ہیں۔

قریب تھا کہ حق صاحب چیخ پڑتے کہ بیگم تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ لبنیٰ نے کہا:

آنٹی! ذرا سی جملے میں تصحیح کر لیں ــــ کہ آپ سہیل اور شعاع کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگم حق نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا تو حق صاحب نے آگر ان کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ اب بولنے کا حق صرف مجھے ہے۔

پھر انھوں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا:

لبنیٰ دی گریٹ ——— زندہ باد

بیٹی لبنیٰ ——— زندہ باد

اس طرح ———

اس ہنگامے میں نعمان کے دوسرے بچے بھی آن شامل ہوئے۔ انھوں نے اور حق صاحب نے مل کر اس قدر شور مچایا، اس قدر تالیاں پیٹیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ البتہ اس بھیڑ بھاڑ سے فائدہ اٹھا کر غزالہ پتہ نہیں کس وقت غائب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد سب لوگ چائے کی میز پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے حق صاحب نے بیگم حق کی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر سہیل کو دی، کہ وہ شعاع کو پہنا دے۔

ختم شد